قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2017 قیمت 15₹

یوم جمہوریہ، نیا سال مبارک

ماہنامہ

اُردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

نئی صبح نئے خواب

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

زاویہ نظر

ادبی تحقیق کے تقاضے — شمس الرحمٰن فاروقی — 11

زبان اور قانون

قانونی ادب اردو کی بقا کا ضامن — خواجہ عبدالمنتقم — 16

انٹرویو

بشیر مالیر کوٹلوی — پرویز اشرفی — 19

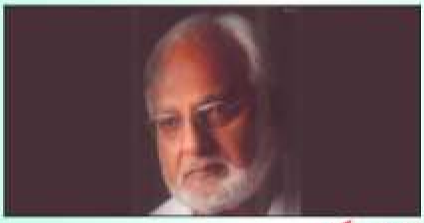

نقد و نگاہ

سفرنامہ — صبیحہ انور — 22

ظفر پیامی کے ناول فرار کے نمائندہ کردار — ہمانشو شیکھر — 24

نشان دانش

محقق وادیب دانشور

مولانا عبدالسلام خاں — ابوزر عبدالاحد فرقانی — 26

عبدالماجد دریابادی:

ایک مختلف الجہات شخصیت — نوشاد عالم — 29

یادیں باتیں

راج نرائن راز: آجکل اور میں — خورشید اکرم — 32

سلسلۂ صحافت

صحافتی زبان کے مسائل — سلیم شہزاد — 39

خراج عقیدت

آنساہت بیکل — امتیاز رومی — 43

ہم نے جنہیں بھلا دیا

ایک باکمال شاعر: جاوید کمال — حیدر علی — 46

رسالوں کے خاص نمبر

'کتاب نما' کا خواجہ احمد فاروقی نمبر — غلام نبی کمار — 49

نیا آسمان نئے ستارے

اردو تنقید: سہ زاویے — سعد مشتاق حصیری — 52

ثقافتی دریچے

جنوبی ہند کا موجودہ ادبی منظر نامہ — آفاق عالم صدیقی — 55

کمپیوٹر

کمپیوٹر کیا ہے — 59

صحت

سردیوں میں پانی کے استعمال کی اہمیت — صبا خانم — 61

فلم

گیتا دت: وقت نے کیا کیا حسیں ستم — محمد علیم — 63

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — ادارہ — 66

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 81

ماہنامہ

اُردو دُنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:01، جنوری 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،

نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

ہماری بات

قارئین اردو دنیا کو یوم جمہوریہ اور نیا سال مبارک!

ہر نیا سال — نئی صبح، نئے خواب اور نئی امیدوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور پھر اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہمارے سامنے بہت سے سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ ماضی کا محاسبہ کرتے ہوئے ہم جب حال میں داخل ہوتے ہیں تو ایک نئے جوش و ولولے کے ساتھ زندگی میں کچھ نئے عنوانات بھی تلاش کرتے ہیں۔ کچھ نئے امکانات کی جستجو ہوتی ہے۔ کچھ نئے تجربوں کی چاہت ہوتی ہے۔ یہ تجربے صرف سیاست، معیشت، اور معاشرت کے محاذ پر نہیں کیے جاتے بلکہ ادب وثقافت کے شعبوں میں بھی یہ تجربے ہوتے رہے ہیں کہ انھی نئے تجربوں سے ادب وثقافت کو وسعت، توانائی اور تازگی نصیب ہوتی ہے۔ ماضی میں ہمارے اکابر نے لسانی، ادبی، فکری سطح پر بہت سے تجربے کیے اور ان تجربوں کی بدولت ہماری ادبی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہوا مگر آج کے منجمد ماحول میں لوگ تجربوں سے ڈرتے ہیں۔ جبکہ نئے نئے تجربے ہی ہمیں امکانات کے نئے آفاق سے روشناس کراتے ہیں۔

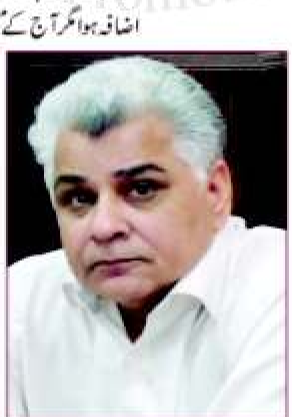

سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں یہ تجربے تو ہو رہے ہیں مگر ادب وثقافت کے صیغے ان تجربوں سے محروم ہیں جس کی وجہ سے کلچر، ادب اور زبان کے زوال کا نوحہ یا مرثیہ پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہت سی بحثیں از کار رفتہ ہو چکی ہیں اور بہت سے مباحث اپنا جواز کھو چکے ہیں، پھر بھی انھی مباحث پر ارتکاز ہے جس کا اب شاید کوئی جواز نہیں۔

ہر زمانہ ایک نیا مکالمہ چاہتا ہے۔ مکالمہ معاشرے سے ہو یا زندگی سے۔ مکالمے سے ہی کسی عہد کی صحیح سمت اور ترجیحات کا تعین ہوتا ہے۔ آج ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہماری ترجیحی فہرست میں ادب وثقافت شامل ہے یا نہیں۔ ہم زبان وادب کے فروغ کے تئیں کتنے بیدار ہیں اور فروغ کے لیے کن سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔ عہد کے بدلتے منظر نامے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی سمتیں بھی تبدیل کرنی پڑیں گی ورنہ ہماری زبان اور ثقافت بھی ایک خاص نقطے پر آ کر ٹھہر جائے گی۔ جب زبانیں ایک مخصوص محور پر رک جاتی ہیں تو اس کے فروغ اور ارتقا کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ زبانوں کو زندگی نئے تجربوں اور نئے علاقوں کی تلاش سے ہی ملتی ہے۔ ہمیں اس نئے سال میں بہت سنجیدگی سے سوچنا ہے کہ اردو زبان کا کوئی نیا علاقہ دریافت ہوا یا اردو پڑھنے والوں کا کوئی نیا طبقہ وجود میں آیا؟ کیا اردو میں قارئین کی تعداد بڑھی؟ اگر نہیں تو فروغ اردو کے سارے دعوے کھوکھلے ثابت ہوں گے۔ ہمیں نئے سال میں فروغ اردو کے لیے ایک نئے عزم اور ایک نئے لائحہ عمل کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا، تبھی ہم اس زبان کے ساتھ انصاف کر پائیں گے۔ ہمیں زبان کے تئیں زیادہ حساس اور بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہاں مجھے ملک زادہ منظور احمد کی یہ بات بہت موزوں لگ رہی ہے کہ ''اگر کسی زبان میں چالیس پچاس برسوں میں اعلیٰ ادب پیدا نہ ہوا تو یہ کوئی غیر معمولی المیہ نہیں ہے۔ سانحہ یہ ہے کہ اچھا ادب تو پیدا ہوتا رہے مگر وہ زبان مٹ جائے جس میں یہ ادب تخلیق ہوا ہے۔'' اس وقت سارا مسئلہ زبان کی بقا اور تحفظ کا ہے اور یہ زبان وہی نسل زندہ رکھے گی جو آج مختلف اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں اردو پڑھ رہی ہے۔ ہمیں اس نسل پر اب زیادہ توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ اس نسل کی ذہنی اور تحریری تربیت بھی اب ہماری ذمے داریوں میں شامل ہو چکی ہے۔ اس نسل کے مسائل، مشکلات اور مستقبل پر بھی ہمیں سنجیدگی سے دھیان دینا ہوگا کہ اسی نسل سے اردو کا کارواں آگے بڑھے گا۔

نئے سال میں ہمیں بہت کچھ اور سوچنا ہے۔ کچھ اور تجربے کرنے ہیں۔ ان تجربوں میں ہمیں دانشوروں کی رائے بھی چاہیے اور اہل قلم کا تعاون بھی۔ یہ تجربے ماہنامہ اردو دنیا کی سطح پر بھی کیے جائیں گے۔ نئے سال سے 'نیا آسماں، نئے ستارے' کے عنوان سے ایک نئے کالم کا آغاز کیا گیا ہے کیونکہ ہماری نئی نسل کو یہ شکایت ہے کہ ان کی تحریری تربیت کے لیے نہ تو کوئی پلیٹ فارم ہے اور نہ ہی کوئی ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے تیار ہے۔ 'اردو دنیا' اردو سے جڑے ہوئے ہر فرد کا رسالہ ہے۔ اسی لیے نئے قلم کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں کالج اور جامعات کے طلبا اپنی تحریریں ارسال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالوں کے خاص نمبر کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے کیونکہ ماضی کے کچھ رسائل نے بہت ہی اہم اور دستاویزی نوعیت کے شمارے شائع کیے ہیں جو بعض تنقیدی اور تحقیقی کتابوں سے بھی زیادہ بیش قیمتی ہیں ان رسائل تک عام قارئین کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ اسی لیے اس کالم کے ذریعے ان تمام قدیم رسائل کے خصوصی شماروں کی بازیافت کی کوشش کی جائے گی۔ نئے سال میں کچھ اور نئے سلسلے شروع ہوں گے اس تعلق سے آپ کے قیمتی مشوروں کی ضرورت ہے!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

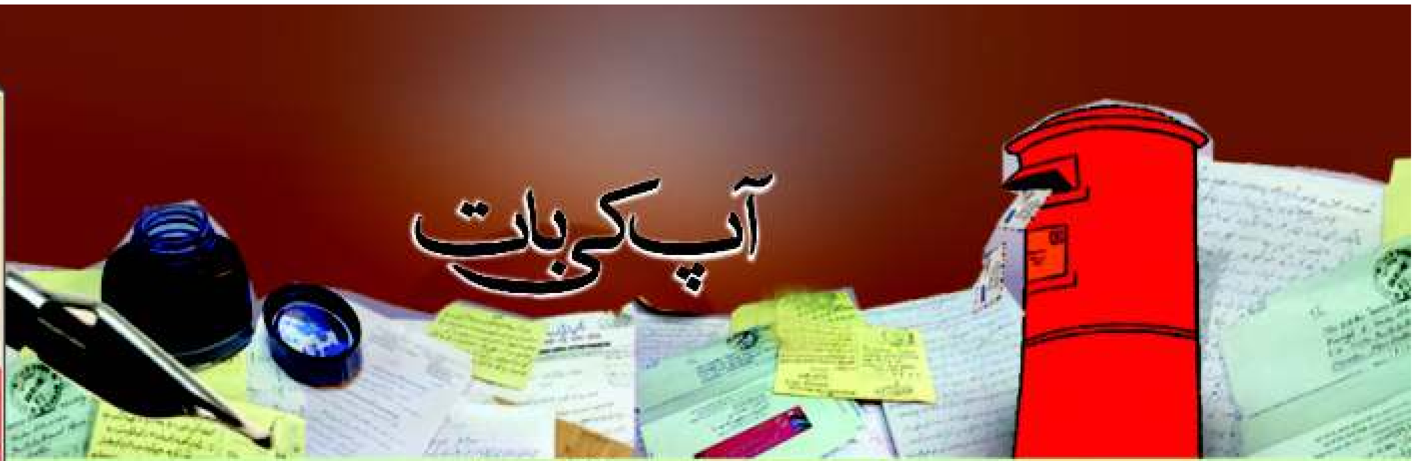

آپ کی بات

'اردو دنیا' دسمبر 2016 کا شمارہ موصول ہوا۔ ویسے تو آپ اس کی ترتیب ہی پر نہیں مشمولات کے معیار پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ بالخصوص شمارۂ ہذا جو رفتگان کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے، اپنی نوعیت کا ایک انتہائی اہم دستاویز ہے۔ میں نے اسے محفوظ کرلیا ہے۔ اس کی ایک حوالہ جاتی اہمیت بھی ہے۔ ایک بات اور کم سے کم وقت میں آپ نے کافی عمدہ مضامین یکجا کرلیے اور اصحاب مضامین سے انھیں تیار کروالیا۔ بہت بڑی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو دنیا کی یہ روایت قائم رہے گی۔

عتیق اللہ: آبشار، جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی

'اردو دنیا' کے حالیہ شمارے میں 'رفتگان نمبر' نے مجھے حیران کردیا۔ کیسے کیسے نامور اور باکمال لوگوں کو یاد کیا گیا ہے، کیا کہیے۔ م ناگ مرحوم کی چند تحریریں میری نظر سے گزری تھیں مگر وہ اس عجلت میں دنیا سے رخصت ہوجائیں گے، اس کا گمان نہ تھا۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند کرے۔ زبیر رضوی، جوگندر پال، ندا فاضلی، ملک زادہ منظور احمد... کس کس کو یاد کیجیے۔ لکھنے والوں نے مذکورہ حضرات پر قلم اٹھا کر ہم سب کی دعائیں لی ہیں۔ 'ہند و پاک میں اردو وفیات نگاری کی روایت' اردو دنیا کے جامع ترین مضامین میں سے ایک ہے۔ شمس بدایونی صاحب نے تحریر و تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ یہی معاملہ 'میدان رپورتاژ نگاری کے گوہر نایاب' نامی مضمون کا ہے۔ لکھنے والے یہاں بھی 'شمس' ہی ہیں۔

لیجیے اس شمارے میں بھی ہمارے محبوب مصنف ابن صفی مرحوم کا تذکرہ موجود ہے۔ کیا ہی دل خوش کن خبر سنائی ہے کہ قومی اردو کونسل نے جن تین شخصیات پر مونوگرافس کی منظوری دی ہے ان میں صفی صاحب بھی ہیں۔ پیشگی مبارک باد!

راشد اشرف: کراچی، پاکستان

انڈیا کی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ دسمبر 2016 اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ شمارہ ادب کی ان ہستیوں کی علمی و

ادبی کاوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی شخصی زندگیوں پر روشنی ڈالتا ہے جو ہم سے جدا ہوچکی ہیں۔ بدیگر الفاظ 'اردو دنیا' کا یہ شمارہ 'رفتگان کی یاد میں' ایک خصوصی شمارہ ہے۔ 'ہماری بات' کے عنوان سے اس شمارے کے اداریے میں پروفیسر سید علی کریم (ارتضی کریم) جو رسالے کے مدیر اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ہیں، دوسری باتوں کے علاوہ لکھتے ہیں کہ: 2016 میں علمی اور ادبی دنیا کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا کہ اس سال بہت سی آفتاب و ماہتاب ہستیاں روپوش ہوگئیں۔ ان میں نابغہ ذہن نادرۂ روزگار شخصیات بھی تھیں جن سے ایک عہد، ایک آہنگ، ایک اسلوب، ایک طرز وابستہ تھا۔ یہ وہ گنج ہائے گراں مایہ تھیں جن کی نظیریں اب نہیں مل سکتیں۔ کس کس کی بات کیجیے۔ انتظار حسین ہوں، یا ندا فاضلی، اسلوب احمد انصاری ہوں یا اسلم فرخی، عابد سہیل ہوں یا انور سدید، جوگندر پال ہوں یا شکیل الرحمن، سیدہ جعفر ہوں یا خلیق انجم، پیغام آفاقی ہوں یا شمیم نکہت، راشد آذر ہوں یا مظہر شہاب... ان کی جبینوں پر عظمتوں کی عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان سے ادب کی کائنات میں تحرک تھا، تابندگی تھی۔ ان کے افکار کی مشعل سے کائنات میں جو روشنی تھی وہ بجھتی جارہی ہے۔

پروفیسر سید علی کریم لکھتے ہیں کہ اسی احساس کے مدنظر 'اردو دنیا' میں رفتگان کے نام ایک شمارہ مختص کیا گیا ہے تاکہ کم از کم 2016 کے مرحومین کے کچھ احوال و کوائف سے قارئین روشناس ہوسکیں۔ اس خاص شمارے کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں اپنی کچھ مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سید علی کریم لکھتے ہیں کہ ہماری ادبی دنیا میں ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جن کی موت کی خبر بھی اخبارات کے صفحوں میں جگہ نہیں پاتی۔ 'اردو دنیا' میں ان مرحومین پر مضامین شامل کیے گئے ہیں جس سے ہمارے علم و ادب کا ایک بڑا حلقہ کم واقف ہے... کچھ اور شخصیتوں کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے... اسی لیے 'رفتگاں 2' میں ان کے متعلق تحریریں شامل کی جائیں گی۔ 'یاد رفتگاں' کا یہ شمارہ مرحومین کو ایک طرح سے خراج عقیدت ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھا بھی جانا چاہیے۔

ہماری نظر میں 'اردو دنیا' کا یہ 'رفتگان نمبر' اپنے آپ میں ایک ایسی دستاویز ہے جس میں اردو ادب کی کئی ہستیوں پر ایسا مواد یکجا کردیا گیا ہے جو اردو ادیبوں اور شعرا پر تحقیق کرنے والوں کو حوالہ جاتی مواد حاصل کرنے کے لیے ایک ذخیرہ ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ جس معمولی کمی کا ذکر جناب سید علی کریم نے کیا وہ 'اردو دنیا' کے دوسرے رفتگان نمبر میں پوری کردی جائے۔

زیر موضوع 'اردو دنیا' کا یہ 'رفتگان نمبر' قومی کونسل برائے فروغ اردو کی ویب سائٹ پر پڑھا جاسکتا ہے جس کا لنک یہ ہے:

www.urducouncil.nic.in

نصر ملک: کوپن ہیگن

'اردو دنیا' کے دسمبر ماہ کا شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ اور عنقریب رحلت کر گئے 18 ادبا پر مبنی ہے اور یہ اسی جریدہ کا حصہ ممکن ہوسکتا تھا۔

تاج دار تاج ممتاز شاعر کے وجیہ تشخص و شاعری پر تحریر مضمون میں ان کی انانیت اور بلند پایہ شاعری، بالخصوص ان کی قنوطیت پرست فطرت کو بخوبی منعکس کیا جاسکا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اس عظیم ملک کی دیہی قدرت، خلوص و اپنائیت وغیرہ کو تو آشکار کیا ہی ہے،

مستزاد شہر میں مقیم رہنے کے باوصف دیہاتوں کی بابت اپنی لافانی انسیت ومحبت کو بھی گا ہے گا ہے ظاہر کیا ہے اور اپنے کلیات کے نام کے ساتھ 'شہر میں گاؤں' جیسے الفاظ جوڑنا بھی اسی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ جناب کوثر مظہری نے اپنے مقالے کے تحت موصوف کی غزلوں کے ساتھ ان کی نظموں کا بھی ایک موقر تجزیہ پیش کرتے ہوئے معقول و برمحل شعری مثالیں درج کی ہیں۔

قادرالکلام مقبول عام شاعر جناب پی پی سریواستو رند نے بھی ملک زادہ منظور کی بیباک شاعری کے رنگ و آہنگ سے متعارف کرانے کی سعی فرمائی ہے۔ ان کے اس ایک شعر سے ہی موصوف کی شاعری کی لاجواب انفرادیت وہیئت کی مثال ملتی ہے۔ ''یہ کالی کالی گھٹا جو برسنے والی ہے/مزہ تو جب ہے کسی پارسا کو لے ڈوبے۔'' (ص 63)

❖ **کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ ملا۔ 'ہماری بات' میں پروفیسر ارتضی کریم نے اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے مسائل پر معروضی اور منطقی طور پر غور وفکر کرنے کی ضرورت سے آگاہ کیا ہے اور یہ بڑے پتے کی بات ہے یقیناً اردو زبان کے فروغ کے لیے لاحق امکانات کی جستجو لازمی اور برحق ہے کیونکہ اردو ادب کی جتنی بھی تخلیقات منظرِ عام پر آئی ہیں وہ گنے چنے موضوعات ومفروضات ہی کا احاطہ کرتی ہیں ان میں سائنس اور سوشل سائنس میڈیا اور جدید علوم وفنون جیسے موضوعات کی کمی اردو ادب کے دامن کو کشادہ کرنے سے قاصر ہی رہی ہے اور پروفیسر ارتضی کریم کی 'ہماری بات' میں پیش کردہ بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ اسکول اور کالج کی سطحوں پر اردو میں اقتصادیات، ریاضیات، نفسیات اور قانونیات جیسے موضوعات سے متعلق تراجم کی شدید ضرورت ہے اس کے لیے ہر اردو ادارے ایجوکیشنل سوسائٹیوں اور علمی تحقیقاتی مکاتب میں ترجمانی کمیٹی کی تفویض کا مشورہ بے جا نہیں ہے۔ ماضی میں تراجم کی روایت بے شک مستحکم رہی ہے کہ ایسی لاتعداد داستانیں ملیالم، تمل، تیلگو، کنڑ اور سنہالی زبانوں کے اردو تراجم کو منصۂ شہود پر لانے کی شدید ضرورت ہے۔ بقول ارتضی کریم اس کے لیے کسی ایک ادارے پر انحصار نامناسب ہے اس کے لیے اردو کی ساری اکادمیوں اور تنظیمی اداروں کو مل بیٹھ کر اور سر جوڑ کر کام کرنے کی ضرورت ہے تبھی ہماری اردو زبان داغ کے اس دعوے اور شعر کے مصداق ہوسکتی ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

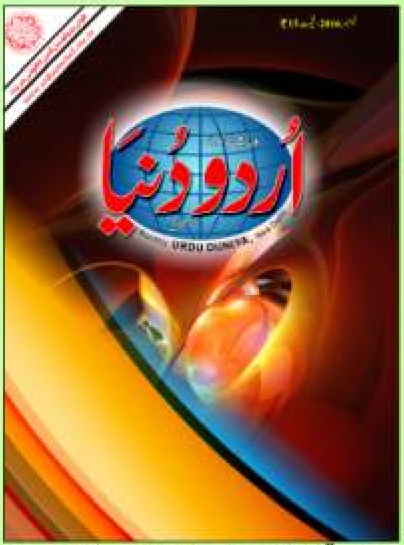

پروفیسر ارتضی کریم نے احمد ندیم قاسمی سے متعلق ان کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی پر بلیغ نظر ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ احمد ندیم قاسمی پر سب سے زیادہ اثر کرشن چندر کا ہے جبکہ کرشن چندر افسانہ نگاری میں فکشن اور مکالماتی نثر میں شاعری کو ملحوظ رکھتے تھے لیکن ان سے بالاتر احمد ندیم قاسمی نے شاعری میں بھی افسانہ نگاری کی ہے بلکہ ان کی بہت سی تخلیقات چار چار مصرعوں کے نظمانے کی صورت میں منظرِ عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں جیسے ایک نظمانیہ قطع پیش ہے:

حسیں لبوں پہ جڑی بوٹیوں کا رس مل کر
صبوحی کھیت سے چڑیاں اڑانے آئی ہیں
بچھا کے سرخ دوپٹے کو سنگ ریزوں پر
نہ جانے کس کے تصور پہ مسکرائی ہے

اور 'آنچل' کے دیباچے میں انھوں نے 'میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں' کے تحت اپنا رومان پرور نظریہ پیش کیا ہے وہ ان کی شخصیت کے ست رنگی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

مضمون 'اردو زبان کی ہم عصر معنویت واہمیت' میں زاہد الحق نے اپنے حق شناس جائزے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا ہے کہ اردو زبان کا لچیلا پن اپنے اندر کئی زبانوں کو رچ بسنے کی کرشماتی خوبی رکھتا ہے اور بے شک فلمی Social Media حقیقت اور تھیٹر وغیرہ میں جو عام بول چال کی زبان مستعمل ہے وہ بلاشبہ اردو یا ہندوستانی ہی ہے اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ آج اردو کے حریف بھی اردو بولنے پر مجبور ہیں۔ پرتھوی راج کپور کے یوم پیدائش پر انیس امروہوی نے اپنی شگفتہ تحریر میں پرتھوی راج کپور کی فلمی، ثقافتی، ادبی اور علمی زندگی کا مختصر مرصع اور جامع طور پر جائزہ لیا ہے۔ قسیم اختر کا قاسم خورشید سے لیا ہوا انٹرویو بھی بڑا معلوماتی ہے۔ موصوف نے بعض سوالات کے جوابات میں اپنے نڈر پن اور فکری بے باکی کا ثبوت دیا ہے اور تخلیق کے بطن سے وجود میں آنے والی تحریکوں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ پھر بھی قاسم خورشید نے کہیں کہیں اپنی شخصیت کے گوشے بھی مبہم چھوڑ دیے ہیں۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چنگئی، تمل ناڈو

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ نومبر 2016 ملا۔ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے مشمولات اور مندرجات کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ باقی مضامین سے متعلق کچھ کہنے سے قبل میں 'وجودی عشق کا شاعر میلا رام وفا' کے مضمون نگار کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ہندوستان سے دور یوایس اے میں مقیم احمد سہیل نے پنجاب کے راج کوی کو یاد رکھا اور اپنی یاد کو 'اردو دنیا' کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا۔ یہ اردو ادب کی ستم ظریفی ہے کہ ہم رفتگاں کو بھولتے جارہے ہیں جنھوں نے اس مشترکہ تہذیبی زبان کی اپنے اپنے دور میں آبیاری کی اور اچھا خاصہ ادبی اثاثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ یہ بات موجودہ دور کی بعض گزری ہوئی شخصیات پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں قابل احترام مضمون نگار کی توجہ چند باتوں کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں:

1. وفا صاحب کی پیدائش 20 جنوری 1895 ہے نہ کہ 30 جنوری 1895

2. ان کا انتقال 28 ستمبر 1980 کو ہوا اگر کہیں 1990 درج ہے تو اُسے مانا نہ جائے۔

3. مضمون نگار نے آگے لکھا ہے کہ'' 1944 میں اوپندر ناتھ اشک کے لاہور سے ممبئی جانے سے قبل انھوں نے اشک صاحب سے اردو ادب کی تربیت لی اور رموز سیکھے۔''

میں فاضل مضمون نگار کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایسی کوئی دستاویز راقم کی نظروں سے نہیں گزری۔ ایک ایسا طالب علم جس کی عمر 19 برس کے قریب تھی اور وہ گیارھویں جماعت کا طالب علم تھا مشن کالج لاہور میں 1914 کے اواخر میں کالج کی طرف سے مشاعرہ منعقد ہوا۔ جج علامہ اقبال تھے۔ انعامی مشاعرے کا طرح مصرع تھا:

مگر تم تو ستم نکلے، غضب نکلے، بلا نکلے

وفا نے جب اپنی غزل پڑھی تو علامہ اقبال نے وفا کے اس شعر پر بار بار داد دی:

بوقت گریہ پاسِ اضطراب قلب لازم ہے
جو آنسو آنکھ سے نکلے، تڑپتا لوٹتا نکلے

علامہ اقبال کی شہرت 'انجمن حمایت اسلام' اور شیخ عبدالقادر کے مشہور رسالے 'مخزن' کی وجہ سے ملک گیر ہوچکی تھی۔ 1916 میں شیخ عبدالقادر نے لاہور میں 'انجمن ارباب علم'

قائم کر ڈالی۔ اسی سال شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی نے 'زندہ دلان پنجاب' کے نام سے ایک انجمن قائم کر ڈالی۔ یہ اس کے سکریٹری تھے۔ وفا اور سردار اودے سنگھ شائق اس انجمن کے اہم رکن تھے۔ ان تینوں کے اتحاد کو دیکھتے ہوئے شیخ عبدالقادر نے ان کو 'اتحادِ ثلاثہ' کا نام دے رکھا تھا۔

'اے فرنگی' کی نظم دس اشعار پر مشتمل ہے۔ 'اردو دنیا' کے صفحہ 44 کے کالم دو میں اس نظم کے تین شعر مضمون نگار کے درج ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے یوں درج ہیں:

اے فرنگی کبھی سوچا ہے یہ دل سے تو نے
اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا بھی آئی

پہلے مصرعے میں 'دل سے' نہیں 'دل میں' اور دوسرے میں 'سوچ کے' نہیں 'سوچ کر' ہونا چاہیے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'غریبوں' کی جگہ 'غریبی' اصل نظم میں درج ہے۔

اسی کالم کے درمیان میں مولانا ظفر علی خاں کا ایک معروف شعر یوں درج ہوا ہے:

توڑتا ہے شاعری کی ٹانگ کیوں اے بے ہنر
جا سلیقہ شاعری کا سیکھ میلہ رام سے

اصل میں اس شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے

اسی طرح صفحہ 45 کے کالم ایک کی دو سطروں کے بعد جو شعر درج ہے اُس کے دوسرے مصرعے میں 'جان سے جان' کے بجائے 'جان سے جانا' ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اقتباس کے درمیان میں ایک شعر یوں درج ہے:

ترا ہی خیال ان کو آٹھوں پہر ہے
مجھے میرے ہی خیالوں نے مارا

دوسرے مصرعے میں صفحہ 44 کے تیسرے کالم میں 'ہی' کے بعد 'ہم' درج ہے، یہاں 'ہم' غائب ہے۔ ان دونوں غلطیوں کو میں کاتب کی غلطیاں مانتا ہوں لیکن صفحہ 45 کے تیسرے کالم میں جو پہلا شعر ہے اس کے پہلے مصرعے میں 'کہنے کا تو اپنے ہی وفا آپ کے قائل' اس میں 'کے' کے بجائے 'بھی' ہونا چاہیے۔

اسی طرح اسی کالم کے آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں 'اتنی تو ہے حقیقت باقی کہانیاں ہیں' یہاں 'اتنی تو' کی جگہ 'اتنی سی' صحیح ہے۔

راقم نے مسلسل چھ سال (86-1980) کی تلاش و تحقیق کے بعد 506 صفحات پر مشتمل ایک مقالہ قلم بند کیا تھا، جس کا عنوان ہے 'پنڈت میلا رام وفا: حیات و خدمات' اس کی اشاعت مئی 2011 میں ہوئی مگر فلمی دنیا سے ان کے تعلق سے متعلق کوئی دستاویز ہاتھ نہیں لگی۔ ایسی کوئی دستاویز اگر مضمون نگار کے پاس موجود ہو تو راقم اُس سے استفادہ کرنا چاہے گا۔

اس شمارے کا گوشہ 'احمد ندیم قاسمی' قابلِ ذکر ہے۔ 'مولانا آزاد کے روشن افکار' اور 'سید سلیمان ندوی' تاریخی و معلوماتی ہیں۔ 'ادبی مباحث' میں گایتری منتر کا منظوم ترجمہ 'آفتاب' شریف احمد قریشی کی علمیت کی مثال ہے۔ 'ابن رشد ایک عظیم مفکر' عربی ادب کی تاریخ کا ایک خاص ورق ہے۔ صفحات سے متعلق دونوں مضامین اچھے ہیں۔ صحت، قلم، کتابوں کی دنیا اور خبرنامہ دورِ حاضر کے معلوماتی عنوان ہیں۔

ٹی آر رینا: ایف 237، اوئر بری سنگھ نگر، باڑی کالونی، جموں

'اردو دنیا' نومبر 2016 باصرہ نواز ہوا۔ 'ہماری بات' میں اس امر کی نشاندہی قابلِ تحسین ہے کہ نئے عہد میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کسی بے قاعدہ طرزِ عمل کی بجائے ایک مثبت لائحۂ عمل کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جہاں "اردو زبان سے جڑی مختلف تنظیموں کے اربابِ دانش کے باہمی مشوروں سے نئی اسکیموں کی تشکیل اور ان کے بروئے کار لانے کے لیے اقدامات ضروری ہیں وہیں بیرونی ممالک کے مختلف گہرپاروں کی اردو زبان میں منتقلی نہایت خوش آئند کوشش ہوگی۔ آپ نے اس کے لیے بجا طور پر مترجمین کی لگاتار فراہمی کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے کاموں کے لیے مترجمین دونوں زبانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں جو اردو زبان کے ساتھ ساتھ دوسری متعلقہ زبان کے باریک فرق اور ان کے چلن سے بھی بخوبی بہرہ ور ہوں اور اس کے لیے نہایت ضروری، دلچسپ اور کارآمد کتب کا انتخاب بھی اشد ضروری ہے۔

جہاں بیرونی ممالک اور بھارت کی دوسری زبانوں کے شہ پاروں کی اردو زبان میں منتقلی بہت سودمند ثابت ہوگی وہیں اس حقیقت سے انحراف بھی ایک گناہ سے کم نہیں کہ خود اردو زبان کے گہر آبدار نظروں سے اوجھل ہوتے ہی طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیے جاتے ہیں۔ اس کا نقصان نئے قارئین کے ساتھ خود اردو زبان کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج اس زبان کے عظیم المرتبت اہلِ قلم کی تخلیقات ڈھونڈنے سے بھی دستیاب نہیں ہو پاتیں ان پر تنقیدی مضامین کی اخباروں اور رسالوں میں بھرمار ہے اور ان پر لکھی گئی کتابوں کا بھی شمار نہیں یہ تو اچھا ہے کہ قومی کونسل اور کچھ دوسرے ادارے چند مشاہیر کی تخلیقات کتابوں کی شکل میں سرکاری خرچے پر شائع کر رہے ہیں مگر یہ ناکافی ہے۔ ان مشاہیر کی بدولت ہی اردو زبان گھر گھر پہنچ کر ایسی ہر دلعزیز ہوئی کہ آج اس زبان کی بدولت بلند و بالا محکمے، ادارے، اسامیاں، رتبے، بھون اور ایوان اپنی شان دکھا رہے ہیں مگر اپنی ذاتی نام وری کی حصولیابی کے لیے ان عظیم مگر گم گشتہ ہستیوں کو حاشیوں پر دھکیلتے ہوئے آج صرف ان کے نام باقی رہ گئے ہیں جو کچھ اور سال گزرنے کے بعد شاید معدوم ہی ہو جائیں۔

اردو زبان کی فلاح و بہبود، ترقی و ترویج بلکہ اس کی زندگی ذاتیات سے اٹھ کر اس کی سچی خدمت اور پرجوش لگن کے ساتھ ممکن ہے۔

'ہماری بات' میں اردو زبان کی سلامتی کے لیے آپ کا قلم موثر طور پر رواں دواں رہے یہ میری دعا ہے۔ آمین!

کرشن گوتم: 3251، سیکٹر D-44، چنڈی گڑھ، ہریانہ

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ماہ نومبر 2016 نظر نواز ہوا، اداریہ 'ہماری بات' میں اردو کے موجودہ ترجموں کی بابت گفتگو کی گئی ہے، نیز اردو ترجمہ نگاری کے لیے سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اس بابت عرض ہے کہ ترجمہ نگاری سے پہلے ہم اردو والوں کی زبان کے فروغ اور اس کی بقا کی کوشش کرنی چاہیے۔ اردو بلاشبہ عالمگیر زبان بن گئی ہے مگر لکھنے اور پڑھنے کی حد تک بحث رہی ہے، محترم 'قاسم خورشید کی گفتگو قابلِ مطالعہ تحریر ہے۔ فاروق اعظم قاسمی کا تحقیقی مضمون سید سلیمان ندوی پر عمدہ ہے۔ دیارِ اردو کے ممتاز ناقد، فکشن نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی پر کئی مضامین شامل ہیں ان میں شہناز رحمٰن کا مقالہ 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں عورت' اور 'دیہات' قابلِ داد مضامین ہیں۔ محترم زاہد الحق کا 'اردو زبان کی ہم عصر اہمیت و معنویت' مقالہ بلاشبہ اردو کی محبت اور اس کی سحر کاری سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "اردو آج ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس زبان نے علاقائی اثرات کو بخوبی قبول کیا ہے۔ ممتاز صحافی شمیم طارق کا منشی نول کشور کے اودھ اخبار پر مضمون نہایت عرق ریزی اور محنت سے لکھا ہے۔ اس سلسلے میں 'اردو صحافت کا عصری منظرنامہ' محترم انیس امروہوی کا 'پرتھوی راج کپور' قابلِ مطالعہ تحریریں ہیں۔

عبداللہ عثمانی: 4/16، محلہ گدی واڑہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، یوپی

اردو دنیا اکتوبر و نومبر 2016 کے شمارے ڈاک کی لاپرواہی سے یکے بعد دیگرے تاخیر سے موصول ہوئے۔ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ اردو دنیا دنیائے ادب میں بھی اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے۔ زبان و ادب اور

تعلیم کے فروغ کے لیے این سی پی یو ایل نے شمارے کو وقف کردیا ہے۔ 'اردو غزل اور میڈیکل سائنس' واقعی کافی معلومات کا حامل ہے۔ 'گاندھی کی اردو اور مسلم تہذیب سے ہم آہنگی' وسلسلہ صحافت لسانیات پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

نومبر 2016 کے شمارے میں ارتضیٰ کریم، افشاں ملک، اور رضوان ابن علاء الدین نے احمد ندیم قاسمی سے متعلق تفصیلی پہلو کو کما حقہ اجاگر کیا ہے۔ موصوف کے چندہ اور خاص مجموعے پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ برگ حنا، نیلا پتھر، کپاس کا پھول، طلوع و غروب میں احمد ندیم قاسمی نے عورت کے کردار کو ایک مختلف ومنفرد انداز میں پیش کیا ہے جو نہ تو سعادت حسین منٹو کی طرح بالکل بے باک اور نہ ہی راجندر سنگھ بیدی کی طرح مصلحت شناس اور نہ ہی کرشن چندر کی طرح رومانی جذبات سے لبریز بلکہ ایک الگ تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ 'مولانا آزاد کے روشن افکار' پر امام اعظم نے اچھی امامت کی ہے۔ پروفیسر شمیم نکہت، حکیم محمد ایوب عثمانی اور انیس جامعی کی رحلت کی خبر سن کر دکھ ہوا۔ خلاصہ اینکہ شمارے کا معیار و وقار دیکھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے۔ 'ہماری بات' میں پروفیسر سید ارتضیٰ کریم اردو زبان کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لیے ایسی کتابوں کا انتخاب کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دینے جا رہے ہیں۔ یہ ان کی محنت اور لگن کا ثمرہ ہے۔ خدا کرے ترجمہ والا مشن بہت جلد کامیاب ہو جائے۔

معین الدین شمسی: اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہ، جھارکھنڈ

اردو دنیا نومبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ حسب معمول یہ شمارہ بھی بہت مفید ہے۔ بیشتر مضامین سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ شمیم طارق صاحب کا مضمون 'منشی نول کشور اور ان کا اودھ اخبار' بہت معیاری ہے۔ منشی صاحب سے متعلق اب تک کی معلومات میں یہ مضمون اضافہ کرتا ہے۔ منشی صاحب پر میں نے چند مضامین پڑھے تھے جن میں تکرار بھی تھی اور تضاد بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روایات کو نقل کیا جاتا رہا ہے ان کی جانچ نہیں کی گئی ہے۔ یہ پہلا مضمون ہے جس کو پڑھنے سے تاریخی پس منظر کے ساتھ 'اودھ اخبار' کے مزاج اور خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

شمیم طارق صاحب نے ایک انگریزی کتاب کا جا بہ جا حوالہ دیا ہے، لیکن چونکہ میں جانتا ہوں کہ کریمی لائبریری میں اودھ اخبار کے ہزاروں صفحات یعنی کچھ مکمل اور نامکمل شمارے موجود ہیں جن پر انھوں نے نظر ڈالی ہے اس لیے یقین ہے کہ انھوں نے انگریزی کتاب کے بیانات کی تصدیق بھی کرلی ہوگی۔ 21 نومبر 1875 ' 26 جولائی 1870 وغیرہ کے اخبارات کا انھوں نے حوالہ بھی دیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ شمیم طارق صاحب 'اودھ اخبارات' کے مشمولات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیں گے۔

مومن فیاض احمد

محترم علیم صبا نویدی نے ماہ نومبر کے اردو دنیا میں اپنے مراسلے میں لکھا ہے ''اردو دنیا ہندوستان کا واحد رسالہ ہے جس نے غزلوں اور نظموں سے اپنا رشتہ الگ رکھا ہے'' گویا کہ اردو کی غزلیں و نظمیں اتنی گراں ہیں کہ انھیں اردو دنیا سے دور رکھا جائے۔

یہ اردو دنیا کے لیے طنزیہ جملہ ہے یا ستائشی....؟ اگر طنزیہ جملہ ہے تو میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ اور اگر ستائشی....؟ تو میں یہاں بڑے اعتماد کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ 'اردو دنیا' جب تک نامکمل ہے تب تک اس میں اردو کی روح غزلیں و نظمیں نہ ہوں........ بیشک اردو اگر ایک جسم ہے تو غزلیں اس کی روح......تو جب بے روح جسم نامکمل ہے تو اردو دنیا مکمل کہاں سے ہوگی۔ اسی شمارے میں جناب غلام نبی خیال کی اس تحریر سے میں متفق ہوں۔ کہ اردو دنیا کو آج کل کی عامیانہ شاعری سے دامن چھڑا کر رسالے کو...... لیکن مرصع و معیاری اردو شاعری کو ''اردو دنیا'' کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

ندیم راعی مراد آبادی: 198، چودھری ہاؤس، مراد آباد، یوپی

میری کمزوری ایک زمانے میں فلم بھی رہی ہے مگر اس سے بھی پہلے مطالعے کا چسکا مجھے امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انارکلی کی دنیا میں لے گیا تھا۔ اشفاق احمد عمر نے اپنے طور پر انارکلی کو موضوع بنا کر خوب لکھا ہے۔ مزید توجہ دیتے تو اس مضمون کو بہتر سے بہتر تحقیق کا درجہ دلا سکتے تھے! لیکن یہ جملہ بھی کمپلیمنٹری ہے تنقیدی نہ سمجھیں اشفاق احمد عمر! یہاں یہ ذکر غیر مناسب نہ ہوگا کہ میں بچپن سے امتیاز علی اور ان کے خانوادے کے اشاعتی ادارے دارالاشاعت لاہور سے بذریعہ ہفت روزہ پھول واقف تھا، انارکلی ڈرامہ پڑھنا آسان نہ سمجھتا، پھر زبان بھی میری اس وقت کی عمر کے مطابق کافی ثقیل تھی مگر کردار، مکالمے اور منظرنامے کی جزئیات کا جادو سحر تھا۔ یہ جادو آج بھی زندہ ہے۔ بڑی عمر میں جب انسان سب کچھ بھولنے پر قادر ہو جاتا ہے تب وہ اولین یادداشتوں کو من وعن قلب و ذہن میں دہراتا ہے۔ دل چاہتا ہے ایک بار پھر لاہور جا کر انارکلی بازار وزٹ کروں انارکلی کا مقبرہ (اس علامتی یادگار کو اور کیا کہا جائے؟) دیکھوں! وہیں کہیں بیٹھ کر نئے سرے سے امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انارکلی پڑھوں!!

امتیاز علی تاج کے ڈرامے پر مبنی، اس سے اخذ اور اس کے تتبع میں بننے والی انڈین اور پاکستانی فلمیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ جس طرح ادب میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے کا مقام ہے اسی طرح کے آصف کی فلم مغل اعظم بلندی پر براجمان ہے۔ اس ایک مضمون کی وجہ سے باقی مندرجات پر بات رہ جاتی ہے مگر اہل ادب ان پر اظہار کریں گے۔ یوں تلافی ہو جائے گی۔

نومبر کا شمارہ ایک بسیط تبصرہ چاہتا ہے۔ سرورق کی سادگی سے مشمولات کی پرکار لکھت ترتیب وتزئین اور خاص طور پر تخلیقات کا معیار اپنا جواب نہیں رکھتے!

اس شمارے میں میری دلچسپی کا مرکز جناب احمد ندیم قاسمی کا گوشہ اور اس میں شامل مضامین رہے۔ قاسمی صاحب آج بھی ہمارے ادب کا تاج زریں ہیں۔ ان کی شخصیت کی ان کے اپنے شعروں کے مطابق: انسان عظیم ہے خدایا: کہہ کر تصویر کشی ہوتی ہے۔ میں ان سے کئی بار ملا۔ انھوں نے میرے افسانوں کے اولین مجموعے جب انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں دیکھا تک نہ تھا۔ کوئی تعارف اس ناچیز کا نہ تھا انھوں نے میرے مجموعے: پتھر کا جگر: کا دیباچہ لکھا اور پھر میرے افسانوں کے آخری مجموعے: پلوں کے نیچے بہتا پانی: کا دیباچہ میری فرمائش پر لکھا۔ جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم عہد ساز، ادب پرور اور اونچے شاعر، افسانہ نگار اور دانش ور تھے۔ خود ہی فرما گئے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

یہ شعر میرے رسالے مخزن شمارہ 8 کی پریرنا اور زینت ہے۔ ان جیسے بڑوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

اس گوشے کا آغاز ارتضیٰ کریم کی وقیع تحریر ہے جس میں ندیم صاحب کی شخصیت وفن کا بڑا مبسوط اور مربوط احاطہ کیا گیا ہے۔ ارتضیٰ کریم صاحب کے مضمون کی آغوش میں افشاں ملک، شہناز رحمٰن، رضوان بن علاء الدین کے قلم پارے بھی لائق توجہ و داد ہیں۔

'اردو دنیا' بلاشبہ اردو دنیا کا ایک ممتاز ماہنامہ ہے اور میں اس کی ترسیل کے لیے ادارے کا ممنون ہوں۔ خدا کرے یہ رسالے اور اس سے متعلق تمام کارکنان مدیر تا طابع بھی اپنی محنتوں کا پھل پائیں۔

ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ: بریڈفورڈ، یوکے

اردو دنیا کا تازہ شمارہ (اکتوبر 2016) مختلف النوع مضامین کے ساتھ قابل مطالعہ ہے۔ اس میں محمد اسداللہ کا مضمون 'انشائیہ انکشاف ذات اور منفرد زاویۂ نظر' صنف

انشائیہ کے متعلق پر مغز مواد فراہم کرتا ہے۔اس موضوع پر انھوں نے ایک نئے پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔اردو ادب میں طنز و مزاح اور انشائیہ کو باہم خلط ملط کرنے کی روش عام ہے لیکن گاہے بگاہے اس پر لکھے جانے والے مضامین کے سبب انشائیہ کا تصور واضح ہوتا جارہا ہے۔ اب قارئین بخوبی جان چکے ہیں کہ انشائیہ ایسی تحریر نہیں ہوتی جس میں طنز و مزاح کی طرح کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ہی انشائیہ مقصدی صنف ادب ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انشائیہ کو ایسی صنف ادب قرار دیا جاسکتا ہے جس میں انکشاف ذات کے پہلو کو اس قدر نمایاں طور پر پیش کیا جائے جیسے اسد اللہ صاحب نے مشکور حسین یاد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم احمد اور پی بی مارٹن کی مثالوں کے ذریعے واضح کیا اور اسے انشائیہ کا ایک اہم وصف قرار دیا۔ کیا یہ واقعی اتنا اہم مسئلہ ہے؟ اگر اس صنف سے قطع نظر کرکے غزل، افسانہ، خاکہ، سفرنامہ، ناول ایسی اصناف ہیں جن میں مصنف انکشاف ذات کے حوالے سے اپنی شخصیت کو پیش کردیتا ہے۔ لیکن اگر اس سلسلے میں کسی نکتہ پر اختلاف کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ کہ مغربی انشائیہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں اس عنصر کو اس قدر اہمیت کا حامل قرار دیا کہ وہ تحریریں Personal Essay کے زمرے میں شامل ہوگئیں۔ اس لیے میری رائے میں انشائیہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ انکشاف ذات کا عنصر اتنا ہی ہونا چاہیے کہ قارئین کچھ حد تک اپنی ذات کے حوالے سے ان نقوش سے مماثلت پیدا کرسکیں۔ ایک مخصوص حد تک 'انکشاف ذات' بہتر ہے مگر یہ رویہ کہیں انشائیہ کو مصنف کی ذاتی زندگی تک محدود کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے اس طرح اس میں خودنمائی کا اندیشہ ہے۔

'ہماری بات' میں ارتضی کریم صاحب کی بات پسند آئی کہ ''اردو زبان کے فروغ کے لیے رسائل زبان بہترین وسائل ثابت ہورہے ہیں اس لیے اردو رسائل کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔'' دیگر مشمولات میں اعجاز عبید کا انٹرویو پڑھ کر دلی مسرت ہوئی جو انھوں نے اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے میں گراں خدمات انجام دیں اور اپنی مختلف ویب سائٹس کے ذریعے اس نسل تک اردو زبان کو پہنچایا جس نے کمپیوٹر کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ ساتھ ہی ابوالکلام قاسمی کا مضمون بھی پسند آیا جس سے خلیل الرحمٰن صاحب کی یاد تازہ ہوگئی۔ 'یاد رفتگاں' میں نند کشور وکرم اور شعیب رضا فاطمی نے کشمیری لال ذاکر اور پیغام آفاقی کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کو یاد کرکے صحیح

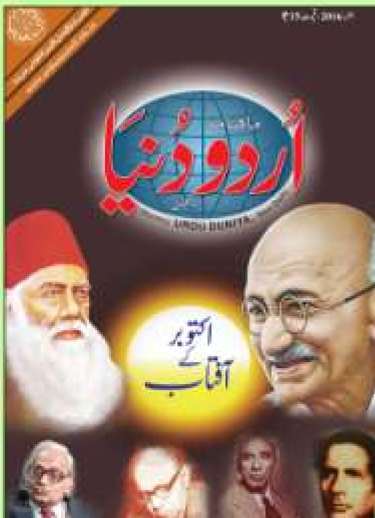

معنوں میں انھیں حقیقی خراج عقیدت پیش کیا۔ فیروز بخت کے مضمون نے بابائے قوم کی اردو دوستی اور مسلم تہذیب و ثقافت سے ایک اٹوٹ رشتے کو ظاہر کیا۔

ڈاکٹر اظہر ابرار: صدر شعبۂ اردو، ایس کے پوروال، ناگپور

'اردو دنیا' ستمبر 2016 اتحاد و یکجہتی کا علمبردار ہے۔ اس شمارہ کے اداریہ میں تہذیبی، ثقافتی اور لسانی تلاطم کے مد مقابل ایک حدِ حدید ایستادہ ہے۔ اس میں زبانوں کی بجائے ذہنی اختلافات و تصادم کو ترک کرنے کا مخلصانہ مشورہ شامل ہے۔

اردو کونسل کی یہی اولوالعزمی حکومت کے ایوانوں میں اعتراف کی گونج ثابت ہوئی۔ مہندر پرتاپ چاند نے اردو سے عاشقی کا حق ادا کردیا۔ نارتھ کوریا کی محترمہ سنگوک ہونگ پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ نوشاد حسین نے ذہنی طور پر ماؤف بچوں کی تعلیم میں آئی سی ٹی کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ جو اپنے آپ میں نہایت فکر انگیز ہے اور اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ محترم عبدالرشید صاحب نے کرشن چندر کے تصور اتحاد پر سیر حاصل بحث کی ہے ویسے کرشن چندر پر مفصل مواد ہر جا دستیاب ہے۔ عدم گونڈوی پر جناب سنتوش کمار کا مضمون تحقیقی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ تنزیل اطہر نے صحافت کے نئے اوزار موبائل اور ایس ایم ایس پر ماہرانہ معلومات سے روشناس کرایا ہے۔

انیس امروہوی کا مضمون رشی کیش مکرجی بہت پسند آیا۔ انھوں نے رشی جی کی عرق ریزی کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ویسے ہی احمد خاں صاحب نے ص 62 پر سینما اور اردو ناول میں قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ اس بار ادبی کوئز محمد عرفان سلمہٗ نے پیش کیا، جس میں ذہنی ورزش کے ساتھ ساتھ علم میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ بقیہ مشمولات حسب سابق غنیمت ہیں۔ پڑھنا شرط ہے۔

مصطفی ندیم خان غوری: رضا باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ستمبر کے شمارے میں آپ نے زبانوں کی مشترکہ میراث کو موضوع بحث بنایا ہے جو ایک دلچسپ موضوع ہے۔ کوئی بھی زبان آزادانہ طور پر وجود میں نہیں آتی بلکہ کئی زبانوں کے اثر سے ایک مختلف زبان وجود میں آتی ہے۔ مختلف جغرافیائی خطوں کے انسانوں کے آپسی سیاسی، مذہبی اور تجارتی معاملات کے نتیجے میں بھی زبانوں میں الفاظ کی منتقلی ہوتی رہتی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایک دوسرے کے الفاظ کی شمولیت کی کافی مثالیں مل سکتی ہیں اور کبھی کبھی حیرت انگیز مشاہدے بھی سامنے آتے ہیں۔ ایک ہی خطے کی زبانوں میں الفاظ کی باہمی شمولیت تو خیر فطری بات ہے مگر دو مختلف علاقوں کی زبانوں میں الفاظ کی مشابہت لسانیاتی تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر بنگلہ میں لفظ کہاں کو 'کوتھائے' کہتے ہیں اور مراٹھی میں 'کُٹھے'۔ اسی طرح بنگلہ میں 'کتنے دیے' کو کہیں گے 'کوتو دی لے' اور مراٹھی میں کہیں گے 'کی تی دلے؟' یہ مشابہت حیرت انگیز ہے کیونکہ بنگالی بنگال کی زبان ہے جو ہندوستان کے مشرق میں ہے جبکہ مراٹھی مہاراشٹر کی زبان ہے جو ہندوستان کے مغرب میں ہے۔ دونوں زبانوں میں بعد المشرقین ہے۔ دونوں زبانوں میں ایسے اور بھی الفاظ اور ترکیبیں مل سکتی ہیں جن میں مشابہت ہو۔ ایک ہی خطے کی زبانوں میں الفاظ کی مشابہت یا الفاظ کی شمولیت تو عام بات ہے مگر دو مختلف جغرافیائی خطوں میں بولی جانے والی زبانوں کے الفاظ میں مماثلت آپسی کلچرل اور سماجی اختلاط کی وجہ سے ہے جو زبان کے ارتقا کے اصول پر روشنی ڈالتا ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سنسکرت اور یورپی زبانوں یعنی مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں سے لسانی تبادلہ کرکے ایک متمول زبان بن گئی ہے۔ اس کے بہت سے الفاظ ایک طرف ہندی اور سنسکرت سے مماثل ہیں تو دوسری طرف انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی ایشیائی زبان ہے اور یوریشیا کے خطے سے قریب ہے۔ اطالوی لفظ کارتا (کاغذ) کے لیے فارسی میں قرطاس ہے۔ انگریزی لفظ لپ (Lip) کے لیے فارسی میں لب ہے۔ انگریزی لفظ ہارس (گھوڑا) کے لیے فارسی میں فرس ہے۔ سنسکرت لفظ گئو (گائے) کے لیے انگریزی

میں Cow ہے اور فارسی میں گاؤ۔ سنسکرت کا استی فارسی میں است ہے۔ نیست کو سنسکرت میں ناستی کہتے ہیں۔ سنسکرت کا استھان (جگہ) فارسی میں ستان ہے۔ فارسی کا تختی سنسکرت میں شکتی ہے۔ فارسی کا سفید سنسکرت میں شویت ہے۔ فارسی میں بدن کے لیے تن ہے جبکہ سنسکرت میں ن پر تشدید کے ساتھ تنّ ہے۔ فارسی اور سنسکرت میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن میں بڑی مشابہت ہے اور جو فرق ہے وہ رسم الخط کے فرق کی وجہ سے آگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت اور سنسکرت سے بھی پہلے ہندوستان میں مروج زبان سدھم کے بولنے والے آریہ مشرق وسطی سے ہندوستان ایران وافغانستان ہوتے ہوئے آئے۔ لہٰذا، آریوں کی زبان ایک رہی مگر ان کے رسم الخط جغرافیائی بُعد کی وجہ سے مختلف ہوگئے۔ اس لیے سنسکرت اور فارسی میں بہت ہی قریبی مشابہت ہے۔ بندے ماترم کا فارسی میں لفظی ترجمہ ہوگا بندۂ مادرم۔ فارسی لفظ بندگی کو سنسکرت میں وندنا (بندنا) کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہاتھ کے لیے 'کر' کا لفظ ہے جس سے مشتق 'کرن' (کرنا) نکلتا ہے۔ فارسی میں کرنا کے لیے 'کردن' ہے جو اسی سنسکرت اصل 'کر' سے مشتق ہے۔ اودھی زبان میں خدا کے لیے یہ شلوک ہے:

بن پگ چلے سنے بن کانا
بن 'کرون' کرے کرم بدھی نانا

(وہ بغیر پیروں کے چلتا ہے اور بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر ہاتھوں کے مختلف کام انجام دیتا ہے)

سنسکرت کا یہی 'کر' (ہاتھ) فارسی کے پورے نظام فعل (کردن) پر حاوی ہے۔ فارسی کا نظام اعداد بھی سنسکرت سے مماثل ہے۔ سنسکرت کا پنچم، ششٹھم، سپتم، اشٹم اور دشم فارسی میں پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم اور دہم ہے۔ ابر کو سنسکرت میں ابھر، زانو کو سنسکرت میں جانو کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک اصطلاح ہے 'اجانو باہو' (طویل دست) اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے بازو اتنے لمبے ہوں کہ حالت قیام میں زانو (گھٹنوں) تک پہنچتے ہوں۔ ایسا شخص یا تو بادشاہ ہوتا ہے یا درویش۔ گاندھی جی اجانو باہو (طویل دست) تھے۔ لفظ فیل بمعنی ہاتھی سنسکرت میں بھی مروج ہے۔ خاص کر شطرنج میں ہاتھی کو فیل کہا جاتا ہے۔ فارسی میں زہر کی ایک قسم ہلاہل ہے اور سنسکرت میں اس لفظ کی ایک شکل ہلاہلم ہے۔ لفظ ماں بھی دنیا کی بہت سی زبانوں میں مماثل شکلوں میں مروج ہے۔ اطالوی میں ماٹر، فارسی میں مادر، انگریزی میں مدر، سنسکرت میں ماتر، ہندی میں ماتا، ہسپانوی میں مادرے اور جرمن میں مٹر ہے۔ اسی طرح والد کے لیے اطالوی میں پیٹر، سنسکرت میں پتری، انگریزی میں فادر، فارسی میں پدر، ہسپانوی میں پادرے اور جرمن میں واٹر (Vater) ہے۔ چونکہ ماں اور باپ دنیا کے تمام معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے دنیا کی بیشتر زبانوں میں ماں اور باپ کے لیے مماثل الفاظ حیرت اور تعجب کا باعث نہیں مگر لفظ دروازہ کے لیے دنیا کی بہت سی زبانوں میں مماثل الفاظ تحقیق کا موضوع ہیں کیونکہ دروازہ معاشرے میں اتنی زیادہ اہمیت کا حامل نہیں اور نہ ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ در نہیں بلکہ گھر انسانی زندگی میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی میں دروازہ کے لیے Door ہے، فارسی میں 'در'، روسی میں 'دویر'، سنسکرت میں 'دوار' جاپانی میں 'تو' اور جرمن میں 'تور' ہے۔ عربی کے بہت سے الفاظ نہ صرف اردو میں مستعمل ہیں بلکہ سنسکرت میں بھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عربوں اور ہندوستانیوں میں ثقافتی اور تجارتی اختلاط کا سلسلہ بہت قدیم ہے جس کے نتیجے میں عربی کے الفاظ سنسکرت اور سنسکرت کے الفاظ عربی میں داخل ہوگئے۔ عربی چونکہ قرآن کی زبان ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی زبانوں پر عربی نے اثر ڈالا ہے بہت سے عربی الفاظ مسلم معاشرے میں ہو بہو یا تھوڑی تبدیلی کے ساتھ مروج ہیں۔ سنسکرت کا لفظ شول بمعنی کانٹا عربی میں شوک ہے۔ عربی کا 'فلانا' اردو میں فلاں کی شکل میں مروج ہے۔ عربی کا 'واد' اردو میں وادی ہے۔ عربی کا سروال ہندی اور اردو میں شلوار ہوگیا۔ جاڑا کے لیے سنسکرت میں شیت ہے تو عربی میں شتاء ہے۔ عربی کے دو الفاظ کرسی اور مال ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں اتنے عام ہیں کہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں۔ ایک اور عربی لفظ جو ہندوستانی زبانوں میں وسیع طور پر مروج ہے وہ ہے 'میلہ'۔ اسے ہندی کا لفظ سمجھا جاتا ہے جبکہ یہ عربی الاصل ہے۔ لفظ میلہ ہندوستان میں ثقافتی، تجارتی اور ادبی اجتماعات کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے کتاب میلہ، تجارتی میلہ، روزگار میلہ، ملن میلہ، عرس میلہ وغیرہ وغیرہ۔ ماقبل اسلام دور میں مکہ میں سیاسی حکومت برائے نام تھی۔ مکے کے انتظامی اور قانونی امور کو سنبھالنے کے لیے مکے اور اطراف کے قبائلیوں کی ایک مشاورتی کمیٹی تھی جس میں ہر قبیلے کا بااثر شخص رکن ہوتا تھا اور ہر ایک کو مختلف ذمے داریاں دی جاتی تھیں۔ اس کمیٹی کو میلہ کہا جاتا تھا۔ مگر یہ لفظ عربی سے ہندوستان چلا آیا اور یہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا کہ ہندوستان کے لوگ اسے ہندی یا مقامی لفظ سمجھنے لگے۔

انگریزی ایک جدید زبان ہے اس لیے انگریزی پر عربی کا بہت ہی گہرا اثر ہے۔ بہت سے الفاظ عربی سے انگریزی میں داخل ہوئے ہیں۔ انگریزی کا لفظ Lick (چاٹنا) عربی میں لعق ہے عربی میں آنکھ کو عین کہتے ہیں اور سنسکرت میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ نین ہے۔ قدیم انگریزی میں آنکھ کی جمع کے لیے Eyen ہے عربی کا لفظ غنا ہندی میں گانا ہوگیا۔ عربی کا قط انگریزی میں Cat ہے۔ عربی کا سکر انگریزی میں شوگر اور فارسی میں شکر ہے۔ عربی کا جمل انگریزی میں کے مل، عبرانی میں گمل یونانی میں کے مےلوس اور لاطینی میں کے مےلس ہے۔ عربی کا کوفیہ انگریزی میں Cap ہے۔ انگریزی کے علاوہ عربی کے تقریباً چار ہزار الفاظ پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں۔

اس طرح کے ہزاروں الفاظ مختلف لسانی گروہوں کے آپسی اختلاط کی وجہ سے لمبا فاصلہ طے کرکے دوسری زبانوں کا حصہ بن چکے ہیں اور بعض اوقات بدلے ہوئے معنی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر باقاعدہ تحقیق اور مطالعہ زبانوں کی پیدائش اور ارتقا سے متعلق دلچسپ اور چونکا دینے والے حقائق پیش کرسکتا ہے۔

سہیل ارشد، مرزا غالب اسٹریٹ، رانی گنج مغربی بنگال

■

قومی اردو کونسل کی مطبوعات نمبر

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ایک شمارہ قومی اردو کونسل کی مطبوعات کے تعارف اور جائزے پر محیط ہوگا۔ اس خصوصی شمارے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا، لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان ولسانیات، سائنس تکنیک و جغرافیہ، سماجیات، سیاسیات، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، قانون، فنون لطیفہ، کتب خانہ داری و کتابیات، معاشیات/تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب، تراجم اور دیگر موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں پر تبصروں کے علاوہ قومی اردو کونسل کی اشاعتی خدمات اور اشاعتی منصوبوں کی تفصیلات بھی درج ہوں گی۔

شمس الرحمن فاروقی

غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار میں پیش کیا گیا کلیدی خطبہ

ادبی تحقیق کے تقاضے

میرا ہرگز یہ منصب نہیں کہ میں ادبی تحقیق کے موضوع پر لب کشائی کروں، اور وہ بھی محققین کے مجمعے میں، جو اس کام میں مصروف ہیں اور شاید پہلے بھی تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ بیشک اہم اور بزرگ محققین کی کمی کے باعث قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام پڑ گیا ہے۔ لہٰذا چند باتیں اپنی محدود استعداد کے مطابق عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ اردو میں جو تحقیق آج کل ہو رہی ہے، یا تحقیق کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں جس زمانے میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، ادبیات اور دیگر انسانیاتی علوم (Humanities) کے شعبوں میں تحقیقی مقالہ نگاروں پر جو شرطیں پی ایچ ڈی کے لیے (یا الہٰ آباد یونیورسٹی میں، جہاں کا طالب علم میں تھا) ڈی فل کے لیے عائد کی جاتی تھیں، انھیں چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

(1) اپنے موضوع کے اعتبار سے نئے حقائق کی دریافت

(2) یا پھر اس موضوع کے بارے میں پہلے سے معلوم حقائق کی نئی تعبیر

میرا خیال ہے یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں۔ لیکن مزید وضاحت کے لیے یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ 'نئے حقائق' سے مراد وہ حقائق ہیں جو مطبوعہ ماٰخذ میں نہ ملتے ہوں۔ وہ بات جو کسی مطبوعہ ماخذ میں ملتی ہو، خواہ وہ مطبوعہ ماخذ کتنا ہی کمیاب کیوں نہ ہو، اسے ڈھونڈ کر اس میں سے کوئی بات نکال لانا موجب تحسین تو ہو سکتا ہے لیکن اسے 'نئے حقائق کی دریافت' کا درجہ نہیں دے سکتے۔ اسی طرح، 'پہلے سے معلوم حقائق کی نئی تعبیر' کا مطلب یہ نہیں کہ کسی موضوع پر مختلف اقوال جمع کر دیے جائیں اور آخر میں خلاصۂ کلام کے طور پر کچھ اپنی بھی رائے دے دی جائے۔ 'نئی تعبیر' کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ وہ قابل قبول ہو، موجودہ تعبیروں کے مقابلے میں اقلیتی رائے کی حیثیت رکھتی ہو، یا پھر وہ موجود تعبیروں پر کوئی ایسا اضافہ کرتی ہو جس کی روشنی میں ان تعبیروں کی وقعت یا معنویت میں اضافہ ہو، یا پھر ان حقائق پر نئے طور سے سوچنے کی تحریک پیدا ہو۔

واضح رہے کہ 'تعبیر' سے مراد ایسی تعبیر ہے جو ان حقائق کا پورا احاطہ کرتی ہو جن کی تعبیر پیش کی جا رہی ہے۔ اس کی سب سے مشہور اور بالکل سامنے کی مثال غالب کی غزل ہے:

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

اس غزل کا آٹھواں شعر ہے:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس شعر کی یہ تعبیر ایک زمانے میں عام تھی اور اب بھی کچھ لوگ اس کے قائل نظر آتے ہیں کہ غالب نے اس شعر میں غزل کی تنگ دامانی کی شکایت کی ہے۔ یعنی غالب جیسے شخص کو بھی شکوہ ہے کہ غزل بہت تنگ اور محدود صنف سخن ہے۔ یا یہ کہ اس میں کوئی خرابی ہے، کوئی کمی ہے جس کی بنا پر غزل میں شاعر کو اپنی بات پوری طرح پھیلا کر کہنے کی گنجائش نہیں ملتی۔

اس تعبیر کو درست ہونے کے لیے اولاً یہ ضروری ہے کہ یہ ان حقائق کا پورا احاطہ کرتی ہو جن کی تعبیر پیش کی گئی ہے۔ غزل کے اس شعر کی حد تک 'حقائق' کا پورا احاطہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ شعر کے تمام الفاظ کو مناسب اہمیت دی جائے اور ہر لفظ پر پورا غور کیا جائے اور اس کے ممکن معنی دریافت کیے جائیں۔ لہٰذا جس تعبیر کا ذکر میں نے ابھی کیا، یعنی یہ کہ اس شعر میں غالب نے غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہے، اس کی بنیاد اس بات پر ہونی چاہیے کہ شعر میں 'ظرف تنگنائے غزل' کے لفظ آئے ہیں، اور یہ بھی ہے کہ اس ظرف کو شاعر یا متکلم کے 'شوق' کے مقابلے میں کم لکھا گیا ہے۔ پھر دوسرے مصرعے میں شاعر یا متکلم تقاضا کرتا ہے کہ مجھے اپنے 'بیان' کے لیے 'کچھ اور وسعت' درکار ہے۔ 'شوق' سے مراد ہے، غزل کہنے یا غزل میں مضامین باندھنے کا شوق، اور 'بیان' سے مراد ہے مضامین غزل کا بیان، اور 'وسعت' سے مراد ہے کوئی ایسی صنف سخن جس میں اتنی وسعت ہو کہ شاعر یا متکلم اس میں اپنے 'شوق' کے مطابق خوب تفصیل سے اپنے مضامین بیان کر سکے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس شعر میں شاعر یا متکلم غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا ہے۔

یہ سب کہہ کر ہم اپنے طور پر مطمئن ہو گئے کہ ہم نے شعر میں بیان کیے ہوئے حقائق کا مکمل احاطہ کر لیا ہے اور اس لیے ہماری تعبیر بالکل درست ہے۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ غالب نے کہیں اور اس طرح کی بات کہی ہو کہ میں غزل کی تنگ دامانی کا شاکی ہوں، تو ہم مانیں کہ اس شعر میں غالب کا شکوہ عمومی شکوہ ہے، کسی مخصوص موقعے پر یہ مخصوص نکتہ غالب نے نہیں بیان کیا ہے۔ اس کے جواب میں ہم کلام غالب سے مزید ثبوت کے طور پر یہ شعر لاتے ہیں:

نہ بندھے تشنگی شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

غالب کے کلام سے یہ سند لا کر ہم نے اپنا دوسرا ثبوت بھی بیان کر دیا کہ غالب کو غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ تھا۔ شعر میں صاف کہا جا رہا ہے کہ تشنگی شوق کے مضمون نہ بندھ سکے، اگرچہ ہم نے مبالغے کی انتہا کر دی۔ لیکن اگر توجہ

سے شعر کو پڑھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اول تو یہ کہ شعر میں 'تنگیٔ شوق' کا ذکر ہے، محض شوق کا نہیں اور دوئم یہ کہ شعر میں غزل کے دامن کی تنگی کا کوئی ذکر نہیں۔ یہاں تو یہ کہا گیا ہے کہ ہماری 'تنگیٔ شوق' اس قدر بے حد و بے نہایت ہے کہ اغراق اور غلو کی تمام حدیں پار کر کے بھی ہم اسے بیان نہ کر سکے۔

یہ خیال رہے کہ 'شوق' عمومی لفظ ہے۔ اس سے کوئی بھی شوق مراد لے سکتے ہیں: جان دینے کا شوق، معشوق سے ملاقات کا شوق، وصل کا شوق، کہیں جانے کا شوق، کوئی بات کہنے کا شوق، وغیرہ۔ اگر چہ لفظ 'شوق' کو اکثر عشقیہ ماحول یا سیاق و سباق میں برتا جاتا ہے، خاص کر شعر میں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ لفظ صرف عشق کے معاملات تک محدود ہو۔ لہٰذا 'تنگیٔ شوق' اور شے ہے اور صرف 'شوق' اور شے۔ 'بقدر شوق نہیں' اور 'کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے' سے بالکل ظاہر ہے کہ 'بیان' کے شوق کی بات ہو رہی ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ کچھ بیان کرنے کا شوق بہت ہے اور دوسری بات یہ کہ اس بیان کے لیے وسعت بہت درکار ہے۔ غزل کے مضامین کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ صرف 'بیان' سے یہ مراد لینا غلط ہوگا کہ غزل کے مضامین کا بیان مقصود ہے۔ 'مضمون' سے 'بیان' مراد لینے کا کوئی قرینہ شعر میں نہیں۔ تنگیٔ شوق والے شعر میں صاف صاف 'مضمون' کا ذکر ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھ سے اور کوئی مضمون تو شاید، یا غالباً، بندھ سکتا ہو، لیکن تنگیٔ شوق کے مضامین بیان کرنے کی قوت مجھ میں نہیں ہے۔

اب شعر زیر بحث کو پھر دیکھیں۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اب یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ شاعر یا متکلم کو کچھ کہنا مقصود ہے، یا یوں کہیں کہ اسے کسی بات کو کہنے کا شوق بہت ہے، لیکن وہ بات غزل میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یعنی بات کسی خاص مضمون یا موضوع کی ہے کہ اس کے لیے یہ غزل کافی نہیں۔ یہاں غزل کی عمومی تنگی کی بات نہیں ہے، ایک مخصوص موقعے کی بات ہے۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس شعر ('بقدر ظرف نہیں...') کا ماحول کیا ہے۔ یعنی اگر چہ یہ بالکل لازم نہیں کہ غزل کے شعر باہم مربوط ہوں لیکن چونکہ شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ کچھ معمائی سی ہے، اس لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس شعر کے پہلے کیا ہے اور بعد میں کیا ہے۔ چنانچہ جب ہم زیر بحث شعر کے پہلے جو شعر گذرا ہے اس کو دیکھتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ظاہر ہے کہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے 'ظرف تنگنائے غزل' سے متعلق کیا جا سکے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ اردو کیا، فارسی شاعری میں بھی نہیں باندھا گیا۔ غزل کے مخالفین کچھ بھی کہیں اور غزل میں انسان کی کم وقعتی پر کتنا ہی ماتم کریں، لیکن یہ مضمون اپنی جگہ پر بالکل نیا ہے اور ایسا کہ پہلے تو کبھی بندھا ہی نہ تھا، بعد میں بھی کسی سے نہ بندھ سکا۔

مقولہ بالا شعر کے بعد وسعت بیاں اور تنگنائے غزل کا مضمون ہے جس کی تعبیر میں مقولہ بالا شعر سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس لیے اس سے اگلا شعر دیکھتے ہیں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

اب بات فوراً آئینہ ہو جاتی ہے۔ پچھلا شعر اس بات کی تمہید تھا کہ میں تجمل حسین خان کی مدح کا شوق بے حد رکھتا ہوں لیکن غزل کا دامن قصیدے کی طرح وسیع نہیں کہ اس میں مختلف طور اور قرینے سے مدح کے مضامین بیان ہو سکیں۔ یعنی یہاں غزل کے دامن کی تنگی کی بات نہیں ہو رہی ہے، غزل اور قصیدے کا فرق بیان ہو رہا ہے۔ غزل بنیادی طور پر عشقیہ مضامین کی شاعری ہے اور اس کی زبان بھی قصیدے کے پر شکوہ اور مغلق الفاظ سے بالعموم ابا کرتی ہے۔ قصیدہ ہوتا تو میں طبیعت کی جولانی دکھاتا، غزل میں کہاں تک اور کس طرح بیان کروں۔ پھر بھی شوق سے مجبور ہو کر چند شعر موزوں کر رہا ہوں۔

یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ غالب نے غزل کو تنگ یا قصیدہ یا مثنوی کو اس کے مقابلے میں فراخ نہیں کہا ہے۔ بات یہاں کمیت کی ہے، کیفیت کی نہیں۔ بات قصیدے میں کثرت اشعار اور غزل میں نسبۃً قلت اشعار کی ہے۔ اس غزل میں بھی مدح کو ختم کرتے وقت غالب نے یہی کہا ہے کہ لکھنے کے لیے مزید جگہ نہیں مل رہی ہے، ورق ختم ہو گیا۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

لفظ 'سفینہ' بھی یہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ 'بحر بے کراں' سے صرف مناسبت ہی نہیں رکھتا، بلکہ اس کے ایک معنی 'مجموعہ' یا 'بیاض' بھی ہوتے ہیں۔ 'بہار عجم' میں ہے کہ 'سفینہ' عرف عام میں اس بیاض کو کہتے ہیں جو لمبائی کی طرف سے کھلتی ہے اور جس کی شکل کشتی کی طرح ہوتی ہے۔ یہی معنی 'آنندراج' میں بھی درج ہیں، اس تفصیل کے ساتھ کہ عربی میں لفظ 'سفینہ' کی بہت سی جمعیں ہیں اور لغت نگار نے وہ سب درج کر دی ہیں۔

غزل زیر بحث کا مقطع دیکھئے تو ہماری تعبیر بالکل مکمل ہو جاتی ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

یہاں اگر چہ لفظ 'نکتہ' کی تکرار کچھ گراں گذرتی ہے، لیکن معنی بالکل واضح ہیں: غالب نے اس غزل میں کچھ نئے انداز سے نغمہ سنجی کی ہے، یعنی غزل میں قصیدے کے شعر ڈال دیے ہیں۔ اب جو لوگ نکتہ شناس ہیں وہ اس کی داد دیں اور اس طرح کہنے کی کوشش کریں۔

تو جب ایک شعر کی تعبیر میں اس قدر الجھن ہو سکتی ہے تو کسی وسیع الذیل حقیقت یا حقائق کی تعبیر میں کس قدر مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے تاریخ ادب سے ایک مثال لیتے ہیں۔

جب تک میر اور قائم کے تذکرے چھپ کر عام نہیں ہوئے تھے ولی کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات کا ماخذ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آب حیات' تک محدود تھا۔ مثلاً یہ بات مصدقہ طور پر معلوم نہ تھی کہ ولی کتنی بار دلی آئے اور پہلی بار کب آئے۔ مولانا محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں لکھتے ہیں:

ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان سے تھے... یہ اپنے وطن سے ابوالمعالی کے ساتھ دہلی میں آئے۔ یہاں شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو۔ مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان کے اشارے سے کی۔

اس آخری جملے پر آزاد کا حاشیہ ہے: 'دیکھو تذکرۂ فائق کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے اور وہیں تصنیف ہوا ہے۔' لیکن مشکل یہ ہے تذکرۂ فائق نامی کسی کتاب سے کوئی واقف نہیں ہے۔ نگار پاکستان کے 'تذکروں کا تذکرہ' نمبر مطبوعہ 1964 میں فرمان فتح پوری نے تمام معلوم تذکروں کی فہرست دی ہے اور پھر ان کا حال لکھا ہے۔ صفحہ 4 پر کسی 'مخزن شعرا' مرقومہ 1297 مطابق 1880 کا ذکر ہے اور مصنف کا نام نورالدین خان فائق بتایا ہے۔ لیکن کتاب کے متن میں اس تذکرے کا کوئی حال نہیں۔ فہرست میں 'مخزن شعرا' کا اندراج بھی

اپنی مناسب جگہ پر نہیں ہے، کیونکہ اس کے بعد بھی کئی تذکرے ایسے درج ہیں جو 1880 کے بہت پہلے لکھے گئے۔ 1880 میں تحریر کردہ (یا شائع شدہ) تین تذکروں کے نام فہرست میں درج ہیں: 'طور کلیم'، 'بزم سخن' اور خود 'آب حیات'۔ فائق کے تذکرے کا نام یہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے بہت پہلے آ گیا ہے اور اس کے آگے کوئی صفحہ نمبر بھی نہیں ہے، صرف 20 لکھا ہے۔

محمد حسین آزاد پر اسلم فرخی مرحوم کی مبسوط دو جلدی کتاب میں بھی نور الدین خان فائق یا 'مخزن شعرا' کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب 'آب حیات کا تنقیدی مطالعہ' یا قاضی عبدالودود کی 'محمد حسین آزاد بحیثیت محقق' میں فائق کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ ہمارے یہاں جن لوگوں نے ولی پر تحقیقی نظر ڈالی ہے، انھوں نے اس معاملے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ ورنہ یہ تذکرہ (اگر واقعی ایسا کوئی تذکرہ ہے اور بقول آزاد وہ 'خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے') حاصل ہو سکتا تو ولی اور شاہ گلشن کی مبینہ ملاقات اور شاہ صاحب کے اس مشورے کے بارے میں کہ ولی اپنا دیوان 'فارسی کے طور پر' ترتیب دیں، کچھ زیادہ تفصیلی اور زیادہ معتبر باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اس وقت تو ولی کی دہلی (پہلی اور اغلباً واحد) آمد کے بارے میں ہمارے پاس 'آب حیات' کے بعد جو دو اطلاعات ہیں وہ میر اور قائم کے تذکروں پر مبنی ہیں۔ میر کا بیان درج ذیل ہے۔ اس کے بعد میں قائم کا بیان نقل کروں گا:

ولی (محمد، ملک الشعرا) شاعر ریختہ (زبردست) (صاحب دیوان) از خاک اورنگ آباد است۔ می گویند کہ در شاہجہان آباد نیز آمدہ بود۔ بخدمت میاں (شاہ) گلشن صاحب رفت و از اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود (ند کہ) ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ (ہائے) خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔

('نکات الشعرا' از میر محمد تقی میر، مرتبہ و مدونہ پروفیسر محمود الٰہی، ادارۂ تصنیف، دہلی 6، 1972، ص 91)

شاہ ولی اللہ، ولی تخلص، شاعریست مشہور، مولدش گجرات است۔ گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی، کہ از اولیاے مشاہیر است، افتخار باداشت۔ در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ، ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود، بہ جہان آباد آمد۔ گاہ گاہ بزبان فارسی دو سہ بیت در وصف خط و خالش می گفت۔ چوں در آنجا ملازمت حضرت شیخ سعد اللہ گلشن قدس سرہ مستعد گردید، بگفتن شعر بزبان ریختہ امر فرمودند و ایں مطلع تعلیماً موزوں کردہ حوالۂ او نمودند۔

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

('مخزن نکات' از قائم چاند پوری، مرتبہ و مدونہ اقتدا حسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، 1966، متن صفحہ 21 تا 22)

ان دو عبارتوں میں کئی تضاد اور کئی اختلافات ہیں۔ ان کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

(1) میر کا کہنا یہ ہے کہ ولی جب دلی آئے تو شاعر تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے ان کے اشعار سن کر مشورہ دیا کہ فارسی میں مضامین بھرے پڑے ہیں، انھیں کیوں نہ استعمال کرو۔ میر کو یہ نہیں معلوم کہ ولی اور گلشن کی ملاقات دلی میں کب ہوئی۔

(2) قائم کہتے ہیں کہ ولی جب دہلی پہنچے تو وہ ریختہ کے شاعر ہی نہیں تھے، نہ ہی وہ باقاعدہ فارسی گو تھے۔ ہاں کبھی کبھی ایک دو بیت فارسی میں شاہ ابوالمعالی کی ثنا و صفت میں کہہ لیتے تھے۔ شاہ گلشن نے 'مضامین فارسی' کو بکار لانے کے باب میں ولی کو کچھ مشورہ نہ دیا، البتہ ایک مطلع بطور تعلیم موزوں کر کے ان کو عطا کیا۔

(3) ولی کے دہلی آنے کی تاریخ کے بارے میں میر کو کچھ نہیں معلوم۔ ان کا بیان ہے کہ 'لوگ کہتے ہیں' کہ وہ شاہجہان آباد دہلی بھی آئے تھے۔ اس کے برخلاف قائم نے پورے وثوق سے کہا ہے کہ ولی اورنگ زیب عالمگیر کے چوالیسویں سال جلوس میں دہلی آئے۔ معمولی گنتی کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سال 1112 ہجری اور 1700 عالی تھا۔ چونکہ ولی کے ورود دہلی کے بارے میں ہمیں کوئی اور قطعی اطلاع نہیں، اس لیے سب اسی تاریخ کو مانتے ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ان تضادات کا کیا ہو؟ میر کہتے ہیں شاہ صاحب نے ولی سے کہا کہ فارسی کے مضامین کیوں نہیں لکھتے ہو؟ قائم کہتے ہیں کہ ولی اس وقت تک ریختہ گو تھے ہی نہیں، چہ جائے کہ شاہ صاحب ان کا کلام سنیں اور کوئی مشورہ دیں۔ لیکن یہ انھوں نے ضرور کہا کہ ریختہ کہو اور ان کو تعلیماً ایک مطلع بھی کہہ کر دیا۔

اس بات کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ دہلی والوں نے میر اور قائم کے بیانات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا (اور یہ فیصلہ اب تک رائج ہے) کہ ولی کچھ نہ تھے اور کچھ نہ ہوتے اگر وہ دہلی نہ آئے ہوتے اور انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے فیض نہ حاصل کیا ہوتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے کسی محقق نے میر اور قائم کے تضادات اور اختلافات پر غور کیا ہو۔ محمد اکرام چغتائی، جو مورخ ہیں اور ادبی محقق کے زمرے میں نہیں آتے، انھوں نے ضرور لکھا ہے کہ 1112 میں شاہ گلشن صاحب دہلی میں تھے ہی نہیں، وہ دکن کی سیاحت کر رہے تھے۔ لہٰذا دہلی میں شاہ صاحب اور ولی کی 1112 میں ملاقات ممکن ہی نہیں ہے۔ اقتدا حسن نے چغتائی کے مضمون مطبوعہ 'اردو نامہ' بابت مارچ 1966 کا حوالہ اسی صفحے پر حاشیے میں دیا ہے جہاں سے میں نے قائم کا بیان نقل کیا۔ دوسرے صاحب ڈاکٹر محمد صادق ہیں جنھیں ہم ان کی تاریخ ادب اردو بزبان انگریزی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ محقق انھیں کوئی نہیں مانتا۔ یوں بھی، وہ انگریزی کے پروفیسر تھے، اردو والے انھیں اپنا آدمی بھلا کب مان کے دیتے؟ لیکن 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند' جلد ششم، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے صفحہ 530 اور پھر صفحہ 532 پر صادق صاحب لکھتے ہیں:

تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ولی کا سفر دہلی، نہ صرف اس کی شاعری میں بلکہ اردو شاعری کی تاریخ میں بھی ایک حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے... میری رائے میں [شاہ گلشن کی] یہ مفروضہ ہدایات اہالیان دہلی کی اختراعات ہیں۔ ان کا منشا (غیر شعوری طور پر ہی سہی) یہ ہے کہ اردو شاعری کی اولیت کا سہرا دہلی ہی کے سر ہے۔

میں چودھری محمد نعیم کا ممنون ہوں (اگرچہ مستعمل معنی میں محقق وہ بھی نہیں ہیں) کہ انھوں نے ڈاکٹر صادق کی عبارت کی خبر مجھے دی۔ لیکن میں اردو کے محققین سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے 'آب حیات' اور 'نکات الشعرا' اور 'مخزن نکات' کے بیانات پر آنکھ بند کر کے کیوں یقین کر لیا؟ آزاد کا تعصب تو اس بات سے ظاہر ہے کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ولی نے 'دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان [شاہ سعد اللہ گلشن] کے اشارے سے کی' اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ولی نے یہ تو لکھا ہے کہ میں شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد ہوں' مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں۔' اس صورت میں اس بات کا امکان کتنا رہ جاتا ہے کہ کوئی شخص، جو فن شعر میں کسی کا استاد نہ ہو، وہ اسے اتنا مہتم بالشان مشورہ دے ڈالے کہ فارسی میں مضامین پڑے ہیں انھیں بے تکلف لوٹو اور اپنا گلشن شاعری آراستہ کرو۔

قائم نے تو کہہ دیا کہ شاہ گلشن سے ملاقات کے پہلے ولی ریختہ کے شاعر ہی نہ تھے، لیکن آزاد خود کہہ رہے ہیں کہ ولی نے ایک شعر میں ناصر علی سرہندی کو کھل کر چنوتی دی ہے۔

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

'کلیات ولی' مرتبہ نورالحسن ہاشمی مطبوعہ لاہور، 1996، صفحہ 195 پر یہ شعریوں درج ہے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

بیشک یہ شعر آزاد کے روایت کردہ شعر سے بہتر ہے، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ایسا شعر ناصر علی کے زمانۂ حیات ہی میں کہا گیا ہوگا۔ ناصر علی سرہندی کا سال وفات 1996 ہے۔ اس طرح یہ بات بالکل صاف ہے کہ 1996 تک (یعنی دہلی آنے سے کم از کم چار سال پہلے) ولی شعر گوئی میں اتنے مشاق اور مستحکم ہو چکے تھے کہ اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے فارسی استاد کو اس طرح للکار سکتے۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ 'نئے حقائق کی دریافت' ہو، یا 'پہلے سے معلوم حقائق کی نئی تعبیر'، ولی کے بارے میں ان دونوں شرائط کا حق 'آب حیات' اور 'نکات' اور 'مخزن' میں درج کردہ بیانات کی تحقیق کی حد تک ہم سے ادا نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے کھلے طور دہلی والوں کے تعصب کو اس کا ذمہ دار بتایا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جو دہلی والے نہیں بھی ہیں وہ بھی میر اور قائم کے اختراع کردہ افسانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ تبسم کاشمیری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

شمال کے اس سفر کی داستان خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ بات ظاہر ہے کہ شمالی ہند کے ادبی ماحول، تہذیبی فضا اور شعری اسالیب سے ولی نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

یعنی اب بات 'تھا' سے 'ہوگا' تک آ گئی، لیکن بات رہی وہی پہلے سی۔ لطف یہ ہے کہ اسی صفحے پر تبسم کاشمیری نے یہ بات کہی ہے کہ 'یہ ولی کا کمال تھا کہ اس نے شمالی ہند میں فارسی روایت کے مغرور علما اور شعرا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔'

بھلا 'بہت کچھ سیکھنے' میں 'جھنجھوڑ کر رکھ دینے' کا عنصر کہاں رہا ہوگا؟ لیکن ظاہر ہے ولی رہے پھر بھی دہلی کے ممنون احسان کہ بقول ناصر نذیر فراق، 'ورود دہلی کے پہلے ولی شاعر ہی نہیں تھے، وہ جو کچھ ہیں انھیں دہلی نے بنایا۔' جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت زور لگایا ہے کہ ولی کا انتقال 1707/1708 کے بہت بعد ہوا ہوگا، کیونکہ اگر وہ دہلی پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد راہی ملک عدم ہوئے تو بھلا انھوں نے وہ سارا کلام کب کہا ہوگا جو کمیت میں خاصا ہے اور جس پر بقول جالبی صاحب، دہلی کا اثر صاف نظر آتا

جو نتیجے اور فیصلے پہلے سے موجود ہیں یا ہم نے ورثے میں پائے ہیں، ان پر آنکھ بند کر کے یقین نہ کر لینا چاہیے۔ کوئی روایت، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی دلکش یا کتنی ہی مستند کیوں نہ ہو اسے اسی وقت قبول کرنا چاہیے جب اپنی ذاتی تحقیق اس کی تصدیق کر دے۔ ہمارے یہاں کتاب پر اعتماد کی رسم بہت مستحکم ہے۔ کسی مبتدی طالب علم کے لیے تو یہ طریق عمل بہت مناسب ہے، لیکن محقق کا یہ منصب نہیں۔ یہ بھی ہے کہ ادبی تہذیب میں بعض باتیں غیر معمولی شہرت حاصل کر لیتی ہیں، خواہ وہ کسی کتاب میں نہ ہوں۔

ہے؟ لیکن حقیقت بہرحال یہی ہے کہ ولی کا مکمل ترین کلام جس مخطوطے میں ملتا ہے اس کی تاریخ کتابت 1709 ہے۔ اس کے بعد اگر وہ جیتے ہوتے اور انھوں نے کچھ کہا ہوتا تو وہ کہیں تو ملتا۔

فن تحقیق پر ہمارے یہاں کئی کتابیں اور کئی مضامین ہیں۔ تقریباً سب میں دیانت داری پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن مجرد دیانت داری کسی کام کی نہیں۔ دیانت داری کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ پوری اور سخت چھان بین کے بغیر کسی ایسی بات کو، یا کسی ایسے نتیجے کو نہ قبول کر لیا جائے جو ہمارے دل کو بھاتا ہو۔ بلکہ ایسے نتیجے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے جو ہمارے حسب دلخواہ ہو۔ ہماری ادبی تحقیق کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہیں کہ محقق نے پوری ایمان داری کے ساتھ کسی نتیجے کو اس لیے قبول کیا کہ وہ اس کے معتقدات کے موافق تھا، یعنی اس کا خیال تھا کہ اس چیز کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

داغ پر ہم لوگوں کی خامہ فرسائیاں اس کی مثال ہیں۔ انگریزی تاریخیں یا انگریزوں سے متاثر تاریخیں پڑھ پڑھ کر ہم لوگوں نے یقین کر لیا کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لال قلعہ ہر طرح کی بداطواری اور تعیش پسندی اور ذہنی انحطاط کا صدر مقام تھا۔ پھر ہم لوگوں نے پڑھا کہ داغ کی ماں نے ایک شہزادے سے شادی کر لی اور قلعہ میں جا رہیں اور داغ بھی ان کے ساتھ تھے۔ لہٰذا داغ کی نشوونما لال قلعے میں ہوئی۔ داغ کے بارے میں یہ کہا گیا:

مغلیہ حکومت کا یہ آخری دور تھا۔ شمشیر و سناں سے گذر کر طاؤس و رباب میں شاہی خاندان مصروف تھا...

رقص و سرود کی محفلیں، قلعے کی بیگمات، خواصیں، چونچلے، رنگ رلیاں، اس ماحول میں شہزادوں کے ساتھ داغ نے بھی بارہ سال گذارے۔

ہم لوگوں کے خیال میں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ قلعے والوں کی تمام بری باتیں داغ کی طینت میں پیوست ہو جائیں۔ مندرجہ بالا رائے کا بلا واسطہ یا بالواسطہ پرتو داغ کے بارے میں ہر تحریر میں ملتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقتباس کی سب باتیں غلط ہیں سوا اس کے کہ داغ نے قلعے میں بارہ سال گذارے۔ اگر ذرا سی بھی کاوش کی جاتی تو داغ کے بارے میں ہمارے نتائج بالکل مختلف ہو سکتے تھے۔ لیکن جو نتیجہ ہم نے نکالا وہ جذباتی طور پر ہمارے لیے قابل قبول تھا کہ داغ تو محض ٹھٹھول کے شاعر تھے، ان کے کلام میں مضامین بلند نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ ارباب نشاط میں بہت مقبول تھے۔ مزید کاوش کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ داغ کا دیوان کھولنے کی زحمت کون کرتا۔

یہیں سے محقق کے منصب کے بارے میں دوسری اہم بات بھی سامنے آتی ہے: جو نتیجے اور فیصلے پہلے سے موجود ہیں یا ہم نے ورثے میں پائے ہیں، ان پر آنکھ بند کر کے یقین نہ کر لینا چاہیے۔ کوئی روایت، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی دلکش یا کتنی ہی مستند کیوں نہ ہو اسے اسی وقت قبول کرنا چاہیے جب اپنی ذاتی تحقیق اس کی تصدیق کر دے۔ ہمارے یہاں کتاب پر اعتماد کی رسم بہت مستحکم ہے۔ کسی مبتدی طالب علم کے لیے تو یہ طریق عمل بہت مناسب ہے، لیکن محقق کا یہ منصب نہیں۔ یہ بھی ہے کہ ادبی تہذیب میں بعض باتیں غیر معمولی شہرت حاصل کر لیتی ہیں، خواہ وہ کسی کتاب میں نہ ہوں۔ انسان کا مزاج ایسا ہے کہ وہ مشہور باتوں پر، یا لکھی ہوئی باتوں پر یقین کر لینے پر بہت مائل رہتا ہے، خاص کر اگر ایسی باتیں دلکش یا ڈرامائی انداز میں بیان کی گئی ہوں۔ محقق کو اس کمزوری سے مبرا ہونا چاہیے۔

ہمارے جدید شعرا میں میراجی ایک ایسے ہیں جن کی شخصیت کی بارے میں خاکے کے نام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور وہ کم و بیش سب کا سب حقیقت کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ میراجی کا افسانہ پہلے بنا، خاکے بعد میں لکھے گئے۔ یعنی ان کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی، اسے اسرار کہیے، کشش کہیے، یا توجہ انگیزی کہیے، لیکن کچھ ایسا ضرور تھا کہ لوگوں کو ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور کرنے میں مزہ آتا تھا۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہر خاکہ ان کی زندگی کی کسی

منزل پر لکھا گیا ہوگا، وہ ان کی پوری زندگی کو محیط نہیں ہو سکتا۔ لیکن اکثر لوگوں نے ہر خاکے کو میرا جی کی پوری شخصیت کی تصویر سمجھ لیا ہے۔ ہر چند کہ میرا جی کی تخلیقی شخصیت تو دور رہی، ان خاکوں سے ان کی پوری زندگی کی بھی فہم نہیں حاصل ہو سکتی۔ مثلاً کہا گیا کہ میرا جی اپنی پتلون کی جیبیں کٹوا دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن کون سے میرا جی؟ بمبئی کے میرا جی، یا دہلی کے میرا جی، یا حلقۂ ارباب ذوق کے میرا جی، یا 'ادب لطیف' کے مدیر میرا جی؟ بعض لوگوں نے کہا کہ ان کی نظمیں مبہم ہوتی تھیں اور انھیں ابہام بہت پسند تھا۔ وہ اپنی بات کو گھما پھرا کر کہنا پسند کرتے تھے۔ لیکن 'مشرق و مغرب کے نغمے' میں جو میرا جی ہیں وہ تو انتہائی شفاف نثر لکھتے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کی کتاب 'اس نظم میں' کا صرف نام سن لیا، اور چونکہ یہ مفروضہ بہت مشہور تھا کہ میرا جی کا کلام مشکل اور مبہم ہوتا تھا، لہٰذا انھوں نے کتاب پڑھنے کی زحمت کیے بغیر لکھ دیا کہ میرا جی کا کلام اس قدر مشکل تھا کہ انھوں نے مجبوراً خود ہی 'اس نظم میں' نامی ایک کتاب لکھی اور اس میں اپنی نظموں کے معنی بیان کیے۔

ہمارے یہاں پہلے زمانے کی ادبی تاریخ کے بارے میں اس طرح کی حکایتیں بہت مشہور ہیں کہ مثلاً انشا آخری عمر میں بالکل بد حال اور مجنون ہو گئے تھے، یا غالب نے آخیر آخیر میں طرز میر اختیار کیا، یا اردو 'لشکری زبان' ہے کیونکہ 'اردو' کے معنی 'لشکر' ہیں۔ محقق کو یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ جو بات جتنی ہی مشہور ہوگی، اتنا ہی قوی امکان اس بات کا ہوگا کہ وہ غلط ہوگی۔ لیکن ہمارے محققین نے اس اصول کو اکثر نظر انداز کر دیا ہے۔

آج ہماری زبان پر کڑا وقت پڑا ہے۔ اور اس کی وجہ سیاسی یا سماجی نہیں بلکہ خود ہم لوگوں کی سہل انگاری اور ہم میں غور و تحقیق کی کمی ہے۔ آج اردو پڑھنے والے کم نہیں ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ اردو پڑھے ہوئے شخص کو معاش نہیں ملتی۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اچھے پڑھانے والے نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو جیسی بھی ہو ٹوٹی پھوٹی ڈگری حاصل کر لینے اور پھر تلاش معاش کے لیے جوڑ توڑ میں لگ جانے کی جلدی ہے۔ آج کل ہماری یونیورسٹیوں میں جن موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے اور جس طرح کی تحقیق ہو رہی اس میں بھاری اکثریت 'فلاں کی حیات اور کارنامے' قسم کی ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اب کم حقیقت اور زندہ لوگوں کے 'کارناموں' کے الگ الگ پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ مثلاً 'فلاں کی افسانہ نگاری'، پھر اسی شخص کی شاعری، پھر اسی شخص کی تحقیق، وغیرہ الگ الگ موضوع بن گئے ہیں۔ زندوں بچاروں پر یوں لکھا جا رہا ہے گویا اب انھوں نے اپنا کام پورا کر لیا اور اب ہم ان کے 'کارناموں' کا مکمل احاطہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی یونیورسٹی میں، یا مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیق کی داد دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تحقیقی مقالوں میں نئی بات کیا، تنوع بھی نہ ہوگا۔ 'چبائے ہوئے نوالے'، 'چچوڑی ہوئی ہڈیاں' جیسے فقرے ایک زمانے میں ہماری شاعری کے بارے میں استعمال ہوتے تھے۔ اب یہی فقرے ہمارے تحقیقی مقالوں پر صادق آتے ہیں۔

'فکر و تحقیق' کا تازہ نمبر ناول کے بارے میں ہے۔ اس میں ایک حصہ ان تحقیقی مقالوں کی فہرست پر مشتمل ہے جو ناول سے متعلق کسی موضوع پر مختلف یونیورسٹیوں میں لکھے گئے ہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر عجب بے چارگی اور مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ شروع کے صرف تین صفحوں میں مندرج موضوعات کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اردو میں خواتین ناول نگار، ان کے ادبی اور فنی کارنامے
جدید اردو ناول میں سماجی افکار کا تنقیدی جائزہ
اردو ناولوں میں گھریلو زندگی
اردو ناول میں نسوانی کردار
نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار
اردو ناولوں میں نسوانی کرداروں کا نفسیاتی اور سماجی جائزہ، نذیر احمد سے 1975 تک
ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں تمثیلی کردار
اردو ناول کا سیاسی و سماجی پس منظر، ابتدا سے 1947 تک
نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی بصیرت
اردو ناولوں میں ہندوستانی زندگی کا عکس
نذیر احمد کے ناولوں کے نسوانی کردار
نذیر احمد بحیثیت اخلاقی ناول نگار
نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی اقدار
اردو ناولوں پر مغربی اثرات، 1935 سے 1980 تک
قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا جائزہ
اردو ناول میں انگریزی ناول کے اثرات
اردو ناول میں ترقی پسندانہ عناصر
اردو ناول پر ترقی پسندانہ عناصر (موضوع بظاہر ایک ہے، نگراں بھی ایک ہے، سال بھی ایک ہے، صرف 'محقق' صاحب کا نام مختلف ہے۔)

آج ہماری زبان پر کڑا وقت پڑا ہے۔ اور اس کی وجہ سیاسی یا سماجی نہیں بلکہ خود ہم لوگوں کی سہل انگاری اور ہم میں غور و تحقیق کی کمی ہے۔ آج اردو پڑھنے والے کم نہیں ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ اردو پڑھے ہوئے شخص کو معاش نہیں ملتی۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اچھے پڑھانے والے نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو جیسی بھی ہو ٹوٹی پھوٹی ڈگری حاصل کر لینے اور پھر تلاش معاش کے لیے جوڑ توڑ میں لگ جانے کی جلدی ہے۔ آج کل ہماری یونیورسٹیوں میں جن موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے اور جس طرح کی تحقیق ہو رہی اس میں بھاری اکثریت 'فلاں کی حیات اور کارنامے' قسم کی ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اب کم حقیقت اور زندہ لوگوں کے 'کارناموں' کے الگ الگ پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

اردو ناول کا سماجی پس منظر آزادی کے بعد

اس فہرست کے بعد کچھ مزید کہنے کی ضرورت شاید نہ ہو۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، ان موضوعات میں بے حد یکسانی ہے اور ان کو دو یا زیادہ سے زیادہ تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے: سماجی مطالعہ؛ کرداروں کا مطالعہ؛ اور اردو ناول پر بیرونی اثرات۔ آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ سب موضوعات نہایت سطحی ہیں اور یہ بھی کہ اکثر میں ایک ہی شخص (یعنی نذیر احمد) کو بار بار معرض گفتگو میں لایا گیا ہے۔ ایسے تحقیقی مقالوں میں نئی دریافت، یا پرانی دریافتوں کی نئی تعبیر کا امکان دور دور تک نہیں۔ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان مقالوں میں اگر کوئی بہت اعلیٰ درجے کے ہیں، ان میں کچھ معلومات تو شاید ملتی ہوں، لیکن علم نام کی کوئی شے ان میں سے کسی بھی مقالے میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کی یہ صورت حال ہمیں بہت سنجیدگی سے درون بینی اور خود احتسابی کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ ہمارے اساتذہ اور ارباب حل و عقد ان اصطلاحوں سے واقف نہیں ہیں۔

■

Mr. Shamsur Rahman Farooqui
10 Hasting Road
Allahabad - 211001(UP)

خواجہ عبدالمنتقم

قانونی ادب

اردو کی بقا کا ضامن

اصحاب علم ودانش اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ کوئی بھی زبان جو کسی بھی دور حکومت میں دفتری یا قانونی زبان رہی ہو وہ کبھی نہیں مٹ سکتی البتہ نظام حکومت یا ملک کی جغرافیائی صورت حال بدلنے کے سبب زمانۂ مستقبل میں اس کی اہمیت کم یا زیادہ ہوسکتی ہے، وہ عارضی طور پر آنکھوں سے اوجھل ہوسکتی ہے اور وہ بھی محض اس وقت جب آنکھوں پر پردہ پڑ جائے یا اس کی طرف سے ارادتاً آنکھیں موند لی جائیں مگر یہ کام بھی آسان نہیں۔ یہی کہانی ہے اردو کے عدلیہ سے ناقابل انقطاع رشتے کی جو کئی صدیوں تک خاص کر 19 ویں اور 20 ویں صدی میں لازم وملزوم کے طور پر قائم رہا اور عوام نے بھی اس کی شیرینی سے متاثر ہوکر اس رشتے کو ایک دوستانہ ماحول میں بہ رضا ورغبت پرتپاک ڈھنگ سے اس طرح قبول کیا اور قائم رکھا جیسے کہ طبی زبان میں یہ کوئی مقوی ومفرح دوا یا مشروب ہو۔ دراصل یہ طبی مواد یعنی اردو کو دفتری یا قانونی درجے کا حصول بہ اعتبار اصول قانونی ایک ایسی قانونی حقیقت ہے جس سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا۔ متذکرہ بالا تقریباً دو صدیوں کے درمیان تکمیل شدہ دستاویزات کو، جب تک ملک میں کوئی بھی نظام حکومت قائم رہے گا تب تک، دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا۔ کیا جموں وکشمیر میں سموت 1989 میں ڈوگرا دور حکومت میں اردو میں وضع کیے گئے 1932 میں نافذ رنبیر پینل کوڈ کا، جو تعزیرات ہند کا فی الواقع نقش ثانی ہے، تقریباً آٹھ دہائی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہاں کی عدالتوں میں حوالہ نہیں دیا جاتا؟ کیا اردو میں تحریر کی گئیں دستاویزات مثلاً دستاویز بیع وشرطی، دستاویز بیع قطعی، دستاویز قبولیت، دستاویز انتقال، دستاویز فارغ خطی، دستاویز اہتمام، دستاویز صلح، دستاویز برأت، دستاویز عاق یا دستاویز محروم الارث (Deed of disheritance)، دستاویز انفساخ شراکت یا تولیت نامہ، ہبہ نامہ، رہن نامہ، گروی نامہ، پٹہ نامہ، تقسیم نامہ، شراکت نامہ، وقف نامہ، حقیت نامہ (Title deed) جیسی اہم دستاویزات کو ان حقوق کو ثابت کرنے کے لیے جن کا ان میں احاطہ کیا گیا ہے، دستاویزی شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا جائے گا؟ کیا ان دستاویزات کو پڑھنے، سمجھنے اور ان کے صحیح ترجمہ وتعبیر کے لیے مترجمین ومعبرین کی ضرورت نہیں پڑے گی؟ اسی طرح مغلیہ یا برطانوی ادوار حکومت میں جاری فرمانوں، احکامات، فیصلہ جات اور تکمیل شدہ مالگزاری دستاویزات کو متعلقہ حقوق کو ثابت کرنے کے لیے عدالتوں میں پیش نہیں کیا جائے گا؟ کیا درج ذیل فرمان میں قلم بند حقائق مندرجہ جائیداد کی نوعیت کا معتبر ثبوت نہیں؟ مان لیجیے اگر سنبھل جیسے تاریخی شہر یا سنبھل سرکار کی تاریخ لکھنی ہو اور اسے گجرولہ میں واقع چوپالہ علاقے کی تفصیل درج کرنی ہو تو کیا درج ذیل فرمان کا اقتباس جو ایک معتبر ذریعہ پرمبنی ایک معتبر ویب سائٹ کے تحت دیا گیا ہے معتبر مشمولہ تاریخی مواد کا حصہ نہیں بنے گا؟

It was in very exceptional cases that official documents such as Sanads or Parwanas were issued by a queen or princess, and those who enjoyed this privilege like Nur Jahan and Jahan Ara held the highest rank in the imperial harem. Thus the document under notice indicates the leading position of Maryam Zamani in the harem. It runs as follows:—

الله اکبر

(مہر) ولی نعمت بیگم والدہ نورالدین جہانگیر بادشاہ

(طغرٰی) حکم مریم زمانی . . . . .

(Line 1) [illegible] . . . . . . (Line 2) [illegible] . . . . . (Line 3) [illegible] . . . . . (Line 4) [illegible] . . . . . (Line 5) [illegible] . . . . . (Line 6) [illegible] (Line 7) [illegible] (Line 8) [illegible] . . . . . . فی التاریخ . . . (Line 9) [illegible] . . .

(Discovering Mughal, Rajput & Mauryan History_ Farman of Wali Nimat Mariam-Uz-Zamani Begum with Scan of Original Persian Document_files)

مغلیہ دور میں اس طرح کی دستاویزات ابتداءً فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ دستاویزات اردو کے ارتقاء کے دوران فارسی واردو یعنی ملی جلی زبان میں لکھی جانے لگیں۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب یہ دستاویزات صرف اردو میں لکھی جانے لگیں لیکن اردو میں لکھی جانے والی دستاویزات میں بھی بیشتر الفاظ عربی وفارسی کے ہی رہے اور آج بھی ہماری عدالتوں میں مدعی، مدعا علیہ، عرضی، عرضی دعویٰ، جواب دعویٰ، جواب الجواب، عدالت، شہادت، شکایت، سماعت، تفتیش، تعمیل، تکمیل، مثل، دریافت، ترمیم، استغاثہ بیع نامہ، رہن نامہ، منظوری، خارج، حکم، فیصلہ، ہدایت، نقشۂ مرگ، فرد مقبوضگی آلۂ جرم، فرد مقبوضگی پارچات خون آلود،

وغیرہ جیسے سیکڑوں الفاظ عدالتوں میں اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں آج بھی استعمال کیے جارہے ہیں اور پولس عملے کو اس ضمن میں پولس ٹریننگ مراکز میں باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہماری اردو اکادمیاں بھی اس سلسلے میں ان تربیتی پروگراموں میں ضروری امداد بہم پہنچارہی ہیں اور کبھی کبھی خود بھی اس طرح کے تربیتی پروگراموں کا انعقاد کرتی ہیں۔ آیئے اب اردو کے عدلیاتی سفر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ کئی صدیوں تک ہندوستان میں فارسی عدالت کی زبان رہی اور ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے اسے سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف اردو بلکہ دیگر مقامی زبانوں (Vernaculars) کو بھی پوری پوری اہمیت دی تاکہ وہ مختلف علاقوں کے لوگوں کی کم از کم زبان کے حوالے سے خوشنودی حاصل کرسکیں، ان سے بہتر روابط قائم کرسکیں اور انگریزی عدلیاتی افسران دعووں کے نفس موضوع، متنازع فیہ موضوع یا امر متنازعہ و پیش کی گئی دستاویزی شہادت کی قدر پیمائی و قانونی پرکھ کے بعد صحیح فیصلہ دے سکیں اور انصاف رسانی کے عمل میں بھی تیزی آئے۔ 1793 اور 1797 کے بنگال ضوابط تعدادی iv اور ix کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دعویداروں کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ اپنے دعوے اپنی اپنی زبان میں پیش کرسکیں۔ اسی طرح انھیں اس بات کی بھی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ گواہان کے بیانات اپنی زبان میں درج کراسکیں۔ فارسی چونکہ ایک غیرملکی زبان تھی اور اس زبان میں یہاں کے لوگوں کو اپنے دعوے پیش کرنا اور عدالت کو اپنی بات سمجھانا آسان کام نہیں تھا اس لیے کمپنی کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا راستہ نکالنا ضروری تھا جس سے فارسی میں درج کارروائی اور دستاویزات کا انگریزی میں ترجمہ کرانے کی ضرورت نہ پڑے اور انصاف رسانی کے کام میں تاخیر نہ ہو۔ دراصل کمپنی کی کوشش تو بتدریج انگریزی ہی کو عدالتی زبان کا درجہ دینے کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ 1832 تک تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانوں کے ساتھ ساتھ جزوی طور پر انگریزی کا استعمال بھی شروع کردیا گیا۔ اسی طرح بمبئی میں (جس کا اب نیا نام ممبئی ہے) فارسی مکمل طور پر ختم کردی گئی اور گجراتی و مراٹھی نے اس کی جگہ لے لی۔ بعدازاں حکومت ہند نے بنگال اور آگرہ کی حکومتوں سے بھی صدر عدالتوں اور عدلیاتی افسروں سے مشورہ لینے کے بعد اس سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے کہا۔ بنگال پریزیڈنسی میں 60 سے زائد افسران سے مشورہ لیا گیا۔ ان میں سے 30 افسران نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ فارسی کو ہی عدالت کی زبان رکھا جائے جب کہ 5 افسران نے یہ سفارش کی کہ اس کی جگہ اردو یا عام طور پر بولی جانے والی ہندوستانی زبان کو عدالتی درجہ دیا جائے۔ 24 افسران نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ فارسی کی جگہ مقامی زبان کو عدالتی زبان کا درجہ دیا جائے۔ صرف 4 افسران ایسے تھے

صدیوں تک ہندوستان میں فارسی عدالت کی زبان رہی اور ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے اسے سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف اردو بلکہ دیگر مقامی زبانوں (Vernaculars) کو بھی پوری پوری اہمیت دی تاکہ وہ مختلف علاقوں کے لوگوں کی کم از کم زبان کے حوالے سے خوشنودی حاصل کرسکیں، ان سے بہتر روابط قائم کرسکیں اور انگریزی عدلیاتی افسران دعووں کے نفس موضوع، متنازع فیہ موضوع یا امر متنازعہ و پیش کی گئی دستاویزی شہادت کی قدر پیمائی و قانونی پرکھ کے بعد صحیح فیصلہ دے سکیں اور انصاف رسانی کے عمل میں بھی تیزی آئے۔

جنھوں نے انگریزی کو عدالتی درجہ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ شمالی-مغربی صوبوں میں صورت حال اس سے کافی مختلف رہی۔ 33 افسران نے فارسی کی جگہ ہندوستانی کی ہی حمایت کی اور 29 افسران نے مخالفت کی۔ اسی دوران یہ مانگ بھی کی جانے لگی کہ ہندوستانی کے لیے رومن یا دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جائے۔ ساگر اور نرمدا ڈویژن کے کمشنر Shore نے تو عدالتوں میں دیوناگری رسم الخط میں ہندی کا استعمال بھی شروع کردیا چونکہ وہ فارسی اور رومن رسم الخط دونوں کا ہی مخالف تھا۔ ہندوستانی کو رومن رسم الخط میں لکھے جانے کے حامیوں کا یہ کہنا تھا کہ ایسا کرنے سے انگریزی کو قومی رنگ عطا کرکے مقامی و قومی زبان بنانے کے عمل میں مدد ملے گی۔ مختلف علاقوں میں اس ضمن میں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، الگ الگ رائیں دی جاتی رہیں اور مختلف علاقوں میں مختلف آرا کے اظہار کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1837 میں ایکٹ xxix وضع کیا گیا اور اس ایکٹ میں گورنر جنرل کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ عدالتی یا مالگذاری کی کارروائیوں میں فارسی زبان ختم کرکے کوئی بھی زبان یا رسم الخط اختیار کرنے کے احکامات جاری کرسکتے ہیں۔ اس ایکٹ میں گورنر جنرل ان کونسل کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ اپنے اختیارات کسی ذیلی اتھارٹی کو بھی تفویض کرسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی-مغربی صوبوں کی عدالتوں میں ہندوستانی نے فارسی کی جگہ لے لی اور صوبۂ بنگال میں مقامی زبانوں نے۔ یہ ہندوستانی دراصل فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو زبان ہی تھی اور اس طرح اردو کو شمالی-مغربی صوبوں میں نئی عدالتی زبان کا باقاعدہ درجہ حاصل ہوگیا۔

اگرچہ صوبۂ بنگال میں ضلع عدالتوں میں مقامی زبانوں کے استعمال کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن صدر عدالت میں Language of record کا درجہ فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کو ہی دیا گیا۔ مختصر یہ کہ فارسی عدالت کی زبان نہیں رہی۔ اردو کو یہ درجہ حاصل ہونے سے لسانی صورت حال میں ایک تبدیلی یہ اور آئی کہ انگریزی کو بتدریج زیادہ اہمیت ملتی رہی اور انگریزی کے حامی انگریزی کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے برابر زور دیتے رہے تاکہ انگریزی بیرسٹروں اور انگریزی جاننے والی ہندوستانی Elite کلاس کو انگریزی میں صدر عدالتوں میں بحث کرنے میں آسانی ہو۔ اس طرح وہ وقت آہی گیا جب عدالتوں میں اردو کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور انگریزی نے اسے مغلوب کرلیا۔ چارٹر ایکٹ 1853 کے منظور ہوجانے کے وقت Sir Frederick James Halliday KCB (1806 – 1901) نے، جو برطانوی سول سرونٹ تھا اور بنگال کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر، برٹش پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی کے روبرو جو بیان دیا تھا اسے انگریزی میں نیچے ہو بہو نقل کیا جارہا ہے تاکہ قارئین کو یہ بھی معلوم ہوسکے کہ اس زمانے میں ہندوستانی زبانوں و علاقوں کو انگریزی میں کس طرح لکھا جاتا تھا۔

"I may say that English has been introduced as the language in the administration of justice in the **Sudder** Court, somewhat in this way: the nominal language of the court is **Oordu** but the records of the appeal cases from the various courts come up in the language of the court in which they have been tried; Bengalee from Bengal, **Oordu** or Hindustanee from Bihar, **Oria** from **Cuttock**, and so on. The language, in which the pleadings are supposed to

be conducted, if there are oral pleadings and oral discussion in **Sudder** Court, is **Oordu** or Hindustanee, but a rule has been made that whenever the **Vakeels**, who answer to the Barristers, on both sides understand English and are willing that the business should be conducted in English, it may be so conducted. The effect of that and of the gradual coming in to the Court of English Barristers from the Supreme Court and of natives, who understand English better than anything else, has been to make the use of English in the **Sudder** Court the rule, and the use of **Hindustanee** the exception, and **Hindustanee** is fast going out as the language in use in the Sudder Court, with very marked advantage."

متذکرہ بالا اقتباس میں کئی ایسے الفاظ ہیں جن کی انگریزی Spellings بھی بدل چکی ہیں۔ اب Oordu کو Urdu لکھا جارہا ہے، Sudder Court کو Sadar Court لکھا جاتا ہے حالانکہ اب یہ عدالتی نظام ختم ہوچکا ہے۔ اسی طرح اب Cuttock کو Cuttack لکھا جاتا ہے۔

19ویں و 20ویں صدی میں ایک طویل عرصے تک یوپی میں عدلیہ و عاملہ کی واحد زبان اردو تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سبھی لوگ اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دلانا چاہتے تھے تاکہ وہ کوئی باوقار ملازمت حاصل کرکے عصری قومی دھارے میں شامل ہوکر ایک خوش حال زندگی گزار سکیں۔ یہ کسی ایک فرقے کی زبان نہیں تھی۔ کتنے ہی ہندو بچے اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ 61-1860 اور 74-1873 کے درمیان شمالی-مغربی صوبوں میں اردو سیکھنے والے طلبا کا تناسب اس وقت اسکولوں میں مسلم طلبا کے تناسب سے کہیں زیادہ تھا۔ 74-1873 میں ان صوبوں کے ورنا کلر اسکولوں میں مڈل اور اس سے نیچے کی جماعتوں میں مسلم طلبا 16.2 فیصد تھے جب کہ سرکاری اسکولوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اردو طلبا کا تناسب 35 فیصدی تھا۔ 1872 میں اودھ کے چیف کمشنر کے سکریٹری نے یہ رپورٹ دی تھی کہ اس وقت صوبے میں ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی لیکن رائج الوقت نصاب کا بیشتر حصہ ہندی، سنسکرت نہ ہوکر اردو، فارسی پر مشتمل تھا۔ اس وقت سرکاری اسکولوں میں 22,074 طلبا اردو، فارسی یا عربی پڑھ رہے تھے جب کہ ہندی یا سنسکرت پڑھنے والے طلبا کی تعداد صرف 4 ہزار 959 تھی۔

مندرجہ بالا تجزیے سے منطقی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم اور روزگار کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جب کوئی زبان ایک بار سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرلیتی ہے تو ملک کے نقشۂ السنہ پر اس کے نقوش ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کے وقت اپنے جغرافیائی قتل کے بعد اردو آج بھی زندہ ہے اور جب تک ہندوستان کا قانونی و عدلیاتی نظام، جسے معاصر دنیا کے نظام ہائے قوانین میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے اور جو تاریخ کے مختلف ادوار میں بدلتا تو رہا مگر اس پر کبھی قدغن نہیں لگا، قائم ہے، اپنی ہزارہا سال کی مثالی و روایتی درجہ بندی اور واضعین قوانین کی بلند نظری، وسیع خیالی، وسیع ظرفی

کچھ ریاستوں میں عدلیاتی و نیم عدلیاتی اداروں، محکمۂ پولس وغیرہ میں اردو الفاظ کی جگہ ہندی یا علاقائی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی ہدایات وقتاً فوقتاً جاری کی جاتی رہی ہیں مگر تاہنوز ان ریاستوں میں بھی ان الفاظ کا استعمال برابر جاری ہے۔ جس طرح روم کی تعمیر ایک دن میں نہیں ہوسکتی تھی اسی طرح روم کا انہدام بھی ایک جھٹکے میں نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی ایسا کرنا قرین مصلحت نہیں چونکہ آئین کی دفعہ 351 جو ہندی زبان کو فروغ دینے سے متعلق ہے خود اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دوسری زبانوں میں استعمال ہونے والی تراکیب، اسلوب اور اصطلاحات کو اپناتے ہوئے اور سنسکرت و دوسری زبانوں سے الفاظ اخذ کرکے ہندی کو مالا مال کیا جائے۔

اور فیاضیانہ جذبات و احساسات کو درگزر کرتے ہوئے اردو جو کئی صدیوں تک عملی طور پر عدلیہ کی زبان رہی ہے اور عدل گستری کا کبھی یکتا تو کبھی دیگر زبانوں کے ساتھ ذریعہ رہی ہے، کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے عوام میں قانونی بیداری پیدا کرنے کے لیے سرکاری، نیم سرکاری و نجی اداروں کی جانب سے کی جانے والی کوششوں میں تیزی آرہی ہے ویسے ویسے قانونی ادب کو قدرے اہمیت دی جانے لگی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو بھی قانون سے متعلق تقریباً ایک درجن کتابیں شائع کرچکی ہے اور وزارت قانون کے تعاون سے اس نے کئی سو مرکزی قوانین کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور کتنے ہی مرکزی قوانین کا مستند متن شائع ہوچکا ہے جو کونسل کے شعبۂ فروخت میں رعایتی قیمت پر باآسانی دستیاب ہیں۔ ویسے بھی حکومت کی یہ ذمے داری ہے اور مشن بھی کہ مفاد عامہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عوام میں قانونی بیداری پیدا کی جائے۔ اس ضمن میں ہماری عدلیہ بھی ایک فعال کردار نبھاتی رہی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل دہلی ہائی کورٹ نے حکومت ہند کو یہ ہدایت دی تھی کہ جنسی جرائم سے متعلق قوانین میں شامل التزامات کو عام کیا جائے۔ اسی طرح تحفظ حقوق صارفین سے عوام کو باور کرانے کے لیے کماحقہ تشہیر پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ تحفظ حقوق صارفین سے متعلق حکومت ہند وقتاً فوقتاً اشتہارات جاری کرتی رہتی ہے۔ دہلی ہائی کورٹ نے متذکرہ بالا اس امر سے متعلق فیصلے کی روشنی میں کہ جنسی جرائم سے متعلق پوسٹر، پمفلیٹ و کتابچے شائع کیے جائیں تاکہ خواتین و دیگر متعلقین کو جنسی جرائم سے متعلق قوانین میں جو حال ہی میں ترامیم کی گئی ہیں ان سے باور کرایا جاسکے، حکومت کی جانب سے متعلقہ محکموں کو بھی ایسا کرنے کی ہدایات جاری کی ہیں۔ ان ہی ہدایات کا نتیجہ ہے کہ جنسی جرائم سے متعلق لٹریچر مختلف زبانوں میں تیار کرکے عوام تک پہنچایا جارہا ہے۔ حال ہی میں این سی پی یو ایل نے جنسی جرائم سے متعلق کتاب بعنوان 'خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم' شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ آرٹی آئی، خواتین کے خلاف خانگی تشدد و دیگر اہم قوانین بعد از اشاعت منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ ہمیشہ ہمیشہ قانونی ادب کا جزو لاینفک رہیں گے۔

کچھ ریاستوں میں عدلیاتی و نیم عدلیاتی اداروں، محکمۂ پولس وغیرہ میں اردو الفاظ کی جگہ ہندی یا علاقائی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی ہدایات وقتاً فوقتاً جاری کی جاتی رہی ہیں مگر تاہنوز ان ریاستوں میں بھی ان الفاظ کا استعمال برابر جاری ہے۔ جس طرح روم کی تعمیر ایک دن میں نہیں ہوسکتی تھی اسی طرح روم کا انہدام بھی ایک جھٹکے میں نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی ایسا کرنا قرین مصلحت نہیں چونکہ آئین کی دفعہ 351 جو ہندی زبان کو فروغ دینے سے متعلق ہے خود اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دوسری زبانوں میں استعمال ہونے والی تراکیب، اسلوب اور اصطلاحات کو اپناتے ہوئے اور سنسکرت و دوسری زبانوں سے الفاظ اخذ کرکے ہندی کو مالا مال کیا جائے۔

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartments,
2-I.P. Extn., Delhi-110092

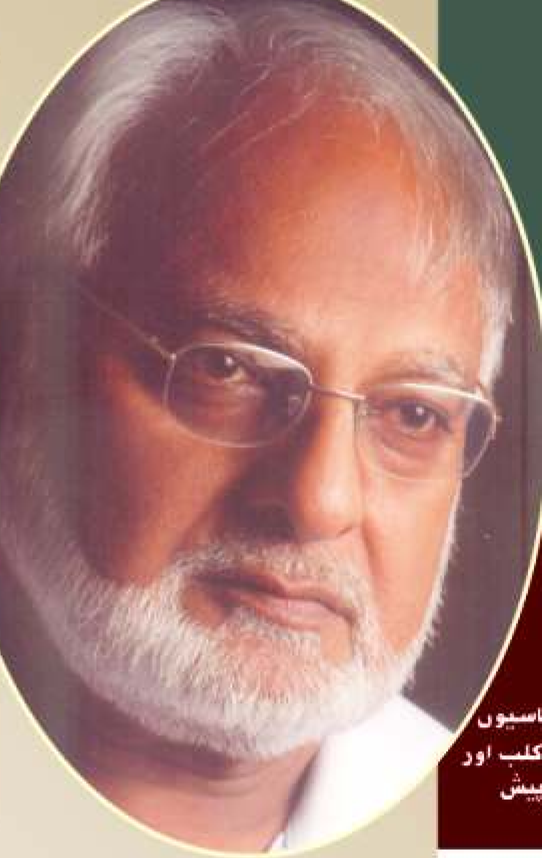

شاعری ہر دور میں افسانے سے زیادہ مقبول رہی ہے: بشیر مالیر کوٹلوی

پرویز اشرفی

پنجاب کی دھرتی بڑی متبرک اور مقدس مانی جاتی ہے جہاں اس دھرتی نے مذہب، فلسفہ و تصوف اور دیگر علوم و فنون میں کئی روشن چراغ دیے وہیں اردو افسانے کو راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی جیسے نامور افسانہ نگار دیے۔ اسی دھرتی سے بشیر مالیر کوٹلوی بھی اردو افسانے کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اور ان کے افسانوں میں بھی پنجاب کی دھرتی اور اس کے باسیوں کے مسائل اور رہن سہن کی عکاسی واضح طور پر ملتی ہے۔ افسانہ کلب اور دوسرے پلیٹ فارم کے ذریعے وہ افسانے کے فروغ میں سرگرم ہیں۔ پیش ہیں ان سے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات:

پرویز اشرفی: اپنا خاندانی پس منظر بتائیں۔

بشیر مالیر کوٹلوی: میں نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ مختصر سا کنبہ تھا۔ بچپن سے اکیلے پن کا شکار رہا ہوں۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ 'پدرم سلطان بود' کے فارمولے پر کبھی یقین نہیں کیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں کیا ہوں؟

پ ا: ادبی زندگی کا آغاز کس طرح ہوا؟

بشیر مالیر کوٹلوی: طالب علمی کے زمانے سے ہی ناول اور افسانے پڑھنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ رسالہ شمع دہلی میری پہلی پسند تھا۔ بلا شبہ فلمی جریدہ ہوتے ہوئے شمع اپنے قاری کو معیاری ادب مہیا کرتا تھا۔ شمع میں چھپنے کا خواب آنکھوں میں لے کر کچے پکے افسانے تخلیق کرنا شروع کیے۔ میرا پہلا افسانہ 1974 میں شائع ہوا تھا۔

پ ا: جس وقت آپ نے افسانہ نویسی کا آغاز کیا، آپ کے آس پاس ادبی ماحول تھا؟

بشیر مالیر کوٹلوی: جب میرے ادبی شعور نے ہوش سنبھالا تو میرے شہر میں صرف شاعری کا ماحول تھا۔ ایک بھی افسانہ نگار نہیں تھا، جو مجھے افسانے کے نشیب و فراز کے بارے میں بتاتا۔ ڈاکٹر نریش صاحب درس و تدریس کے سلسلے میں مالیر کوٹلہ سے چنڈی گڑھ ہجرت فرما چکے تھے۔ سینیئر صحافی اور ادیب گوپال متل تقسیم سے پہلے ہی جلاوطنی کا شکار ہو گئے تھے۔ جناب پریم وار برٹنی نے میری کافی حوصلہ افزائی کی۔ ملازمت کے سلسلے میں میرا تبادلہ فرید آباد (ہریانہ) ہو گیا، جہاں ایک سنجیدہ ادبی ماحول ملا۔ فرید آباد میں اُن دنوں ہیرا نند سوز، اوم کرشن راحت اور ستیش بترہ جیسے افسانہ نگار موجود تھے جو وہاں ایک ادبی انجمن چلا رہے تھے۔ وہ انجمن ادبی سنگم کے نام سے مشہور تھی، جس میں پنجابی اور ہندی کے کہانی کار بھی شامل تھے۔ دہلی قریب ہونے کی وجہ سے وہاں کے ادبا و شعرا بھی فرید آباد آتے رہتے تھے۔ اس طرح مجھے فکر تونسوی، ظفر پیامی، جوگندر پال، قمر رئیس، مجتبیٰ حسین، ستیہ پال آنند اور دلیپ سنگھ وغیرہ کی صحبت میں بیٹھنے کے مواقع ملے۔ محترم یونس دہلوی مدیر شمع سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ افسانے کے خدوخال کے بارے میں یونس صاحب کی معلومات بڑی وسیع تھی۔ اگر وقت مجھے فرید آباد کی ادبی فضاؤں میں نہ لے جاتا تو شاید میں آج تک اپنا ادھورا پن لیے بھٹکتا رہتا۔

پ ا: آپ کی ری میک کہانیوں کا بڑا چرچا ہے۔ یہ صنف کہاں تک مقبول ہوئی؟

بشیر مالیر کوٹلوی: دراصل یہ سلسلہ محترمی عابد سہیل نے شروع کیا تھا۔ انور قمر کا ری میک افسانہ 'کابلی والے کی واپسی' بہت مقبول ہوا تھا۔ اس روایت کو خورشید حیات، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور اشتیاق سعید نے آگے بڑھایا۔ میں نے ری میک کہانیوں میں کچھ اضافہ کیا کہ پہلے شاہ کار افسانے جس کا مجھے ری میک کرنا درکار ہوتا ہے، اُس کا مختصر خاکہ اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں اور عنوان کے ساتھ "2" لگا کر اشارہ دیتا ہوں کہ میری یہ تخلیق اس شاہ کار کا اضافہ ہے۔ ری میک کو میں نے بہتر اس لیے سمجھا کہ اس سے استادوں کے شاہ کار افسانوں جن پر وقت نے دھول جما دی، نئی نسل جو مطالعے کا شوق نہیں رکھتی، کے ذہنوں میں دوبارہ زندہ کر دیے جائیں۔ حالانکہ کام انتہائی مشکل ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے منٹو کے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پہ ری میک افسانہ لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ بشن سنگھ کو تقسیم کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ ہم نے کہا بھائی فسادات برپا کرنا، خون کی ہولی کھیلنا تو ذی ہوش لوگوں کا کام ہے۔ تقسیم کے فسادات کے وقت تو بشن سنگھ پاگل خانے میں تھا اور پاگل خانے میں فسادات نہیں ہوتے۔ کسی نئی اصطلاح کی کامیابی اور ناکامی قارئین کی پسند اور ناپسند سے ہوتی ہے۔ تخلیق کار کا کام تو تخلیق کرنا ہے، قاری کا کام اُسے کامیاب بنانا ہے۔ تجریدی افسانوں کا حال آپ کے سامنے ہے۔ اب افسانچہ جو واقعی افسانچہ ہو تخلیق کرنا افسانے سے بھی مشکل کام ہے۔ کم سے کم جملوں میں بھرپور افسانے کا تاثر وہی پیدا کر سکتا ہے جسے اللہ توفیق دے۔

پ ا: آپ کی نظر میں افسانچوں کا کیا مستقبل ہے؟

بشیر مالیر کوٹلوی: میری نظر میں افسانچہ اور شعر وہی کامیاب ہے جو سننے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دے اور اُس کے اعصاب پر چھا جائے۔ کوزے میں سمندر کو بند کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔

پ ا: آپ اب تک کتنے افسانچے تخلیق کر چکے ہیں؟

بشیر مالیر کوٹلوی: میں نے اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں تقریباً ساٹھ افسانچے تخلیق کیے ہیں۔

پ ا: آپ کے افسانوں میں ایک قسم کا احتجاج جھلکتا ہے۔ آپ کیا کہیں گے؟

بشیر مالیر کوٹلوی: ہر ادیب اپنا دور لکھتا ہے۔ وہ اپنے دور کا مؤرخ بھی ہوتا ہے۔ منشی پریم چند کے دور میں جاگیرداروں، راجوں رجواڑوں اور سرمایہ داروں کے مظالم اور غریب مزدور کی کسمپرسی کا عالم تھا۔ منشی پریم چند کا تخلیق کردہ ادب اپنے دور کا حال بیان کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک روس کے سرخ انقلاب کی دین تھی۔ صدی کے تقریباً وسط میں تقسیم ملک کی خونی آندھی چلی۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات جو اُس دور میں تخلیق ہوئیں، خون کے آنسو روتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ تقسیم کا المیہ ایک عرصے تک افسانہ نگاروں کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ آزادی کے بعد جمہوریت کی آڑ میں سیاسی غنڈہ گردی اور کرپشن نے سر اُٹھایا اور ادیبوں نے اُس دور کو بھی لکھا۔ خدانخواستہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہو، آگ کے شعلوں کے درمیان آپ بیوی یا محبوبہ کے ساتھ رومانس لڑائیں گے یا آگ کو بجھانے کی کوشش کریں گے۔ انسان کی گرتی ہوئی قدروں، رشتوں کی پامالی، دہشت گردی، کرپشن اور سیاسی غنڈہ گردی کی وجہ سے صرف احتجاج ہی سوجھتا ہے۔ میرا پہلا افسانہ بھوک، مہنگائی اور کم یابی کے خلاف مکمل احتجاج تھا۔ حال ہی میں میرا تازہ افسانہ چھوٹی اور معصوم بچی کے ریپ کے موضوع پر ہے۔

پ ا: آپ کے افسانوں کا اسلوب اور انداز جدا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

بشیر مالیر کوٹلوی: میری نظر میں کامیاب افسانہ وہ ہوتا ہے جو دورانِ مطالعہ قاری کو جادوئی طور پر اپنی گرفت میں لے لے اور پڑھنے والا آخری جملہ پڑھ کر ہی افسانے کے سحر سے آزاد ہو۔ یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب آپ کی بات میں دم ہو اور یہ بات تبھی پیدا ہوتی ہے جب آپ اپنے قاری کی ضرورت کو سمجھتے ہوں۔ اسلوب تو بعد کی بات ہوتی ہے۔ پہلی اہمیت تو موضوع کے انتخاب کی ہوتی ہے۔ میں کبھی عام یا فرسودہ موضوعات نہیں اپناتا۔ افسانے کا اصل موضوع اچھوتا ہو، ہٹ کر ہو تو میری فکر خود بخود موضوع کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے۔ جذبات نگاری، منظر نگاری اور دیگر لوازمات حسبِ ضرورت استعمال کرتا ہوں۔ مشاہدات کے لیے بڑی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ ایسے مقامات جہاں کبھی ہم تصور میں بھی نہیں گئے وہاں کی منظر نگاری مکمل اور صحیح مشاہدات قلم بند کرنا بہت مشکل کام ہے۔ میرا ایک افسانہ امرناتھ یاترا کے بارے میں ہے، میں کبھی کشمیر نہیں گیا۔ گھوم پھر کر چھ سات آدمیوں کا انٹرویو لیا۔ امرناتھ یاترا کے سفر میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لنگروں سے چائے اور کھانا کیسے ملتا ہے، کیا پوزیشن ہوتی ہے اس کام کے لیے تین چار مہینے بھٹکتے رہے۔ جو لوگ وہاں گئے تھے اُن سے پوچھا، کئی ایک نے تو گرم سرد باتیں بھی سنا ڈالیں۔ برداشت کرنا پڑیں تب کہیں جا کر افسانہ ہوا۔ اس افسانے کا عنوان ہے 'جیون داتا' اُس کی بنیاد میں ایک حدیث کی روشنی ہے۔ اردو افسانہ کے خزانے میں جو کھول دو، لحاف، گرم کوٹ اور ٹھنڈا گوشت جیسے شاہ کار افسانے کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اینٹی کلائمکس نہیں تھے۔ افسانے میں ٹوئسٹ ہونا ضروری سمجھتا ہوں۔ اختتام قاری کے اندازے سے برعکس ہو تو قاری عش عش کر اُٹھتا ہے۔ بات گرہ کی ہوتی ہے۔ افسانے کی گرہ آخری جملوں میں ہی کھلے تو افسانہ مزہ دیتا ہے۔ ہمارے کئی دوست اپنے عنوان سے ہی افسانے کی گرہ کھول دیتے ہیں۔ کلائمکس بھی اپنے اپنے اسلوب کی بات ہے۔ کرشن، بیدی اور منٹو کے افسانوں کا جائزہ لیں تو کرشن چندر اینٹی کلائمکس افسانوں کو تخلیق کرتے تھے۔

پ ا: ادب کے علاوہ آپ کو فنِ مصوری سے بھی شغف ہے۔ اس حوالے سے ہمیں کچھ بتائیں۔

بشیر مالیر کوٹلوی: مصوری میرے بچپن کا عشق ہے۔ صلاحیت بہت بخشی اللہ نے، کوئی رہبر نہ ملا، عمل سے تربیت نہیں۔ پوٹریٹ اور لینڈ سکیپ، اصل تصویر سے بھی جاذبِ نظر اور خوبصورت بنا دیتا ہوں، مگر کسی کو بتا نہیں سکتا کہ کیسے بناتا ہوں۔ آدھے سے زیادہ کام انگلیوں سے کرتا ہوں۔ رنگ میرے ہمجولی ہیں، رنگ میری زندگی ہیں۔ جب میں رنگوں سے گھل مل جاتا ہوں تو بچ مانیے، بھوک پیاس، رنج و غم سب فراموش ہو جاتے ہیں۔ مصوری آسیب کی طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ میں کسی کو مصوری کا درس نہیں دے سکتا، یہ میری مجبوری ہے۔ کیوں کہ مجھے تھیوری کا علم نہیں۔ میرے ہاتھوں میں تڑپتا ہوا پریکٹیکل ہے۔ صرف پریکٹیکل۔ افسانہ بیانیہ تخلیق کرتا ہوں تو مصوری میں فائن آرٹ پسند کرتا ہوں۔ ماڈرن آرٹ کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ چھوٹا سا شہر تھا مالیر کوٹلہ، یہاں کوئی مصور نہیں تھا، کوئی گائیڈ نہیں تھا، گھریلو حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ میں چنڈی گڑھ آرٹ گیلری میں تربیت کی غرض سے داخلہ لے لیتا۔ اگر مجھے تربیت مل جاتی تو میرا میدان صرف مصوری ہی ہوتا، شاید ادب کے لیے میرے پاس وقت نہیں رہتا۔

پ ا: کیا اردو افسانہ عالمی معیار کو پہنچ چکا ہے۔ ہمارے یہاں عالمی سطح پر کون سے نام رکھے جا سکتے ہیں؟

بشیر مالیر کوٹلوی: عالمی اردو افسانے کا معیار تو سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں عالمی ادب پر کون نظر رکھتا ہے؟ عالمی

محمد بشیر مالیر کوٹلوی ماہ و سال کے نقوش

نام: محمد بشیر، **قلمی نام:** محمد بشیر مالیر کوٹلوی

ولدیت: آنجہانی عبدالمجید، **تاریخ پیدائش:** 10 جون 1950

جائے پیدائش: مالیر کوٹلہ ضلع سنگرور (پنجاب)

پیشہ: ریٹائرڈ اسٹیٹ آفیسر، پنجاب وقف بورڈ

تصانیف: (افسانوی مجموعے): قدم قدم دوزخ 1987، سلگتے لمحے 1999، چنگاریاں 2007، جگنو شہر 2010، کرب آگہی 2013، عکس در عکس 2014، افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں 2015، زندگی زندگی افسانوی مجموعہ 2015

ادبی مصروفیات: • ایڈوائزر افسانچہ اکیڈمی، درگ (چھتیس گڑھ) • ایسوسی ایٹ ممبر فلم رائیٹر ایسوسی ایشن، ممبئی • صدر افسانہ کلب (رجسٹرڈ) مالیر کوٹلہ • صدر ادبی سنگم مالیر کوٹلہ • نائب صدر پاسداران اردو (رجسٹرڈ) مالیر کوٹلہ • 85-1983 ممبر ادبی سنگم فرید آباد، ہریانہ • 85-1984 صدر القلم، مالیر کوٹلہ، 89-1986 جوائنٹ سکریٹری ادبی سنگم، سونی پت (ہریانہ)

اعزازات: • 1983 میں 'غلطی کا احساس' کہانی پر ساہتیہ اکادمی چنڈی گڑھ کی جانب سے ایوارڈ۔ • 1985 میں 'قدم قدم دوزخ' افسانوی مجموعے پر بزم ادب گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کی جانب سے ایوارڈ۔ • 1989 میں 'قدم قدم دوزخ' پر ادبی سنگ سونی پت ہریانہ کی جانب سے ایوارڈ۔ • 2001 میں 'سلگتے لمحے' افسانوی مجموعے کو ہریانہ اردو اکیڈمی کی جانب سے The Best Book of year ایوارڈ۔ • ہریانہ روڈویز میں تاحیات مفت سفر • 2007 میں افسانوی مجموعے 'چنگاریاں' کو بھاشا بھاگ پٹیالہ، پنجاب کی جانب سے راجندر سنگھ بیدی ایوارڈ۔ • 2010 انجمن اتحاد ملت (رجسٹرڈ) مالیر کوٹلہ کی جانب سے اردو فکشن ایوارڈ۔ • 2011 اترپردیش اردو اکادمی ایوارڈ

رہائش: نزدیک پنجاب اردو اکادمی، منٹو اسٹریٹ، بیرون دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ 148023 (پنجاب)

موبائل: 09417423788

افسانے کا معیار صرف فرانس یا برطانیہ کے انگریزی ادب تک محدود ہے۔ روس ہے، چین ہے، جاپان اور امریکہ ہے۔ پوری دنیا کا ادب پڑھ کر ہی کوئی تنقید نگار یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ اردو افسانے کا معیار عالمی سطح کو چھو گیا یا نہیں۔ کس کی نظر عالمی شارٹ اسٹوری پر ہے؟ کون یہ فیصلہ کرسکتا ہے۔ کہنے کو تو ہمارے محترم نقاد حضرات کہہ دیتے خاص طور پر گزرے ہوئے ادیبوں کے افسانوں کے بارے میں کہ یہ افسانہ دنیا کے دس افسانوں کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ ہے کوئی اُن مہربانوں سے پوچھنے والا جو پوچھے کہ بھائی وہ دس افسانے کون کون سے اور کن زبانوں میں ہیں؟ کیا آپ اُن زبانوں کو سمجھتے ہیں؟ نقاد حضرات تو عصری اردو افسانوں کا مکمل مطالعہ بھی نہیں کرتے۔

میں تو سیدھا سادہ افسانہ نگار ہوں۔ بھائی عالمی کیا میں تو قومی سطح پر لکھے جانے والے افسانوں کے معیار کی سطح سے بھی واقف نہیں ہوں۔ اردو افسانے تو مانتے ہیں کہ فعال جرائد سے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی، تامل، اور تیلگو کی کہانیوں کا ہمیں کیا علم، کس معیار کی لکھی جا رہی ہیں؟ معاف کیجیے میں آپ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ کیوں کہ میں دنیا بھر کی کہانیاں نہیں پڑھتا، نہ ہی معیار قائم کرسکتا ہوں۔ جھوٹ بولنا خاص طور پر ادب کے معاملات میں، میں نے سیکھا ہی نہیں کہ کہہ دیں کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو کب کا پہنچ چکا۔ اور اپنے دوستوں کا نام لکھ دوں کہ فلاں فلاں کے نام عالمی سطح پر رکھے جاسکتے ہیں۔

پ ا: آپ کی زندگی کا مقصد ادب کے حوالے سے کیا ہے؟

بشیر مالیر کوٹلوی: میری ادبی زندگی کا اہم مقصد فروغ افسانہ رہا ہے، جس کے لیے میں پچھلے تیس سال سے کام کر رہا ہوں۔ دراصل میں تقریباً دس سال، اپنا ادھورا پن لیے چھوٹے چھوٹے پرچوں اور اخباروں میں چھپتا رہا اور تربیت افسانہ کی چاہت میں بھٹکتا رہا۔ تب کہیں جا کر قسمت نے مجھے سنجیدہ اور ادبی ماحول بخشا۔ اپنی منزل پانے کے لیے مجھے بڑی مشقت کرنا پڑی۔ پنجاب میں ایک ہی نام رہ گیا تھا جو فعال افسانہ نگار تھے، وہ تھے مرحوم شرون کمار ورما، ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ منٹو، بیدی کی اس سرزمین پر ہمارے بعد اردو افسانہ شاید تخلیق نہ ہو۔ ایک مشن لے کر میں نے جدوجہد شروع کی۔ 1985 میں انجمن القلم کی بنیاد ڈالی۔ مالیر کوٹلہ میں اردو افسانے کا ماحول بنا۔ شعراء حضرات بھی افسانے کی طرف راغب ہوگئے۔ القلم کے سالانہ جلسے میں قمر تونسوی، محترم جوگندر پال، رفیعہ منظورالامین، جتیش بترہ، ہیرانند سوز، اوم کرشن راحت کو مالیر کوٹلہ لے گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کا ادبی جائزہ لیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب میں پہلی بار افسانے کا اتنا بڑا فنکشن ہوا تھا۔ سال 2000 میں ہم نے نوجوانوں کو اپنے ساتھ جوڑ کر افسانہ کلب کی بنیاد ڈالی۔ آج ہمارا افسانہ کلب رجسٹرڈ این جی او ہے۔ اس کی ماہانہ افسانوی نشستوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل کے نوجوان افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئے، کلب کی تربیت پا کر کئی نوجوان افسانوی مجموعوں کا اجرا کروا چکے۔ میں نے اس طرح اپنا مقصد پورا کیا۔ کلب نے 2014 میں ایک کتاب کا 'کہانی گھر' کے نام سے اجراء کیا، جس میں کلب کے کارہائے نمایاں اور کلب کے ممبران کے افسانے اور افسانچے شامل ہیں۔ پنجاب جہاں اردو زبان آخری سانس لے رہی ہے، جس کے بک اسٹالوں پر اردو لپی نظر نہیں آتی وہاں ہم نے اردو افسانے کا یہ چراغ جلا رکھا ہے۔ دعا کیجیے یہ روشن رہے۔

پ ا: موجودہ دور افسانوں کا ہے۔ کیا اس بات سے آپ اتفاق رکھتے ہیں؟

بشیر مالیر کوٹلوی: جی نہیں- ادور ہمیشہ شاعری کا رہا ہے۔ افسانہ شاعری کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ شاعری ہر دور میں افسانے سے زیادہ مقبول رہی ہے۔ شاعری عوام کی پہلی پسند ہے۔ افسانے کی محفل میں مکمل خاموشی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سا سماعتی سلسلہ ٹوٹا نہیں کہ بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔ ایک طویل افسانہ فائنل کرنے میں بیس تا پچاس صفحات لکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شاعری دیکھ لیں، چھ سات اشعار کی غزل لکھنے میں کتنی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ فعال جرائد ہمارے سامنے ہیں۔ غزلیں اور افسانے اُسی تناسب سے شائع ہو رہے ہیں جیسے پہلے ہوا کرتے تھے۔ مجھے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کہ اس دور کو افسانوں کا دور کہہ دوں، بلکہ پچھلے دنوں آجکل دہلی میں قبلہ عابد سہیل محترمی رتن سنگھ اور بھائی نعیم کوثر کے بڑے اچھے افسانے شائع ہوئے۔ میں نے تینوں افسانوں کی تعریف میں آجکل کو ایک خط لکھ دیا۔ اگلے شمارے میں تقریباً 13 خطوط شائع ہوئے۔ صرف ایک میرا خط افسانوں کے حوالے سے چھپا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دور افسانوں کا ہے یا شاعری کا ہے۔

پ ا: کیا آپ نے اپنی مادری زبان پنجابی میں بھی کہانیاں لکھیں؟

بشیر مالیر کوٹلوی: میرا پنجابی کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے، جس کا نام 'پرلو گونج' ہے۔ پنجابی میری ماں ہے، اردو میری محبوبہ ہے، میری جان ہے۔

پ ا: آپ نے مالیر کوٹلہ کو بین الاقوامی سطح پر بلند مقام عطا کیا ہے۔ جیسے ساحر نے لدھیانہ کو کیا۔ آپ متفق ہیں؟

بشیر مالیر کوٹلوی: مالیر کوٹلہ میرا وطن عزیز ہے، جس کو میں خود سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بقول مجتبیٰ حسین کہ ''بشیر جہاں بھی جاتا ہے مالیر کوٹلہ کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولتا۔'' اگر میری شناخت بین الاقوامی سطح پر ہے تو میرا مالیر کوٹلہ تو میرے ساتھ ہی رہے گا۔

■

Parwez Ashrafi Dawat Nagar
D-321, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025
Mob.:09990129128

شاعری ہر دور میں افسانے سے زیادہ مقبول رہی ہے۔ شاعری عوام کی پہلی پسند ہے۔ افسانے کی محفل میں مکمل خاموشی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سا سماعتی سلسلہ ٹوٹا نہیں کہ بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔ ایک طویل افسانہ فائنل کرنے میں بیس تا پچاس صفحات لکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شاعری دیکھ لیں، چھ سات اشعار کی غزل لکھنے میں کتنی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ فعال جرائد ہمارے سامنے ہیں۔ غزلیں اور افسانے اسی تناسب سے شائع ہو رہے ہیں جیسے پہلے ہوا کرتے تھے۔

ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی، تامل، اور تیلگو کی کہانیوں کا ہمیں کیا علم کس معیار کی لکھی جا رہی ہیں؟ معاف کیجیے میں آپ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ کیوں کہ میں دنیا بھر کی کہانیاں نہیں پڑھتا، نہ ہی معیار قائم کرسکتا ہوں۔ جھوٹ بولنا خاص طور پر ادب کے معاملات میں، میں نے سیکھا ہی نہیں کہ کہہ دیں کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو کب کا پہنچ چکا۔ اور اپنے دوستوں کا نام لکھ دوں کہ فلاں فلاں کے نام عالمی سطح پر رکھے جاسکتے ہیں۔

صبیحہ انور

سفرنامہ

ایک جائزہ

دیکھ لے اس چمن دہر کو جی بھر کے نظیر
پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جسے مسافر سفر کے دوران یا منزل پر پہنچ کر اپنے تجربات اور مشاہدات کی مدد سے تحریر کا جامہ پہناتا ہے اور اپنی گذری ہوئی کیفیات سے دوسروں کو واقف کراتا ہے۔ راہ میں پیش آنے والے اپنے تحیّر، استعجاب اور اضطراب کو اس طرح سے قلم بند کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے نہ صرف پوری تصویر آ جائے بلکہ اس مقام سے متعلق تمام معلومات مع تفصیل اس کے علم اور آگہی میں اضافہ کرے۔

لائبریری سائنس کے اصول کے مطابق سفرنامے جغرافیہ کے ساتھ معلوماتی ادب کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ اپنے اوپر گزرنے والی کیفیات کا بیان کرتے وقت سفر نامہ لکھنے والا خود سفرنامے کے مناظر کا حصہ بن جاتا ہے سفر میں گزرنے والے حالات و تاثرات کا یہ اصلی اور جذباتی رکارڈ ہوتا ہے جس میں سفر کی نوعیت سے لے کر دوسری تفصیلات، موسم، جغرافیائی، تاریخی، سماجی احوال اپنی رائے کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ سفرنامہ راستے کی دشواریوں سے محفوظ رہنے کی تدابیر بھی فراہم کرتا ہے۔ ان دنوں میں جب آمد و رفت کے وسائل محدود تھے سفر آسان نہ تھا اور جب تک کوئی بہت ضروری کام نہ ہو کوئی سفر کا جوکھم نہیں اٹھاتا تھا۔ مسافر گھر والوں، اعزا و اقربا سے کہا سنا معاف کرا کر ہی گھر سے نکلتا تھا، اس وقت کا سفر معلومات کا سرچشمہ ہوتا، معلومات کی نوعیت کا تعلق بہت کچھ مسافر کی دلچسپی اور مقصد سفر پر ہوتا تھا۔

سفرنامہ لکھے جانے کا بہت کچھ انحصار مسافر یا سیاح کی مزاجی کیفیت، قوت مشاہدہ اور انداز تحریر پر ہوتا ہے۔

عازم سفر کے لیے یہ دلاسہ ہوتا ہے کہ باہر تو نکلو مسافر نواز بہتیرے ملیں گے۔ ہزاروں شجر سایہ دار راہ میں منتظر ہیں۔ کچھ سفر کسی ضروری کام یا کسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ محض لذتِ صحرا نوردی کے لیے جہانیاں جہاں گشت بن جاتے ہیں۔ شوق سفر انسانی زندگی کے خمیر میں اس طرح پیوست ہے جیسے فولاد میں جوہر، انسان نے اس انوکھی قدم قدم پر حیرت اور استعجاب اور ہر لمحہ رواں دواں زندگی میں کبھی ایک جگہ رکنا پسند ہی نہیں کیا، ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا کے مصداق، نئی دنیاؤں کی تلاش اس کی سرشت میں شامل ہے۔ حرکت زندگی کا ثبوت اور آگے بڑھتے رہنے کا شوق مہیا کرتی ہے۔ آج کی ترقی پذیر دنیا انسان کے اسی تجسس اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک جگہ نہیں بیٹھنا چاہتا ہے۔ فطرت کے ہر راز کو افشا کرنا ہر بھید کی تہہ تک پہنچنا خواہ بہشت میں گندم کھانے کا تجسس ہو یا پوٹاشیم سائنائیڈ کا مزہ ہو۔ صرف اس کی سچائی جاننے کے لیے کتنی جانوں کی قربانیاں دی گئیں۔ چاند تاروں پر کمندیں ڈالنے کا جنون اور سمندر کی تہہ کو کھنگالنے کا شوق اب بھی برقرار ہے اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سفر انسانی زندگی کو سنوارنے اور مرتب کرنے کی کوشش کا ایک سلسلہ ہے۔

البیرونی، مارکو پولو، فاہیان، ناصر خسرو، شیخ سعدی، ابن ہیکل بغدادی اور ابن بطوطہ جیسی ہستیوں کے تجربات اور مشاہدات نے انسانی فکر کی گہرائی اور علم و تجسس میں اضافہ کیا ہے۔ یونانی سیاح میگستھنیز (Megasthenes)، چندر گپت موریہ کے دربار میں تقریباً تین سو سال قبل مسیح ہندوستان آیا تھا۔ میگستھنیز کے سفر کے تجربے اور بیانیہ شاید دنیا کا پہلا سفرنامہ ہے۔ جس کے آج صرف حوالے ہی ملتے ہیں اور اسے دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یونانی بادشاہ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا... یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ اس سفرنامے نے ہی سکندر اعظم کی ہندوستان تک رہبری کی تھی۔ ہندوستان پر سکندر اعظم کا حملہ تین سو پچاس سال قبل مسیح ہوا تھا۔

اردو میں سفریات کی روایت عربی، فارسی سفر ناموں کی دین ہے۔ مغرب کے مقابلے میں مشرق میں سفرنامے کی روایت زیادہ پرانی ہے۔

ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح گزرا ہے۔ اس نے کم و بیش ربع صدی مشرق و مغرب کی سیاحت میں بسر کی اس نے دلچسپ اور معلوماتی سفرنامہ 'تحفۃ النظار' کے نام سے لکھا۔ اس کا خلاصہ اردو میں شائع ہوا۔

یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' سوا سال کی سیاحت کے 9 سال بعد 1947 میں طباعت سے آراستہ ہوا۔ جسے اردو کا اوّلین سفرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کی کوئی تحریر اردو میں دستیاب نہ تھی..." (اوراق لاہور، 1978)

یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ عجائبات فرنگ، جعفر تھانیسری کی تصنیف کالا پانی، محمد حسین آزاد کی 'سیر ایران' اور سر سید احمد خاں کی 'مسافران لندن' بہت اہم سفر نامے ہیں۔ جو کئی اعتبار سے اردو سفرنامے کی تاریخ میں بنیادی نام ہیں۔ سر سید احمد خاں نے 1869 میں لندن کا سفر کیا۔ سر سید کا یہ سفر صرف ایک ترقی یافتہ اور حاکم ملک کا سفر نہ تھا بلکہ یہ سفرنامہ کئی اعتبار سے ایک تاریخی سفر کی روداد ہے جو سر سید کے شوق، اضطراب اور بے چینی کا بھی بیان ہے... جو قوم کا درد اور ترقی اور انقلاب کی تڑپ دل

میں رکھنے والے سرسید کی بے چینی کی بھی تصویر ہے۔ یہ سفرنامہ نہیں ہے۔ سرسید کی علمی تحریک اور قوم کی شخصیت سازی کے سرسید کے تصور کو واضح شکل دینے میں ان سفر ناموں اور نئی دنیا کے منظر ناموں نے مہمیز کا کام دیا تھا۔ اور قوم کے شوق اور اشتیاق میں شدت پیدا کی تھی۔

اردو کے ابتدائی سفرناموں میں مولانا جعفر تھانیسری کا 'کالا پانی' 1862 میں سامنے آیا۔ مولانا کو انگریزوں نے کالا پانی کی سزا دی تھی۔ یہ سفرنامہ اسی کیفیت میں انڈمان کے سفر اور مشکلات کا بیان ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ نہ صرف حیرت انگیز ہیں بلکہ زندگی کی عجوبہ کاری اور نیرنگی زمانہ کا بیان ہیں۔ پھانسی کی سزا پانے والے کی نفسیاتی حالت کے ساتھ ساتھ انگریز سے نفرت اور ضرورت کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کی محنت کا ذکر ملتا ہے۔

اگر چہ یوسف خاں کمبل پوش، جعفر تھانیسری اور سرسید احمد خاں تینوں کے سفر مخصوص مقاصد کے لیے تھے مگر یہ بہ حیثیت مجموعی سیاح کی غیر جانبدار نظر سرسید اور جعفر تھانیسری کے سفرناموں میں نہ کھل سکی۔ ان پر قومی اور اصلاحی جذبہ اس قدر حاوی رہا کہ اپنے مشاہدے میں آزادانہ طور پر لطیف کیفیات میں قاری کو شامل نہ کرسکے۔ ایک طرح کا احساس کمتری اور شکستگی کی بے چینی ہے جو پورے سفرنامے پر طاری ہے۔ جب کہ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ایک آزاد فکر سیاح کا سفر نامہ ہے۔ وہ دنیا کو اپنی آنکھوں اور مشاہدے میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ جس وقت اردو کا قاری داستان کے فوق الفطرت ماحول اور کرداروں میں دلچسپی لے رہا تھا،

موجودہ عہد میں اظہار ذات کا حوصلہ ہی نہیں بڑھا بلکہ دنیا کو دیکھنے کا ذوق بھی بیدار ہوا ہے۔ اور بڑی تعداد میں سفرنامے لکھے جارہے ہیں۔ سفرنامہ نگاروں میں اپنی بات کو کہنے کا شوق بھی بڑھا ہے۔ ابن انشا کا 'چلتے ہو تو چین کو چلیے'، 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' 'دنیا مرے آگے' قابل ذکر ہیں۔ رام لعل نے 'زرد پتوں کی بہار' سفرنامہ لکھا اور رام لعل کا یہ سفرنامہ 1980 میں پاکستان کا سفر ہے جو جذباتی طور پر دلوں کو بے چین کردینے والا سفرنامہ ہے۔

یوسف خاں نے اہل ادب کی توجہ حقیقی مشاہدے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔

1892 میں مولانا شبلی نے پروفیسر آرنلڈ کے ہمراہ قسطنطنیہ کا سفر اختیار کیا اور ترکی، مصر، شام کا دورہ کیا۔ شبلی کا یہ سفر علمی سفر تھا۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'الفاروق' کے لیے مواد اکٹھا کیا۔ اور اپنے سفرنامے کا نام رکھا 'سفرنامہ مصر و روم و شام' جس میں انھوں نے وہاں کے سیاسی سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور وہاں کی تاریخی عمارتوں، کتب خانوں اور علمی اداروں پر تفصیل سے معلومات یکجا کی ہے۔

بیسویں صدی میں جب سفر کی سہولیات میسر آنے لگیں تو نہ صرف سفر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ حالات سفر بیان کرنے کا شوق بھی بڑھا چنانچہ منشی محبوب عالم کا سفرنامہ یورپ، شیخ عبدالقادر کا سفرنامہ 'مقام خلاوت' خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ مصر و فلسطین، قاضی عبدالغفار کا 'نقش فرنگ' قاضی ولی محمد کا 'سفرنامہ اندلس' اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سفرناموں میں دنیا کے عجائبات اور مختلف دلچسپ مشاہدات کا ہی بیان نہیں ہے بلکہ دنیا کے عجائبات کو دیکھنے کے شوق کو بھی بڑھاوا ملتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کا سفر حجاز اردو سفرناموں میں ایک اہم نام ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ 'ساحل و سمندر' 1954 اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کی سرگذشت سفر ''زہے روانی عمر کہ در سفر گذرد'' یوروپ کے علمی و ادبی سفر نامے ہیں۔

موجودہ عہد میں اظہار ذات کا حوصلہ ہی نہیں بڑھا بلکہ دنیا کو دیکھنے کا ذوق بھی بیدار ہوا ہے۔ اور بڑی تعداد میں سفرنامے لکھے جارہے ہیں۔ سفرنامہ نگاروں میں اپنی بات کو کہنے کا شوق بھی بڑھا ہے۔ ابن انشاء کا 'چلتے ہو تو چین کو چلیے'، 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' 'دنیا مرے آگے قابل ذکر ہیں۔ رام لعل نے 'زرد پتوں کی بہار' سفرنامہ لکھا اور رام لعل کا یہ سفرنامہ 1980 میں پاکستان کا سفر ہے جو جذباتی طور پر دلوں کو بے چین کردینے والا سفرنامہ ہے۔

آج وقت بڑی تیز رفتاری سے ہر آن نئے رخ اختیار کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے کہ دوسروں کے تجربوں سے واقفیت کی ضرورت بہت کم ہوگئی ہے۔ دنیا کو کتابوں، ٹی وی اور انٹرنیٹ کی مدد سے دیکھنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ جہاں تک تجسس کی سیرابی کا سوال ہے۔ انٹرنیٹ کی بدولت آج دنیا مٹھی میں سماگئی ہے کہنا غلط نہیں ہے، اور یہ صرف ایک محاورہ نہیں ہے کہ دنیا بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ آج اس دنیا کی ہر چیز آزمودہ اور دیکھی ہوئی

سفر فطرت انسانی کے اس جذبہ متحرک کا نام ہے جسے روانی، بے چینی اور تجسس کہتے ہیں۔ نئی نئی فضاؤں کو وہ اپنے مشاہدات، اپنی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ ایک اور کیفیت جو سفرنامے کے ہر منظر کو انوکھا، قابل دید اور قیمتی بناتی ہے چونکہ یہ سفر کا بیان ہے اس لیے ہر مقام، ہر منظر، ہر تعلق کے وقتی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وقت کے سرعت سے گزرنے کا احساس جس طرح وقت کو قیمتی بناتا ہے، اسی طرح سفرنامہ کو بھی اہم اور حسین۔ جب تک دنیا کو دیکھنے کا شوق اور بے چینی انسان میں موجود ہے اس وقت تک یہ سفرنامے لکھے جاتے رہیں گے۔

ہے۔ مگر اس کے بعد بھی آج نئے نئے انداز سے سفرنامے لکھے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہزاروں سال پرانی دنیا آج بھی اتنی ہی نئی اور اتنی ہی من موہنی ہے جتنی کہ روز اول تھی۔ سورج ہمیشہ ایک ہی طرح سے طلوع ہوتا ہے مگر ہر روز ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے اندھیرے کو روشنی میں بدلنے کا شعبدہ پہلی بار دکھایا ہے۔ ہر صبح ایک نئی صبح ہوتی ہے۔ دن کو روشنی کی تابنا کی اور ہے اور رات کے اندھیرے کا اسرار دوسرا ہے۔ یہ دنیا چھوٹی یا بڑی ہر پل رنگ بدلنے والی نیرنگ نظر دنیا کو دیکھنا آج بھی بہت مشکل ہے۔ نہ اس کو دیکھنے کی بے چینی کم ہوئی ہے اور نہ ہی آج تک کسی کیمرے، کسی کتاب، کسی قلم کو دنیا کی ساری جلوہ سامانیاں دیکھنے اور دکھانے کا افتخار حاصل ہوا ہے۔

سفر فطرت انسانی کے اس جذبہ متحرک کا نام ہے جسے روانی، بے چینی اور تجسس کہتے ہیں۔ نئی نئی فضاؤں کو وہ اپنے مشاہدات، اپنی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ ایک اور کیفیت جو سفرنامے کے ہر منظر کو انوکھا، قابل دید اور قیمتی بناتی ہے چونکہ یہ سفر کا بیان ہے اس لیے ہر مقام، ہر منظر، ہر تعلق کے وقتی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وقت کے سرعت سے گزرنے کا احساس جس طرح وقت کو قیمتی بناتا ہے، اسی طرح سفرنامہ کو بھی اہم اور حسین۔ جب تک دنیا کو دیکھنے کا شوق اور بے چینی انسان میں موجود ہے اس وقت تک یہ سفرنامے لکھے جاتے رہیں گے۔

■

Dr. Sabeeha Anwar Nami Press Building,
Nakhkhas, Lucknow - 3
Mob.:9839132270

ظفر پیامی کے ناول 'فرار' کے نمائندہ کردار

ہمانشو شیکھر

ظفر پیامی کا شمار ایک اہم اور معتبر ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ترقی پسند عناصر کے نقوش واضح طور پر ملتے ہیں۔ 'فرار' اور 'ستاروں کے قیدی' ان کے دو اہم ناول ہیں۔ 'فرار' ان کا نہایت مقبول ترین ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے سماجی حقیقت نگاری اور روز مرہ زندگی کے مسائل کو نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول اپنے کینوس اور فنی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔ تاہم اس مضمون میں محض 'فرار' کے ایک پہلو 'کردار نگاری' پر اظہار خیال مقصود ہے۔

کردار نگاری، کرداروں کے حرکت وعمل سے عبارت ہے۔ کرداروں کا عمل ہی واقعات کا موجب بنتا ہے اور واقعات کی منطقی ترتیب پلاٹ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ کرداروں کے بغیر کسی قصے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مغربی فکشن نقاد نے کردار کو ناول کا 'تین چوتھائی' کہا ہے۔ ناول کے واقعات اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد کی تشکیل کردار کی فطرت سے ہوتی ہے۔ اس طرح ناول میں آنے والے ہر کردار کی اپنی کرداری صفات ہوتی ہیں جو واقعات قصہ کا حصہ بنتے ہیں انھیں کے تناظر میں کرداروں کی ذاتی صفات واضح ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ناول انسانی فطرت کا عکاس ہوتا ہے اس لیے اس میں انسانی عادات و خصائل، خوبیوں اور خامیوں، پسند و ناپسند اور حرکت وعمل کا گہرا تجزیہ ہونا لازمی ہے۔ انسانی شخصیت کی وسعت، پیچیدگی، سنجیدگی اور اس کے اسرار کی بنا پر ہی ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ کرداروں کی جانبداری، آزادی اور حرکت وعمل ناول کی روح ہے۔ اس روح کو روشن اور پُر اثر بنانے کے لیے ناول نگار میں تخیل کی صلاحیت اور فنکاری بھی ہونی چاہیے۔ فطری اور عام زندگی سے قریب لگنے والے کرداروں کی تخلیق وہی ناول نگار کر سکتا ہے جو حد درجہ حساس، باریک بیں، ایماندار، نڈر، غیر مصلحت پسند اور رموز فکر وفن سے آشنا ہو۔ ان صفات کے ساتھ ناول نگار میں گہری انسانی ہمدردی اور لطافت کا جذبہ ہونا ضروری ہے۔ اگر ناول نگار میں یہ خصوصیات موجود نہیں تو اس کے کردار اجنبی معلوم ہوں گے اور قاری کو کرداروں کے دل کی دھڑکنوں میں اپنے دل کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ناول میں کردار کی تخلیق اس طرح کی جائے کہ وہ قاری کی شخصیت کا ایک حصہ بن جائے۔ ایسے کردار زندہ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

کرداروں کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ زندہ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے محسوس ہوں اور کتاب بند کر لینے کے بعد بھی ہماری یاد داشت میں محفوظ رہ سکیں۔ کردار نگاری کی شرط یہ ہے کہ قاری ناول کے کردار سے کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے۔ قاری کو اس کردار سے دلچسپی ہوتی ہے جو اسے آس پاس کے لوگوں کی طرح محسوس ہو۔ ناول کے کردار سے ہماری دلچسپی اور ہمدردی کی اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں ہم اپنی جانی پہچانی شخصیت کو دیکھ لیتے ہیں۔

ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو اتنا جاندار بنا کر پیش کرے کہ وہ پلاٹ کی زمین اور ناول کی فضا میں متحرک نظر آئیں اور قاری کے دل و دماغ پر ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اثر دیر تک قائم رہے، یہاں تک کہ کرداروں کے دکھ درد میں قاری خود کو دکھی محسوس کرنے لگے اور ان کی خوشی سے اسے اپنے اندر بھی مسرت کا احساس ہو۔ اور کردار کے تئیں قاری کے دل میں ہمدردی پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ناول نگار پلاٹ کی طرح کرداروں کا انتخاب بھی اپنی ذاتی واقفیت اور تجربوں کی بنیاد پر کرے جس میں وہ خود سانس لے چکا ہو جس کا اسے اچھی طرح علم ہو اور جس کے زیر اثر پرورش پانے والے افراد کی نفسیات اور مزاج کو وہ اچھی طرح سمجھتا ہو۔

ظفر پیامی کو کردار نگاری میں خاص مہارت رہی ہے۔ اس کا انعکاس ان کے ناول 'فرار' میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ فرار میں انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی صورت حال کو ہی نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ انھوں نے حقیقت نگاری اور کردار کے اصل روپ کی پیشکش کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔

افتخار حسین ہاشمی عرف تاری:

تاری اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ الہ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ یہ اُن وسیع القلب اور کشادہ ذہن مسلمانوں میں سے ہے جو تقسیم سے قبل مشترکہ ہندو مسلم روایت کی پیداوار ہے اور اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ وطن پرست اور ترقی پسند خیالات کے لیے مشہور تھے۔ 1947 کی تقسیم ہند سے پیدا شدہ المناک حالات نے ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ چونکہ یہ تقسیم مذہبی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر عمل میں لائی گئی تھی، اس لیے جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے

اور اپنا وطن چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے ان کے ساتھ تنگ نظری، غیر اخلاقی اور غیر انسانی سلوک کیا جانے لگا۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہوئی عداوتوں اور سازشوں کا شکار انھیں لوگوں کو ہونا پڑا۔ ان عداوتوں اور سازشوں کا شکار افتخار حسین ہاشمی عرف تاری بھی ہوئے۔ طبقاتی الٹ پھیر اور ہندو فرقہ پرستوں نے اس کی راہ میں ایسی مشکلیں کھڑی کر دیں کہ وہ غیر قانونی طور پر کراچی جانے پر مجبور ہو گیا۔ مختصر یہ کہ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان کے زیادہ تر مسلمان نئے ملک پاکستان جا رہے تھے۔ تاری بھی ان میں سے ایک تھے۔ تاری ہندوستان سے کراچی چلے گئے۔ کراچی جانے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق یوپی اور بہار سے تھا۔ ان کے ساتھ بھی وہاں اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ کچھ لوگوں کو مستقل سکونت مل گئی۔ اور کچھ لوگ مہاجر قرار دے دیے گئے۔ افتخار تاری کو بھی وہاں مہاجر سمجھا گیا۔ تاری صاحب کو ہندوستان سے فرار ہونے کے بعد بھی سکون میسر نہیں ہوا۔ ان کی حیثیت ہر جگہ مشکوک تھی۔ افتخار حسین تاری ایک بھٹکا ہوا راہی بن کر رہ گئے، جن کے لیے راستہ ہی راستہ تھا منزل کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ تاری کے بارے میں مصنف ایک جگہ لکھتا ہے:

''تاری صرف تاری تھا یعنی پیپل کے پیڑ سے ٹوٹا ہوا ایک پتا جو شاخ سے ٹوٹنے کے بعد ہوا کی ملکیت بن جاتا ہے، جہاں چاہے ہوا اسے راکھ میں تبدیل کر دے۔''

آفتاب چودھری:

آفتاب چودھری ایک مشہور صحافی ہے اور تاری کا خاص دوست ہے۔ وہ اپنے دوست کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آفتاب نے تاری کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک دوست کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے تاری کے ہر درد و غم میں ساتھ دیا۔ آفتاب چودھری نے تاری کو کراچی سے دلی بھگایا ہی نہیں بلکہ اپنے گھر پر حفاظت کے ساتھ تب تک رکھا جب تک وہ تاری کو پٹنہ کے راستے کٹھمنڈو پہنچانے میں کامیاب نہ ہو گیا۔ کراچی سے کٹھمنڈو تک تاری کے ساتھ ساتھ رہا اور راستے میں درپیش تمام مشکلات کا سامنا کرنے میں تاری کی مدد کی۔ تاری اپنی بیٹی سحر ہاشمی سے 20 سالوں سے نہیں مل پایا تھا۔ وہ بیٹی سے ملنے کے لیے ہمیشہ ترستا رہا۔ آفتاب نے سحر ہاشمی سے اس بارے میں بھی بات کی لیکن سحر باپ کے فرار اختیار کرنے سے ناخوش تھی، اسے ان سے ہمدردی تھی لیکن وہ رات کے اندھیرے میں چوروں کے مانند ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے جب تک تاری نے بھگوڑے کی زندگی گزاری، سحر ان سے نہیں ملی۔ آفتاب اور تاری اسکول کے دنوں میں اشتراکیت کے کارکن تھے۔ ہمیشہ انقلاب کی باتیں کرتے تھے لیکن باتوں کو کبھی عملی جامہ نہیں پہنا سکے تبھی سے ان دونوں میں دوستی تھی۔ تاری کے ہر برے وقت میں آفتاب نے اپنی جان کی بازی لگا کر تاری کو اس کی آخری منزل تک پہنچایا۔ آفتاب کا کردار بے حد دلکش اور زندگی سے بھرپور ہے، یہ مصنف کا اپنا کردار معلوم ہوتا ہے۔

سحر ہاشمی:

سحر ہاشمی ناول کا اہم نسوانی کردار ہے۔ یہ افتخار حسین ہاشمی عرف تاری کی بیٹی ہے جو اپنے نام کی خصوصیات کو اپنی شخصیت میں رکھتی ہے۔ سحر ہاشمی تاری کی بیٹی ہے جو نئی نسل کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ بھاگنے کے بجائے لڑنے میں یقین رکھتی ہے۔ تاری مرنا نہیں چاہتا اس لیے وہ فرار میں ہی زندگی محسوس کرتا ہے۔ سحر ہاشمی اپنے باپ کو بھگوڑا سمجھتی ہے۔ باپ بیٹی دونوں اپنی اپنی دلیلیں دیتے ہیں۔ لیکن سحر ہاشمی کی دلیلیں زیادہ واجب معلوم ہوتی ہیں۔ اور تاری کو بھی بعد میں احساس ہو جاتا ہے کہ بھگوڑا کے طور پر بار بار مرنے سے بہتر ہے ایک بار لڑ کر مرنا۔ پہلے وہ فیصلہ نہ کرنے سے قاصر تھا لیکن اب وہ فیصلہ بھی کر سکتا تھا اور اس نے طے کیا کہ وہ کراچی جائے گا اور وہیں رہے گا۔ تاری ان مہاجروں کی علامت ہے جو آج بھی اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ دیکھیے یہ اقتباس: ''پپا جس رات کے اندھیروں میں کھوئے رہتے ہیں اُسی رات کی صبح کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔ اس سرزمین پر بھی تو کوئی سورج، کوئی صبح کبھی تو لائے گا۔''

سحر ہاشمی جب کٹھمنڈو ناٹک کرنے جاتی ہے تو وہاں اس کی ملاقات کوکب مرزا سے ہوتی ہے جو تاری کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لندن جانے والے ہوتے ہیں۔ کوکب مرزا سحر کو بھی اپنے ساتھ لندن آنے کے لیے اکساتی ہے لیکن وہ تیار نہیں ہوتی۔ پھر یہ دلیل دیتی ہے کہ شعیب جو اس کا ہونے والا شوہر ہے وہ بھی لندن ہی میں رہتا ہے جو اس کے بچپن کا دوست ہے سحر پھر بھی انکار کر دیتی ہے اور شعیب کے ساتھ شادی سے بھی انکار کر دیتی ہے کیونکہ وہ اپنے وطن میں رہنا نہیں چاہتا۔ کوکب سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ دولہن دولہا کے دیش میں جاتی ہے۔ اس پر سحر ہاشمی کہتی ہے:

''جو لڑکی آپ کے سامنے بیٹھی ہے وہ کوئی سلیپنگ بیوٹی نہیں ہے سوئی ہوئی کسی پرنس چارمنگ کے انتظار میں۔''

''وہ چنڈی ہے۔''

''اور شاید..... شاید درگا بھی۔ وہ سب کچھ ہے جو ایک خوددار انسان کو ہونا چاہیے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت مگر میری درگا صرف ہیروئین ہے میرے ڈرامے کی۔ میں اسے پوجتی نہیں آپ کی طرح۔ میں درگا کو ڈرامے سے نکال بھی نہیں سکتی ہوں۔''

مصنف نے اس کردار کی پیش کش بے حد ہنرمندی سے کی ہے۔ یہ ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ہے۔

کیول کوہلی:

اپنی مٹی کی خوشبو سب سے بڑی خوشبو ہوتی ہے۔ ان احساسات و جذبات کو قوت بخشنے میں کیول کوہلی کے کردار کا اہم رول رہا ہے۔ مصنف نے اس کیفیت کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کیول کوہلی ماڈل ٹاون، لاہور کا رہنے والا ہے۔ تقسیم ہند کے حادثے کے بعد وہ الہ آباد آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے ایرفورس کی نوکری کر لی۔ ایک دن اسے والٹن پر حملہ کرنے کا آرڈر ملا۔ وہ ہوائی جہاز لے کر تقریباً ۱۰ منٹ تک والٹن اور ماڈل ٹاون کے اوپر چکر کاٹتا رہا والٹن اور ماڈل ٹاؤن ایک دوسرے سے جڑا ہوا شہر تھا لیکن اس نے ایک بھی بم کا استعمال نہیں کیا، حالانکہ کیول ہندوستانی فضائیہ کا نامور پائلٹ تھا اور نشانہ بھی بالکل صاف تھا اور وہ اس طرح کا کام پہلے کئی بار کر چکا تھا۔ لیکن اس نے خود کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ ایک دن کیول کو دشمنوں کی قید سے فرار ہونے کا موقع ملا لیکن وہ ہندوستان کی سرحد کی جانب بھاگنے کے بجائے جو زیادہ دور بھی نہیں تھا الٹا ماڈل ٹاون کی جانب بھاگا اور دشمنوں کی گولیوں کا شکار ہو گیا۔

اس کے علاوہ بھی فرار میں کنول زائن، کوکب مرزا، شہنشاہ بھائی، لینڈ رولڈ فیلڈ، مسز چغتائی جیسے معاون کردار ہیں۔ یہ ناول کو مربوط بنانے اور مصنف کے مقصد کو واضح کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مصنف چونکہ ایک مشہور جرنلسٹ رہے ہیں اور ان کی صحافت کا میدان بھی زیادہ تر برصغیر ہی رہا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں ممالک کے سیاست دانوں اور اعلیٰ افسروں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ اس لیے ان کے کردار اسی معاشرے کے زائیدہ ہیں۔ اور سبھی کردار بے حد فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

■

Dr. Himanshu Shekhar Mahatma Gandhi Antarrashtriya Hindi Vishwavidyalaya Gandhi Hills, Manas Mandir P.O, Wardha, Maharashtra 442005 (Maharashtra)

محقق و ادیب دانشور
مولانا عبدالسلام خاں

ابو زر عبدالاحد فرقانی

ہندوستان کا ایک چھوٹا سا شہر 'رام پور' مرزا غالب کے الفاظ میں 'رَوکش شیراز و اصفہان ہے' اور دیگر اہل نظر کی منظوم رائے میں۔

مرکز ادب کا، روح سخن رام پور ہے
یہ شمع وہ ہے جس کا زمانہ میں نور ہے

گویا رام پور بھی ارض العلما تھا شاعروں اور ادیبوں کا یہاں ایک جہاں آباد تھا۔ بقول ڈاکٹر نثار احمد فاروقی 'ریاست رام پور اپنی کم آبادی اور رقبے کے باوجود علم اور علماء کا بڑا قدر داں تھا۔ اسی لیے ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے علماء دین، صوفیاء کرام، اطبا، فلاسفہ اور پیشہ ور حضرات یہاں آکر اکٹھا ہو گئے۔ یہی نہیں دیگر فنون اور صنعتوں میں بھی کسی جگہ سے کم نہ تھا۔ محض شعر و سخن کی بات کریں تو شاعری کا تیسرا اسکول قرار دیا گیا۔ اس کے جغرافیے سے جو لوگ واقف ہیں انھیں باور کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ نالا پار جیسے حاشیے کے محلے سے نعمانی خاندان کی نسلوں میں شاعری ایسی رچی بسی کہ غالباً جلیل خاں نعمانی کی پشت میں بھی شاعر ہی شاعر ہوئے۔ محلّہ پھلواڑ سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے آبا و اجداد سے نسل در نسل مع خواتین خاندان، تمام علوم دینی و دنیوی سے بدرجہ اتم آراستہ و پیراستہ اور باقاعدہ اسناد و اعزاز یافتہ ہیں۔ مولانا عرشی عالم دین ہونے کے ساتھ 'ماہر غالبیات ہیں۔' تو ان کے برادر نسبتی اسحاق النبی خاں صاحب علوی علم ریاضی کے ماہر بالخصوص ہجری تقویم میں طاق اور قرآنیات میں عمیق مطالعے کے ساتھ معانی و مفہوم میں تفکر اور اجتہاد بھی کرتے تھے۔ یعنی سند یافتہ مولوی نہ ہوتے ہوئے بھی مولوی ہی تھے۔ آپ کے متعدد مقالے موقر جریدے 'برہان' اور 'نقوش' میں شائع ہوتے رہے۔ مولانا عرشی صاحب کے ایک اور عزیز محمد علی خاں عرف دولہا خاں الملقب 'خوش رقم' 'فن خطاطی' کے ماہر تھے جن کے مخطوطات کی نمائش متعدد جگہوں پہ ہوئی۔ مولانا عبدالسلام خاں صاحب مولانا عرشی کے نہ صرف اصطلاحی معنی میں ہم زلف تھے بلکہ لغوی معنی میں بھی بہر طور ہم زلف ہی تھے۔ مستند عالم دین ہونے کے علاوہ متعدد زبانوں پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی فارسی تو اس زمانے میں سب ہی جانتے تھے مولانا عبدالسلام خاں، فرانسیسی اور جرمنی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مزید برآں مولانا عرشی کے جواب میں 'ماہر اقبالیات' تھے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم کے فلسفہ سے متاثر پایا تو مولانا عبدالسلام صاحب نے مولانا محمد جلال الدین رومی پر بھی تحقیقی مقالہ بلکہ ایک ضخیم کتاب تحریر کرکے 'رومیات' پر بھی مہارت ثابت کردی۔

مولانا عبدالسلام خاں روہیلہ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلہ میں ایک معزز دینی علم و عمل والے حافظ عبدالغفار خاں کے چھوٹے بیٹے تھے جن کی تعلیم و تربیت بڑے بھائی مشہور عالم دین محدث و مفسر مولانا عبدالوہاب خاں کی نگہداشت میں ہوئی۔ مولانا عبدالوہاب خاں نے حفظ قرآن اور درس حدیث کے لیے رام پور میں ایک مدرسہ جامعۃ المعارف نام سے قائم کیا جو بحمد اللہ آج بھی ہے اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے اس کا الحاق ہے۔ یہاں ملک کے دور دراز علاقوں سے طالبان علم آکر فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالوہاب خاں رام پور کے سماجی اور سیاسی حلقے میں بھی ایک ممتاز حیثیت اور اہمیت رکھتے تھے۔

مولانا عبدالسلام خاں جید عالم دین ہونے کے علاوہ اعلیٰ معیار کے محقق اور مصنف تھے۔ آپ کی نگارشات ہند و پاک کے اعلیٰ ترین معیاری جرائد میں شائع ہوئیں۔ ہندوستان میں اعظم گڑھ سے شائع ہونے والا 'معارف' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں صرف تحقیقی مضامین ہی شائع ہوتے ہیں، مولانا کے تحقیقی مقالے اس میں بکثرت شائع ہوتے رہے۔ خود مولانا پر ایک تحقیقی مقالہ مولانا کے عربی مضامین کے مجموعے کی کتاب بعنوان الفلسفۃ الہندیۃ القدیمۃ کے جائزے پر رام پور کی ہی ایک خاتون اسکالر ڈاکٹر تبسم صابر کی نگارش بھی اسی موقر جریدہ 'معارف' کے مئی 2013 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندومت کے فلسفے پر چاروں ویدوں کے اصل ماخذ کا سنسکرت میں عمیق مطالعے کا ماحصل مولانا نے بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ بدھ اور جین مذہب کے فلسفے کا بھی اجمالی جائزہ اصل کتب سے لیا گیا ہے۔ اس سے مولانا کی تحقیقی ژرف نگاہی کے ساتھ سنسکرت سے واقفیت بھی آشکار ہوتی ہے۔ نثار احمد فاروقی کی فرمائش پر اس کتاب میں بھگوت گیتا اور چند مزید مقالات بھی شامل کیے گئے۔ نثار احمد فاروقی نے رضا لائبریری کے ذمے داران کے لیے اس کتاب کی اشاعت باعث افتخار گردانی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا نے مولانا ابوالکلام آزاد کے حکم پر مذکورہ مقالے 'ثقافت الہند' نام کے عربی مجلّے میں بھی شائع کرائے جس سے عربی دنیا عالم عرب میں ہندوستان کے مذاہب اور فلسفے سے متعارف ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم صابر نے بڑی دیدہ ریزی اور جانفشانی کی ہے ان کا یہ مقالہ ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ دراصل مولانا جو بھی ضبط تحریر میں لاتے بڑی محنت کرکے تمام تر حوالہ جات، تاریخی کتب اور مبصرین کی آراء و تنقید کے ساتھ ہوتا تھا۔

مولانا مرحوم کی بہو یعنی ناصر خاں صاحب ایڈوکیٹ کی بیگم محترمہ ساجدہ شیروانی نے بھی ایک مضمون میں مولانا کی مکمل سوانح پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں خاندان کے شجرہ کے ساتھ دیگر کوائف کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی معلومات اس لیے بھی وسیع و مستند ہیں کہ وہ خود اس خاندان کی ایک رکن ہیں۔ محترمہ ساجدہ شیروانی نے مولانا مرحوم کی رام پور کے شہرۂ آفاق مدرسہ عالیہ سے وابستگی اور اس کے معیار کو پختگی کے ساتھ بلندیوں تک پہونچانے کی ان تھک کوششوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ مادر علمی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں تدریسی فرائض ادا کرنے کا موقع ملے۔ مولانا نہ صرف مدرس بلکہ صدر مدرس رہے اور اسی عہدۂ جلیلہ سے سبک دوش ہوئے۔ حالانکہ بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار 'یہ عہدہ مولانا کے لیے کوئی بڑا اعزاز نہ تھا، مدرسہ عالیہ کے لیے البتہ یہ ایک اعزاز کی بات تھی۔'

مولانا ایک بے مثل سوانح نگار تھے۔

رام پور کے ایک مشہور شاعر واجد علی اشک پر ایک مضمون تحریر کیا جو ان کی مکمل سوانح تھی۔ اس مضمون میں اپنی شاگردی (جرمنی و فرانسیسی زبانوں میں) کے ساتھ اشک صاحب سے باہمی رفاقت و ہم نشینی کے تذکرے کے بعد اشک صاحب کی علمی قابلیت، اعلیٰ ظرفی، دلداری و مہمان نوازی اور بے مثل کردار کے تمام گوشوں پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ اشک صاحب رام پور کے نواب خاندان کے ایک فرد تھے لیکن انھوں نے اس نسبت کو کبھی باعث افتخار یا قابل ذکر نہیں سمجھا بلکہ اپنی ذاتی زندگی آزادانہ طور پر گزارنے کے لیے نواب خاندان سے قابل لحاظ دوری رکھی۔ ہندوستان سے باہر حصول تعلیم کے لیے برطانیہ اور جرمنی میں بھی رہے اور وہاں بھی اپنے کردار کی عظمت اور علمی قابلیت کی چھاپ چھوڑی۔ جرمنی میں قیام کے دوران ریاست رام پور سے وظیفہ بند ہوا تو مضمون نگاری کو ذریعہ معاش بنالیا۔ تنگ دست رہے لیکن غیرت وحمیت اور خودداری پر آنچ نہ آنے دی۔ اشک صاحب کی والدہ نے مولانا محمد علی جوہر سے بمنت تمام برلن سے ان کے ہمراہ بلوالیا۔ مولانا محمد علی جوہر سے انتہائی مخلصانہ و برادرانہ تعلق تھا۔ 'قصہ از قصہ بر خیزد' کے مصداق مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے ساتھ ان کے فضائل بھی بیان کرنے میں مولانا عبدالسلام خاں نے تامل نہیں کیا۔ اس سے مولانا محمد علی جوہر کے بین الاقوامی تعلقات اور فکری معیار کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر ترکی کے مصطفیٰ کمال اتاترک سے ایک خیر سگالی ملاقات کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے نظریاتی اختلاف کی بنا پر پہلوتہی کی۔ مولانا کو بڑا شاق گزرا۔ انھوں نے عصمت انونو سے جو اتاترک کے دست راست تھے کہا کہ اتاترک سے کہہ دینا کہ اس نے ایک ایسے شخص سے ملاقات پسند نہیں کی جس نے ترکی کے لیے ہر ایک ترک سے زیادہ کام کیا ہے۔ ''میرے تربیت یافتہ جوانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مصطفیٰ کمال کی برابری کر سکتے ہیں''۔

بہر حال بات تو واجد علی اشک عرف اچھن صاحب کی ہو رہی تھی 'بجا' اور 'حضور' کہنا اچھن صاحب کے مزاج کے برخلاف تھا۔ مغرب کی آزادانہ فضا نے ان کو درباری آداب اور کورنش بجا لانے سے پرے رکھا تھا۔ اس مضمون کے چند جملے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے: ''اچھن صاحب کی یہ مختصر زندگی کتنی گونا گوں، کتنی دلچسپ، کتنی پر عبرت اور کتنے متضاد عناصر کو سمیٹے ہوئے تھی ان میں تلون بھی تھا اور استقلال بھی۔ ان کا ذوق بھی بدلتا رہتا تھا اور رفقا بھی۔ لیکن جس سے جس انداز کا تعلق تھا اس میں کسی بھی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمہ وقت انجمن تھے۔ ان کا حلقہ تعارف نہیں بلکہ دائرہ احباب

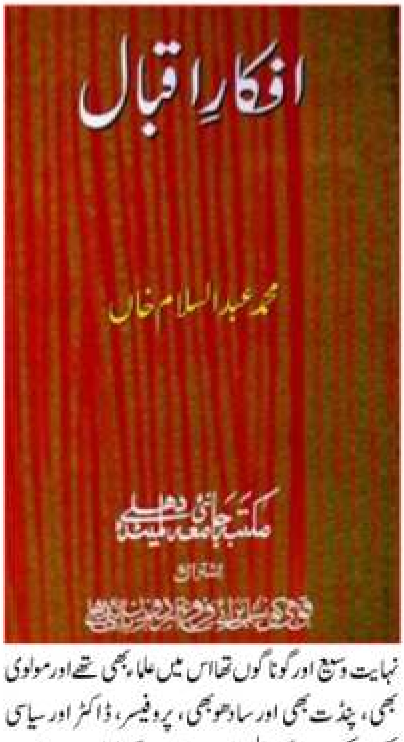

نہایت وسیع اور گونا گوں تھا اس میں علما بھی تھے اور مولوی بھی، پنڈت بھی اور سادھو بھی، پروفیسر، ڈاکٹر اور سیاسی بھی۔ حکومت کے اعلیٰ حکام اور عوام کے لیڈر بازاری اور خواص میں سب ان کے عزیز دوست تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں جو شخصیتیں ابھر کر آئیں ان میں سے اکثر سے ان کے تعلقات تھے اور بہت مخلصانہ۔'' ایک جگہ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''نوکروں چاکروں کے جھمگھٹے میں جس طرح خوش رہتے تھے بغیر پیش خدمت دوستوں کو اپنے ہاتھ سے چلمیں بھر کر پیش کرنے میں بھی انھیں وہی انبساط ہوتا تھا۔'' غرض کہ اچھن صاحب کی عظمت و کردار کا ہر پہلو اتنی وضاحت، محبت اور خلوص سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بھی واجد علی اشک سے عشق وعقیدت ہو جائے۔ آخر میں ان کی چند غزلیں اور منتخب اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

مولانا عبدالسلام خاں نے 'افکار اقبال' میں علامہ اقبال کی شخصیت کے، سوانح نگاری کی حیثیت سے وہ پہلو بھی بیان کیے ہیں جو عام قاری کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ اس لیے کہ علامہ کی امیج 'حکیم الامت' اور 'شاعر اسلام' کے طور پر اجاگر ہو کر ذہنوں پر ایسی چھائی ہے جس میں کسی کمی یا کجی کی گنجائش بھی محال ہے۔ سوانح نگار کی دیانت داری یہی ہے کہ سیرت و کردار کے ہر سیاہ و سفید پہلو پر روشنی ڈالے۔ یہی مولانا عبدالسلام خاں کی شخصیت نگاری کا وصف ہے یہ سب لکھتے لکھتے ایک جملہ ایسا فی البدیہہ لکھا کہ طبیعت کو بڑی فرحت بخشتا ہے'' یہ اقبال کی خوش بختی اور ملک کی خوش نصیبی تھی کہ اقبال پی ایل اے میں فیل ہوئے اور مقابلہ کے لیے نااہل ثابت ہوئے۔ ورنہ اقبال سب کچھ ہوجاتے لیکن اقبال نہ ہوتے'' بس اسی جملے میں اقبال کی اقبالیت 'حکیم الامت' کی دانائی و حکمت، علامہ کی علامیت یا 'شاعر اسلام' کی مذہبی جذباتیت مضمر ہے۔ اور یہیں سے علامہ کے لیے عقیدت کے ابواب وا ہوتے ہیں۔ اقبال کا پورا فلسفہ، تخیلاتی سفر کا تسلسل، شاعری اور شعریت کی موشگافیاں ہوتی ہیں۔ اقبال کی مابعد الطبعیاتی فکر کی تشریح ہوتی ہے۔ سماجی و سیاسی فکر اور ملت کے غم کا سوز دروں عیاں ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی میں دین کی اہمیت، خودی کا فلسفیانہ تصور، جمہوریت و آمریت کی خلیج اور اشتراکیت کا رجحان، برصغیر ہندوستان کے سادھو سنتوں، ولی اولیاء اور مشرق و مغرب بلکہ دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں کی تحریروں کا عمیق مطالعہ اور اس کے نتیجے میں اقبال کا فکری تغیر اور سفر وغیرہ سب کچھ بقدر فہم سامنے آتا ہے۔

مولانا نے بہت سے ذیلی عنوان بنا کر اقبال کی شاعری اور آفاقی فکر، گہرائی و گیرائی اور سوز دروں کا ایسا مطالعاتی تجزیہ کیا ہے کہ ہمارے خیال سے کسی بھی اسکالر کو اس موضوع پر 'افکار اقبال' کے علاوہ کوئی دوسرا ماخذ تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ اقبال دانی، اقبال بینی اور اسکالر کی اپنی اقبال مندی کے لیے بس یہی کافی ہے۔

اردو دنیائے ادب میں مولانا روم کے باقاعدہ تعارف کا سہرا علامہ اقبال کو جاتا ہے۔ اس کا اعتراف اردو ادب کی ایک عظیم اور قد آور شخصیت جناب مالک رام نے 'افکار رومی' کے تعارف میں کیا ہے۔ عربی و فارسی میں مولانا روم کی تمام منظوم و منثور تصانیف میں اہم ترین 'مثنوی معنوی' ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت جتانے کے لیے کسی نے منظوم تعریف یوں کی ہے:

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

علامہ شبلی کی تصنیف 'سوانح مولانا روم' اور قاری منظر حسین کی 'صاحب المثنوی' کے مندرجات اور حوالوں کے ساتھ مولانا عبدالسلام خاں کے اس کارنامہ کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ بتایا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں'' مولانا عبدالسلام خاں نے مثنوی کا مطالعہ ایک نئے زاویہ سے کیا ہے وہ جن نتائج پر پہنچے ہیں ان میں سے بعض بہت اہم ہیں اور ان سے مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔''

''اقبال نے اپنے کلام میں مولوی روم کو برملا اپنا رہبر اور گرو تسلیم کیا ہے۔ اور جاوید نامہ کو سراسر انہی کی معیت کا نتیجہ قرار دیا'' رومی کی معنویت میں اقبال کی بدولت بہت وسعت پیدا ہوگئی۔ مالک رام صاحب کے بقول مولانا عبدالسلام خاں نے ثابت کیا ہے کہ مولوی روم پوری کائنات کی عام زندگی کے قائل ہیں۔

مولوی عبدالسلام خاں نے مولانا ابوالحسن علی یعنی علی میاں کی تصنیف 'تاریخ دعوت وعزیمت' میں مذکور فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش اور علامہ شبلی نعمانی کی سوانح مولانا روم کے علاوہ بدیع الزماں فروزاں تہران یونیورسٹی کے پروفیسر کے 'رسالہ در تحقیق احوال وزندگانی مولانا جلال الدین محمد'، 'نفحات الانس'، 'مقالہ قونیہ'، 'مناقب العارفین' اور 'رسالہ سپہ سالار' وغیرہ دیگر ماخذ سے صرف استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ سارے حوالہ جات بھی تحریر کیے ہیں۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب نے مولانا روم کے متنوع حالات اور تغیر پذیر خیالات، ان سے عوام وخواص کی بددلی ومنافرت کے بعد پھر انس وعقیدت کا بڑا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ مولانا روم کا شمس تبریز سے والہانہ عشق، ہجر وفراق کا سوز اس انداز سے بیان کیا ہے جس سے ہمارے جیسا قاری ایک عجیب سے تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شریعت وطریقت کا اختلاف اور امتزاج، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی باریکیاں، فنافی الذات، فنافی الشیخ اور فنافی اللہ ہو جانے کے تصوف کے مدارج سے ابہام بھی پیدا ہوتا ہے اور آخرش خانقاہی وصوفیانہ فلسفے کے مقلدین، پیرومرشد کو رہنما اور نجات دہندہ سمجھنے والے رہروان شوق کی خوش عقیدگی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مولانا روم کے جنازے میں باجے تاشے، ناچ گانا اور خلق خدا کا اژدہام ایسا کہ جنازے کا تابوت چھ بار ٹوٹا اور بدلا گیا۔ وصیت کے مطابق جنازے کی نماز شیخ صدر الدین کو پڑھانا تھی لیکن وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے اور قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی۔ اپنے والد محمد بہاء الدین سلطان العلماء کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔ چالیس دن مسلسل لوگوں کی آمد ورفت، قبر کی زیارت، فاتحہ خوانی کے ساتھ مرثیہ خوانی کا تذکرہ عجیب اور ناقابل فہم سماں پیدا کرتا ہے۔ بہرحال یہ سب حقیقی واقعات اہل طریقت اور سالکین پر وجد کی کیفیت طاری کرتے ہوں گے ہمیں نہیں معلوم کہ خود مولانا عبدالسلام خاں کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی یا مرحوم کی خوش عقیدگی میں کچھ اضافہ ہوا ہوگا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جس کتاب کو قرآن کا درجہ دیا گیا اور صاحب کتاب کی تعظیم وتکریم پرستش کی

مولانا کی تمام تالیف و تصانیف کی اہل علم و نظر نے بڑی قدر کی متعدد اکادمیوں سے انعامات بھی ملے جن میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی اسکالر کے طور پر ملا ہوا تا حیات پچاس ہزار روپے سالانہ کا انعام بھی شامل ہے۔ اور عربی فارسی اردو اور فلسفہ کے اسکالر کے طور پر نواب فیض اللہ خاں ایوارڈ رام پور رضا لائبریری نے بھی دیا۔ مولانا نے کچھ عرصے تک اپنے رفیق دیرینہ اور ہم زلف مولانا امتیاز عرشی صاحب کے ساتھ رضالائبریری میں مخطوطات پر بھی بڑاکام کیا۔ اس طرح مولانا عرشی کی دوستی اور قرابت داری میں مولانا عبدالسلام خاں علم و ادب کے عرش نشیں نظر آتے ہیں۔

حد تک پہنچ گئی، اس نگارش کے تمام محرکات، عوامل و عواقب، زمانی پس منظر عوام کا ذہنی معیار اور خود مصنف کا فکری تغیر وتنوع سب کچھ سامنے لائے بغیر مثنوی کی محض تعریف وتوصیف بیان کرنا ہرگز مناسب نہ تھا۔

علامہ شبلی نے مثنوی کو تصوف کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عقائد اور علم الکلام کی کتاب کی حیثیت سے دیکھا مگر ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے مولانا کی ان تحریروں کو تصوف کے موضوع پر حرف آخر بتایا ہے اور حیرت کا اظہار بھی کیا کہ صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی مولانا عبدالسلام خاں نے صوفی ازم پر ایسا شاہکار پیش کیا۔

حقیقتاً مولانا روم کی مثنوی کا اصل موضوع تصوف اور سلوک ہے۔ اس کے مضامین اپنی کثرت اور تنوع کے باوجود اسی محور پر گھومتے ہیں۔ انتشار اور بے ترتیبی کے ہوتے ہوئے بھی ابتدائے طلب سے استغراق وصحو تک سب احوال ومقامات، منازل ومراحل موجود ہیں اور ہر ایک کی مناسبت سے رشد وہدایات۔

'افکار رومی' میں تصوف کی اصطلاحات کا استعمال خوب کیا گیا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کے اشعار اور بہ زبان عربی تمام شذرات وفرمودات اصلاً نقل کیے گئے ہیں تاہم زبان وبیان ادق نہیں ہے۔

جناب مالک رام کے علاوہ اردو ادب کے بلند پایہ محققین اور صائب الرائے دانش وروں کے مولانا کی نگارشات پر تبصرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

نثار احمد فاروقی مولانا عبدالسلام خاں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں 'جیسے انھوں نے اسلامی علوم عقلیہ (تفسیر، حدیث، تاریخ) کے قدیم سرمایہ کو گہری نظر سے پڑھا، اسی طرح آپ نے ہندوستانی فلسفہ، یونانی فلسفہ اور مغربی فلسفہ میں بھی گہری دست رس حاصل کی۔'' آپ کی نوک قلم سے اردو کے علاوہ عربی، انگریزی زبانوں میں اہم ترین مقالات منظر عام پر آئے۔ آپ نے جلال الدین رومی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شاعر مشرق علامہ اقبال کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے حالات زندگی اور افکار پر مستقل کتابیں لکھیں۔'

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ڈائرکٹر شپ کے زمانے میں لائبریری کے اشاعتی شعبے سے مولانا کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ جن میں پروفیسر فدا علی خاں کی 'قواعد اردو' کی تدوین اہم ترین ہے۔ خدا بخش کے سالانہ خطبات کے طور پر مولانا روم پر ان کے مقالوں کا پہلا ایڈیشن 'افکار رومی' کے ہی نام سے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ کے توسط سے منظر عام پر آیا۔ مصحفی کا انتخاب دیوان اور مدرسہ سسٹم پر چار جلدوں کی اشاعت بھی مولانا کے کلیدی مقدمات کے ساتھ شائع کیں۔ غالباً بیدار صاحب کو ہم وطن بزرگ عالم کے ساتھ رضا لائبریری رام پور میں بھی کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ ان کی علمی صلاحیتوں کے ساتھ ذاتی وخاندانی اخلاقی صفات سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے بے پناہ انس وعقیدت ہے جو بیدار صاحب کی تحریروں سے مترشح ہے۔ مولانا کے برادر بزرگ جامعۃ المعارف کے بانی مولانا عبدالوہاب خاں کے تذکرہ کے ساتھ مولانا کے فرزند اکبر ناصر الدین خاں ایڈوکیٹ کی سعادت مندی اور نیک طینتی کا تذکرہ بھی بڑی محبت سے کیا ہے۔

مولانا کی تمام تالیف وتصانیف کی اہل علم ونظر نے بڑی قدر کی متعدد اکادمیوں سے انعامات بھی ملے جن میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی اسکالر کے طور پر ملا ہوا تا حیات پچاس ہزار روپے سالانہ کا انعام بھی شامل ہے۔ اور عربی فارسی اردو اور فلسفہ کے اسکالر کے طور پر نواب فیض اللہ خاں ایوارڈ رام پور رضا لائبریری نے بھی دیا۔ مولانا نے کچھ عرصے تک اپنے رفیق دیرینہ اور ہم زلف مولانا امتیاز عرشی صاحب کے ساتھ رضالائبریری میں مخطوطات پر بھی بڑاکام کیا۔ اس طرح مولانا عرشی کی دوستی اور قرابت داری میں مولانا عبدالسلام خاں علم و ادب کے عرش نشیں نظر آتے ہیں۔

■

Abu Zar Abdul Ahad Furqani , Opposit Kohe Noor Pustak Sadan, Shah Abad Gate, Rampur - 244901 (UP)

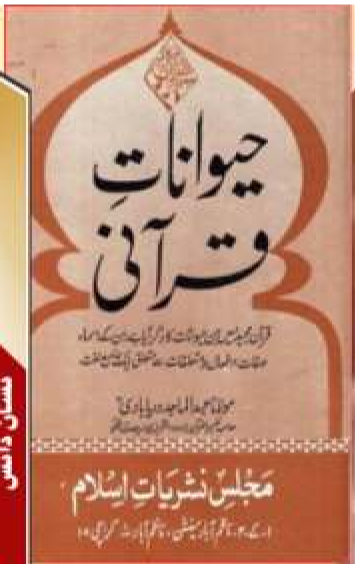

نوشاد عالم

عبد الماجد دریابادی
ایک مختلف الجہات شخصیت

(ولادت بارہ بنکی 16 مارچ 1892 ،وفات: لکھنؤ 6 جنوری 1977)

اردو زبان و ادب کے افق پر تابندہ ستاروں کی کہکشاں میں عبد الماجد دریابادی کا نام آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ان کا نام ذہن کے پردوں سے ٹکراتے ہی ایک قوس وقزح والی جامع کمالات شخصیت کی تجسیم عمل میں آتی ہے۔ ان کی شخصیت اپنے جلو میں ادب کے مختلف زاویوں کو اس سلیقے سے پروتی ہے کہ اس کی کوئی ایک جہت متعین کرنا آسان نہیں۔ان سے یادگار مختلف ومتنوع ادبی سرمایے کی مدد سے ان کی ایک ہشت پہلو شخصیت متشکل ہوتی ہے۔وہ بیک وقت ادیب، دانشور، شاعر، مفسر قرآن، صاحب طرز انشاپرداز، ناقد، محقق، فلسفی، صحافی، ڈرامہ نگار، سوانح نگار، مترجم اور مبصر ہیں۔ انھوں نے جتنے موضوعات اور علوم وفنون پر کام کیا ہے ان میں ہر ایک موضوع بجائے خود اتنا وقیع و وسیع ہے کہ ایک عمر چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے۔ یہ ماجد کی علمی عظمت اور باکمال شخصیت کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی عمر میں اتنے سارے علوم میں حیرت انگیز خدمات انجام دیں۔ ہر موضوع پر ’کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است‘ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ماجد کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کا اعتراف صرف ادبی حلقوں اور شخصیتوں تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ عربی زبان وادب کے راشٹرپتی ایوارڈ سے سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مارچ 1976 میں انھیں ڈی لٹ کی اعزازی سند سے بھی نوازا۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کے مورث اعلی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے زمانے میں ملک روم سے ہندوستان تشریف لائے۔ اور انھی کے حکم سے قصبہ اودھ (اجودھیا) ضلع فیض آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ ماجد کی ولادت ضلع بارہ بنکی کے ایک خوشحال دینی گھرانے میں 16 مارچ، 1892 کو ہوئی۔ انھوں نے عربی و فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد سیتاپور سے 1908 میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی داخل ہوئے لیکن والد کے سانحہ ارتحال کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور گھر لوٹ آئے۔ کتب بینی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ بچپن کا یہ شوق امتداد زمانہ کے ساتھ مزید پروان چڑھتا گیا۔ اسی شوق مطالعہ اور لکھنؤ میں آزادی نے انھیں عقلیت پسندی اور لاادریت کی راہ پر ڈال دیا۔ ماجد کی زندگی میں عقلیت پسندی اور لاادریت کا زمانہ بہت ہنگامہ خیز رہا۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انھوں نے کٹر ملحد ڈاکٹر ڈریسڈیل (George R. Drysdale) کی تصنیف The Elements of Social Science کے علاوہ متعدد جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب The International library of Famous literature کا مطالعہ کیا تو تشکیک وارتیاب کی طغیانی بھری موجیں انھیں الحاد کے دہانے تک لے گئیں۔ رہی سہی کسر ڈاکٹر ماڈسلے کی کتابوں ’مرضیات دماغی اور عضویات دماغی‘ نے نکال دیں۔ لیکن ان کی زندگی کا دوسرا دور جس نے ان کی کایا کلپ کردی وہ دینی حمیت سے سرشار ہے۔ ان کی زندگی کا یہ دور دین وایمان کی بنیادوں میں یقین واعتماد کا مظہر ہے۔ ایک طرف شبلی کی سیرت النبی (حصہ اول)، مولانا روم کی ’مثنوی معنوی‘ اور ’مکتوبات مجدد الف ثانی‘ کے مطالعہ نے دین کی بنیادوں پر ان کے اعتماد کو بحال کیا وہیں دوسری جانب خود ان کے والد بزرگوار کی خانہ کعبہ میں ان کی ہدایت کے لیے مانگی گئی دعاؤں نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ پھر ماجد ایسے راسخ العقیدہ مسلمان ہوکر ابھرے کہ انھیں قرآن کی تفسیر وتشریح کا شرف حاصل ہوا اور دینی علوم میں وہ استعداد بہم پہنچائی کہ ان کے نام کے ساتھ مولانا کا سابقہ بھی منسلک ہوگیا۔

مولانا عبد الماجد دریابادی ان عبقری ہستیوں میں ہیں جنھوں نے پوری زندگی خلوص اور نیک نیتی سے لوح وقلم کی پرورش کی ہے۔ انھوں نے کام اس لیے نہیں کیا کہ شہرت ملے بلکہ کام کیا ہے اس لیے شہرت ملی ہے۔ یہ صورت حال تب ہی پیدا ہوسکتی ہے جب زندگی میں جذبۂ ایثار کو راہ دی جائے اور علم کو اس کی افادیت کے تناظر میں دیکھنے کی خو پیدا کی جائے۔ ملک کے مختلف اخبارات ورسائل مثلاً معارف، الناظر، اردو، ہندوستان ریویو، ماڈرن ریویو وغیرہ میں آپ کے مضامین کی کثرت اس بات کا اعلامیہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے معروف اہل قلم اور دانشوروں میں ہیں۔ انھوں نے انگریزی مضامین بھی لکھے جو ہندوستان کے اہم رسائل واخبارات مثلاً ایسٹ اینڈ ویسٹ، بامبے کرونیکل اور موڈرن ریویو میں شائع ہوئے بلکہ موڈرن ریویو میں تو ایک مدت تک وہ اردو کتب پر انگریزی میں تبصرے کرتے رہے۔ان کے مضامین نہ صرف معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں بلکہ اعتدال پسندی، اور پختگی اور علمیت جیسی خصوصیات ان کی تحریروں کا لازمہ ہیں۔ مختلف کتابوں کے مطالعے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں فکری پختگی، استدلالی قوت، مناسب پیرایۂ بیان کے خصائص پیدا ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی تحریروں میں بھی زندگی کی وہ شان نظر آتی ہے جو متواتر مشق ومزاولت کی رہین منت ہوتی ہے۔ وہ ادب میں شرافت اور پاکیزگی کے قائل ہیں۔ ان کی شخصیت میں مشرقی اقدار وروایات کا ایسا پُرقوت داعیہ موجود ہے کہ ہر وہ تحریر جو مغربی تہذیب کی اساس پر حملہ آور ہو انھیں پسند ہوتی ہے۔ کتب بینی کے علاوہ جس خوبی نے ان کی تحریروں میں عالمانہ وادیبانہ شان پیدا کی وہ تصنیف وتالیف کے میدان سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ 1917 میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ سے منسلک ہوئے لیکن کچھ دنوں بعد یہ تعلق ترک کردیا پھر بھی

گورنمنٹ کالج نظام کے وظیفہ خوار رہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے کچھ نہ کچھ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنا رشتہ تصنیف و تالیف سے استوار رکھا اور مسلسل انہماک کے ساتھ لوح و قلم کی خدمت کرتے رہے۔

عبدالماجد ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات مختلف علوم وفنون کی جامع تھی۔ علم الکلام، فلسفہ ونفسیات، حیاتیات، تاریخ واخلاقیات اور قرآن وحدیث کی انھیں وسیع معلومات تھی۔ ان کی تنقیدی کاوشوں پر ان کے بین علوی ہونے کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین ومقالات کی تعداد کم وبیش 47 پہنچتی ہے جو ان کی مختلف کتابوں مثلاً مضامین عبدالماجد دریابادی (1943) مقالات ماجد، نشریات ماجد (1954) انشائے ماجد اور اقبالیات ماجد میں شامل ہیں۔ ان کی تنقید انھیں روایتی ناقد کے طور پر پیش کرتی ہے جسے فن پارے کی سادگی، سلاست، شگفتگی اور جدت ادا میں دلچسپی ہوتی ہے اور جو تنقید میں تحلیلی اور تجزیاتی طرز بیان کو چھوڑ کر سادگی، بے تکلفی، برجستگی، سلاست، صداقت اخلاق آموزی اور عبرت انگیزی کے اجزا کا متلاشی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے درست لکھا ہے کہ:

''وہ روایتی، اخلاقی اور الہامی طرز احساس کے نقاد ہیں۔ ان کے یہاں آفاقی شاعری کا تصور اسلامی واخلاقی تصور سے الگ کوئی چیز نہیں، البتہ وہ پہلے ادب کو ادب دیکھنا چاہتے ہیں۔ (ص 157 عبدالماجد دریابادی احوال وآثار)

تنقید کے ضمن میں ان کے وہ مقدمات، پیش لفظ اور تقاریظ بھی شامل ہیں جن میں صاف گوئی اور بے باکی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور کی تنقید کے نمونے 'الناظر' میں یکم مارچ 1910 سے لے کر یکم جنوری 1911 تک شماروں میں ملتے ہیں جن میں انھوں نے شبلی کی کتاب 'الکلام' پر تنقید لکھی ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے مطالعہ سے ایک ایسا نقاد ذہن کے پردوں پر عکس ریز ہوتا ہے جس کے یہاں جمالیات، تاثریت، کلاسکیت اور تشریحیت وتفسیریت نے مجموعی طور پر ان کے طرز نقد کو جلا بخشی ہے۔ ابتدا میں تنقیدی مضامین اور کبھی کبھی مقدمے بھی خاصے طویل ہوتے تھے لیکن بعد میں ان کے مضامین مختصر ہونے لگے۔ ان کے طویل مضامین میں اکبر پر ان کے مضامین ومقالات یا مرزا ہادی رسوا کے قصے 'کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے'، اردو کا واعظ شاعر، اردو کا ایک بدنام شاعر یا گنہ گار شہزادی شامل ہیں۔

انھوں نے تبصرہ نگاری بھی کی ہے۔ ماڈرن ریویو میں ان کے تبصرے 1919 سے 1928 کے درمیان شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے علمی اور مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ ادبی کتابوں پر بھی تبصرے لکھے مثلاً سدرشن کے افسانوی مجموعوں 'صبح وطن' اور 'آنریری مجسٹریٹ' اور ایک ترجمہ 'تہذیب کے تازیانے' پر تبصرے کیے۔ انھوں نے مختصر اور طویل دونوں طرح کے تبصرے لکھے۔ عمومی طور پر وہ مختصر تبصروں کے حامی ہیں۔ تبصروں میں زبان وبیان کے تسامحات پر ان کی باریک نظر ہوتی ہے۔ ان کے سب سے طویل تبصرے جوش کی 'یادوں کی بارات' اور مرزا بلگرامی کے ناول پر ہیں۔ وہ پہلے سے کوئی مفروضہ قائم کرکے تبصرہ کرنے کو غلط روش خیال کرتے تھے اسی لیے حیات اللہ انصاری جیسے غالی ترقی پسند افسانہ نگار کے افسانوی مجموعہ 'شکستہ کنگورے' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''مذہب پر کوئی چوٹ اس مجموعہ میں نہیں ملتی'۔ ان کی تبصرہ نگاری کو دیکھتے ہوئے مشہور ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ 'مولانا کے یہاں ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت ہے جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے'۔ ماجد طبعاً روایت کے آدمی تھے اور چونکہ ان کی زندگی کے آخری سال چالیس سال تو اسلامیات کے لیے وقف ہوگئے تھے اس لیے وہ ادب اور تنقید کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔ بایں ہمہ انھوں نے اردو تنقید کو جو کچھ بھی دیا، وہ مقدار میں کم ہونے کے باوجود معیار کے اعتبار سے لائق اعتنا ہے۔

انھوں نے فلسفہ، سائنس، تہذیب وتمدن، عمرانیات اور قرآنیات وحدیثیات جیسے اہم موضوعات پر مختلف کتابوں کے ترجمے کیے۔ انھوں نے مختلف نوعیت کے تراجم کیے ہیں کہیں انھوں نے اصل متن کا جملہ بہ جملہ ترجمہ تو کہیں ملخص ترجمہ، کہیں ترجمہ تالیف کی شکل میں ڈھل گیا اور کہیں ترجمے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح وتفسیر سے بھی کام لیا ہے۔ خالص تراجم کی فہرست میں 'مکالمات برکلے' (1919) پیام امن (1923) ناموران سائنس (1924) اور انگریزی ترجمہ 'قرآن' ہیں۔ وہ ترجمے میں اصل متن کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ وہ ترجمہ میں انگریزی الفاظ ومحاورات اور روزمرہ کے مقابل موزوں ترین اردو الفاظ، محاورات اور روزمرہ لاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کہیں ترجمہ پن محسوس نہیں ہوتا۔ 1917 میں دار الترجمہ سے انسلاک کے بعد انھوں نے ایک مستقل تالیف کے علاوہ 'تاریخ یورپ' نامی ایک درسی کتاب کے کچھ اجزا کا ترجمہ بھی کیا۔ وہ ایک مترجم کی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ فن ترجمہ کی نزاکتوں کے گہرے رمز شناس بھی ہیں۔ ترجمہ کے دوران زبان وبیان کی خوبیوں کے ساتھ روزمرہ ومحاورہ کی چاشنی کو بھی ملحوظ رکھنا ان کی ترجمہ فہمی کو آئینہ کرتا ہے۔

انھوں نے سوانح اور سیرت نگاری میں بھی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں مثلاً 'مردوں کی مسیحائی (1943)' جو بعد میں سلطان ما محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے شائع ہوئی۔ سیرت نبوی پر ان کی ایک اور کتاب 'سیرت نبوی قرآنی (1963) ہے جو ان کے محاضرات کا مجموعہ ہے۔ سیرت نبوی پر ان دو کتابوں کے علاوہ ماجد نے دو شخصی سوانح بھی لکھیں۔ ایک مولانا اشرف علی تھانوی کی سیرت وسوانح 'حکیم الامت: نقوش وتاثرات' (1952) کے عنوان سے اور دوسری محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق' مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر۔ ماجد کی ذہنی، جذباتی،، مذہبی، فکری، علمی اور ادبی صلاحیتوں کو صیقل کرنے میں جن ہستیوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا ان میں شبلی،، اکبر، محمد علی جوہر، اشرف علی تھانوی وغیرہ شامل ہیں۔ حکیم الامت اور مولانا محمد علی جوہر کی سوانح لکھ کر انھوں نے ان دونوں سے اپنے ربط نہاں کو واضح کیا ہے۔

ایک اچھا سوانح نگار اپنے ممدوح کا زندگی نامہ مرتب کرتے ہوئے گود سے گور تک کے سفر کو اس خوبی سے آئینہ کرتا ہے کہ اس کی شخصیت کے تمام تر نہیں تو کم از کم بیش تر پہلو قاری کی نگاہ میں آجاتے ہیں۔ مذکور دونوں سوانح کے مطالعے سے ماجد کے دونوں ممدوحوں کی ذات اپنی تمام تر خصوصیتوں کے ساتھ قاری کی نگاہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

ماجد نے خاکے بھی تحریر کیے اور یہ خاکے زندہ اور مردہ دونوں ہی لوگوں سے متعلق ہیں۔ 'وفیات ماجدی' شخصیتوں کا دوسرا مجموعہ 'معاصرین' ہے۔ یہ دونوں ہی مجموعے ان کی وفات کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ انھوں نے خود نوشت سوانح بھی لکھی جو 'آپ بیتی' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے متنوع علمی، ادبی اور دینی کارناموں کا سراغ ان کی 'آپ بیتی' سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی ایک حیثیت محقق ومرتب کی بھی ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں کی فہرست میں مولانا روم کے مجموعہ ملفوظات 'فیہ مافیہ' اور مصحفی کی مثنوی 'بحر المحبت' قابل ذکر ہیں جب کہ ترتیب کے ضمن میں تحفۂ خسروی، خطوط مشاہیر اور مکتوبات سلیمانی (دو جلدیں) جیسی کتب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ خطوط مشاہیر میں تین اہم شخصیتوں یعنی شبلی، اکبر اور محمد علی کے خطوط ہیں۔ یہ تینوں ہی ماجد سے بڑے تھے لیکن ان سے ماجد کے تعلقات بہت گہرے، علمی، فکری اور جذباتی و ذہنی روابط تھے۔ ماجد نے 'زود پشیماں' اور 'بدسرشت'

(نامکمل) نام کے ڈرامے بھی لکھے۔ زود پشیماں کو ڈاکٹر محمد حسن نے اسٹیج کرنے کی اجازت بھی چاہی تھی لیکن انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ ڈرامے اسٹیج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن ان میں زبان و بیان کی چاشنی ضرور ملتی ہے جو ان کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرانے کے لیے کافی ہے۔

وہ اردو کے ان محسنوں میں سے ہیں جن کے دم قدم سے اردو میں فلسفیانہ مباحث کو کافی فروغ ہوا۔ ان کو وراثت میں فلسفے کی کوئی مستحکم روایت نہیں ملی تھی لیکن اپنی افتادِ طبع اور فلسفیانہ مسائل میں گہری دلچسپی کے باعث اس میدان میں بھی انھوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ فلسفہ سے ان کی دلچسپی کی وجہ سے 'فلسفی شاہ' کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی فلسفیانہ تحریروں کا زمانہ 1912 سے 1919 تک پھیلا نظر آتا ہے۔ ماجد کی فلسفیانہ تحریروں سے پہلے اردو میں بابو برج بہادر کا رسالہ 'فلسفہ' 1901 اور مفتی محمد انوار الحق کی تالیف کردہ کتاب 'اثبات واجب الوجود' (1911) موجود تھی۔ بایں ہمہ اردو کا دامن عمومی طور پر فلسفیانہ مباحث سے خالی تھا جس کی کمی کا احساس خود ماجد کو بھی تھا۔ ان کی فلسفیانہ تحریروں کا پہلا مجموعہ 'فلسفیانہ مضامین' ہے جسے (1926) میں 'الناظر' نے ان کی رضا مندی کے بغیر شائع کیا۔ اس لیے بعد میں یہ مضامین کامل نظر ثانی کے بعد 'مبادی فلسفہ' کے نام سے شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنی محنت و قابلیت اور پیہم کوشش سے اردو میں فلسفہ کے موضوع پر مواد کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی اور نہ صرف فلسفہ پر مستقل کتابیں تصنیف کیں بلکہ مفید اور کارآمد کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ ان کے فلسفیانہ مضامین 'الناظر'، افادہ (حیدرآباد)، معارف، زمانہ میں شائع ہوتے رہے۔ یہی مضامین بعد میں 'فلسفیانہ مضامین' (1926) فلسفہ تعلیم، مبادی فلسفہ (34-1931) اور فلسفہ 'جذبات' (1914) فلسفہ 'اجتماع' (1915) اور انگریزی تصنیف Psychologlyof Leadership کے عنوان سے شائع ہوئے۔

ماجد کے یہاں فلسفے سے زیادہ نفسیاتی مطالعے کا عنصر ملتا ہے جو پہلے فلسفے کی شاخ ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے تشکیک سے نجات پانے کے بعد پاپولر سائیکولوجی پر ایک اہم کتاب 'ہم آپ' (1946) بھی لکھی۔ نفسیات پر ان کی تحریر کے ضمن میں ان کی دو ایسی مختصر کتابوں کا تذکرہ ضروری ہے جو براہ راست اس سے متعلق نہیں لیکن بہت اہم ہیں پہلی کتاب غذائے انسانی اور دوسری کتاب 'فرائض والدین' ہے۔ ہر ماہر نفسیات کی طرح ماجد کا موقف یہ تھا کہ تعلیم کا آغاز آسان سے مشکل کی طرف ہو، سادہ سے مرکب کی طرف اور مقرون سے مجرد کی طرف ہو۔ اس ضمن میں انھوں نے ہربرٹ اسپنسر جیسے مشاہیر سے بھی استناد کیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں انسانی نفسیات کو ضرور ملحوظ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایک خاص نوع کی کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کے مضامین کے عنوانات یا سرخیاں دیکھیں، ابتدائی پیراگراف یا اختتامی پیراگراف ملاحظہ کریں ہر جگہ وہ قاری کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکر اور موضوع سے قطع نظر اسلوب کی سطح پر وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ماجد کی اہمیت و وقعت مسلم ہے۔ ان کی صحافیانہ زندگی کا سفر کافی طویل ہے جس میں کافی نشیب و فراز ہیں۔ انھوں نے باقاعدہ صحافت کا آغاز سچ (اجرا جنوری 1925) سے کیا اور اپنی وفات سے چند ماہ قبل تک وہ اس سے منسلک رہے۔ جوں جوں ان کے قلم میں قوت اور روانی آتی گئی، ان تحریروں کی اشاعت کا دائرہ بھی پھیلتا گیا چنانچہ ان کے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں مثلاً ضیا، الاسلام، العصر، صبح امید، حقیقت، معارف، ہمدم، اور ہمدرد وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔ 1919 کے آس پاس انھوں نے پہلے 'معارف' میں مستقل شذرہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان شذرات کے موضوعات ادبی اور علمی بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور سماجی بھی۔ ان کی صحافت میں بلکہ ہر تحریر میں جو چیز ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کا منفرد اسلوب ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اسلوب ذات اور شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے یہ بات عبدالماجد دریابادی کے سلسلے میں صد فی صد درست معلوم ہوتی ہے۔ اپنے اسلوب کو پُر اثر بنانے کے لیے وہ تحریر کے آغاز کو موثر اور دلکش بناتے ہیں اور سرخی کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں جسے اخبارات میں سرخی جمانا کہتے ہیں۔ صحافت میں سرخی جمانے کی اہمیت روشن ہے۔ قاری کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لینے اور اپنے موقف کو مختصر ترین لیکن ساتھ ہی ساتھ موثر ترین لفظوں میں قاری تک پہنچانے میں بنیادی رول اسی 'سرخی' کا ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اختتامیہ کو بھی ویسی ہی اہمیت حاصل ہے۔

اردو میں صاحب طرز ادبا کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے اکابرین میں شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد ہیں تو بیسویں صدی میں ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، حسن نظامی، مہدی افادی، جوش ملیح آبادی، راشد الخیری، ملا واحدی اور محمد حسن عسکری جو اپنی تخلیقی زرخیزی، بے مثل مشاہدے، عمیق تجربے اور وسیع مطالعے کی وجہ سے اپنی تحریروں میں شادابی کی وہ سدا بہار فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جس کے مطالعے سے بلا قید زمان و مکان ہر قاری محظوظ ہوتا ہے۔ ماجد کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے لسانی رموز اور لفظ کی مخفی توانائی کو دریافت کرتے ہوئے زبان کو اس نہج پر برتا ہے کہ قاری تخلیق کی فکری دنیا کی سیر کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافتوں سے بھی آشنا ہوجاتا ہے۔ ماجد کی تصنیفات کی زبان عالمانہ ہے غالباً فلسفے کی اہمیت اور اس کی دقت پسندی کے پیش نظر وہ عربی و فارسی کے مشکل الفاظ کو روا رکھتے ہیں لیکن زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کی وجہ سے عبارت میں ربط و تسلسل اور شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ یہی چیز انھیں ایک ہمہ جہت ادیب کے طور پر پیش کرتی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ شگفتہ اسلوب نگارش، فکری پختگی، مستحکم طریقۂ استدلال، غیر ادعائی رویہ اور اعتدال پسندی کی وجہ سے اردو ادب میں انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی فلسفیانہ تحریروں، متوازن تفسیر نگاری، ناقدانہ بصیرت، موزوں تبصرہ نگاری، بے نظیر مرقع کشی، بے باک صحافت اور بے مثل ترجمہ نگاری سے اردو زبان و ادب کے دامن کو حیرت انگیز طور پر وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ مختلف علوم و فنون میں ان کی بے پایاں خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کرۂ ارض پر ایسی ہستیاں کم ہوئی ہیں جنھوں نے ایک ہی عمر میں متنوع علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی مشن کو اس پیمانے پر فروغ دینے کا کام کیا ہو۔ عبدالماجد دریابادی ان فضلا میں ہیں جنھوں نے اس بڑے جوکھم کو نہ صرف اٹھایا بلکہ اپنی بساط بھر کامیابی کے ساتھ دور تک لے گئے۔ اس لیے جب بھی برصغیر کی تہذیبی و سماجی اور ادبی تاریخ ترتیب دی جائے گی ان کا نام بھی نمایاں طور پر لکھے جانے کا سزاوار ہوگا۔

حواشی:

1. 'تاریخ ادب اردو مع تعلیقات، مصنف رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، حواشی و تعلیقات تبسم کاشمیری ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2009، ص 39-438
2. مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر، دہلی 1964
3. 'مولانا عبدالماجد دریابادی کی تبصرہ نگاری' مشمولہ 'ادب امکان' ابرار احمد اجراوی، مہتاب پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی دسمبر 2014
4. مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، طبع اول 1993

■

Dr. Naushad Alam, APDUMT,
Noam Chomasky Complex, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

یادیں باتیں

خورشید اکرم

راج نرائن راز

آجکل اور میں

راز صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک دفتر میں ہوئی جہاں وہ میرے افسر تھے اور میں ان کا ماتحت اور یہ ملاقات اسی تکلف سے شروع ہوئی جو دفتری تعلق کا خاصہ ہے۔ یہ آجکل کا دفتر تھا جس کی کرسی پر وہ براجمان تھے۔ وہ آجکل جس کے ساتھ اس کی شاندار تاریخ تھی، جو اردو ادب کا نہایت مقبول و مشہور اور معیاری رسالہ سمجھا جاتا تھا اور اس رسالے کے مدیر و شاعر جناب راج نرائن راز کے بالمقابل میں یقیناً ایک معمولی نوجوان جس نے یوں سمجھیے کہ زندگی کی سیڑھی پر پہلا ہی قدم رکھا تھا، جس کے لیے یہ شہر دہلی بھی اجنبی تھا، سرکاری دفتر بھی اور آجکل جیسے رسالے میں بطور سب ایڈیٹر تقرری بھی۔ میرے پاس ایسا کچھ نہ تھا، جو میں فخر کے ساتھ انھیں دکھا پاتا۔ بس ایک معمولی پن تھا اور وہ میرے سراپا سے ہی نظر آرہا تھا۔ ایک دبلا پتلا نوجوان، سانولی رنگت، کم قامت۔ خیریت یہ گزری کہ راز صاحب جو پنجابی نسل کے تھے، ان کا قد مجھ سے ایک آدھ انچ ہی اوپر تھا اور رنگت بھی مجھ سے ایک دو شیڈ ہی بہتر تھی۔ یوں لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اور میں دونوں سانولے تھے، میں قدرے زیادہ، وہ قدرے کم اور قد دونوں کا اوسط سے کچھ دبتا ہوا۔ ان کے سامنے ٹکنے کے لیے، اپنے دفاع کے لیے، میرے معمولی پنے نے ان کی ظاہراً معمولی شخصیت کو سامنے رکھ کر تھوڑا سا اعتماد پیدا کیا۔ مگر علم؟ میرا علم تو بس زیرو بٹا زیرو اور وہ.....

'.....تو بتائیے خورشید صاحب آپ نے کیا کیا پڑھا ہے۔' میرے لیے یہ ایک دھند میں ڈوبا ہوا سوال تھا۔ وہ اگر مجھ سے پوچھتے کہ کیا کیا نہیں پڑھا ہے تو میں شاید بہتر جواب دیتا۔ میں ان لائبریریوں میں وقتاً فوقتاً جاتا رہا ہوں جہاں چاروں طرف ہزاروں ہزار کتابیں رکھی ہیں اور جن کے کیٹلاگ دیکھتے ہوئے مجھے درجنوں بلکہ سیکڑوں کتابیں ایسی لبھاؤنی لگی ہیں جنھیں مجھے پڑھنا چاہیے مگر جنھیں میں پڑھ نہیں پایا۔ میں جس ماحول اور معاشرے سے آیا تھا وہاں ان کتابوں کو پڑھنا زیادہ ضروری تھا جن کا علم اچھی سی ملازمت دلوا سکے۔ یوں میں ایسی بے شمار کتابیں، ادب کی، مذہب کی، سماج کی، اخبارات اور غیر ادبی، نیم ادبی اور ادبی رسائل پڑھ چکا تھا اور پڑھتا رہا تھا جن کا علم عملاً میرے لیے بے فیض تھا۔ مجھے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، جو کبھی کبھی میرے دوستوں کے لیے جھنجھلا دینے والا ہوتا۔ سرکاری ملازمت ملنے سے پہلے میں کلکتہ میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ وہاں شمیم صاحب منیجر تھے۔ ان دنوں ٹیلی گراف اخبار نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ہمیں اور ان کو جب بھی فرصت ملتی ہم اخبار اٹھا لیتے۔ کبھی میں 'شب خون' یا 'شاعر' یا 'آجکل' یا 'پاسبان' وغیرہ کا کوئی شمارہ بھی دفتر ساتھ لے آتا۔ دیر شام تک وہ اور ہم باتیں کرتے تھے۔ سیاست اور سماج کے علاوہ ادب پر بھی۔ وہ ادب کا بھی نتھرا ہوا ذوق اور شعور رکھتے تھے۔ مجرد تھے اور اتنا معلوم تھا کہ رانچی کے رہنے والے ہیں (یہ بات مجھے کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ وہ پرکاش فکری کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پرکاش فکری مذہباً مسلمان تھے)۔ تو بات یہ ہوئی کہ جب یہ معلوم ہوا کہ میری تقرری آجکل میں بطور سب ایڈیٹر ہونے والی ہے تو شمیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا'' آپ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے نا، لیجیے اب زندگی بھر شوق سے پڑھتے رہیے۔'' مگر تب تک میں نے کتنا کم پڑھا تھا۔ اتنا کم کہ راز صاحب کے اس سوال کا میرے پاس کوئی اعتماد بھرا جواب نہیں ہوسکتا تھا کہ میں نے کیا کیا پڑھا ہے۔ ادب ہی کی پوچھ لیں تو بھی ڈھنگ سے کچھ نہیں بتا سکتا۔ کلیات اقبال؟ آدھا ادھورا۔ دیوان غالب؟ آدھا ادھورا بھی نہیں۔ منٹو، بیدی، کرشن، عصمت، قاسمی، فیض، اختر الایمان، سردار جعفری، پڑھا تو سب کو کم یا زیادہ تھا۔ لیکن بیدی کے سوا کسی اور کے بارے میں میری کوئی رائے تھی؟ کہہ نہیں سکتا۔ سب اچھے لگتے تھے، سب بڑے لگتے تھے، لیکن کیوں، کس کا کیا اختصاص ہے، کون کس سے کس طرح اور کس قدر مختلف ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ میں ادب کا باضابطہ طالب علم نہیں تھا۔ میں آجکل کا سب ایڈیٹر مقرر ہوا تھا اور میرے پاس تو ایم اے کی ڈگری بھی نہیں تھی۔ ایم فل، پی ایچ ڈی تو دور کی بات۔ یہ اور بات کہ اردو ادب کی دنیا میں کچھ وقت سنجیدگی سے گزار لینے اور اس کے پانیوں میں گلے گلے تک خود کو ڈبو دینے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ جو ایم اے

اور ایم فل اور پی ایچ ڈی والے ہیں، ان کا علم اور ذوق وشعور بھی ویسا ہی الا ماشاء اللہ ہوتا ہے جیسا میرا تھا۔ سو جناب! اب یہ یاد نہیں کہ میں نے جواب میں کیا کیا بتایا۔ جو بتایا تھا وہ ان کے نزدیک اطمینان بخش رہا ہوگا؟ شاید نہیں۔ اگلا سوال شاعروں کے بارے میں۔ میں نے کئی نام لیے۔ فیض، فراق، جوش، جعفری، بشیر بدر، مخمور سعیدی، اعزاز افضل، پرویز شاہدی، بانی، شجاع خاور۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے شاعر تھے جنھیں میں جانتا تھا، جنھیں پڑھا تھا مگر جن کے نام اس وقت سوجھ ہی نہیں رہے تھے۔ ذہن اندر اور آنکھ باہر اپنے سہارے تلاش کر رہی تھی۔ ایک رسالے پر نظر پڑی۔ جگن ناتھ آزاد کی تصویر سرورق پر..... اور جگن ناتھ آزاد بھی میرے پسندیدہ شاعر ہیں، میں نے کہا۔ مگر یہاں تو پانسہ الٹا پڑ گیا۔ وہ خوش کیا ہوتے الٹے مجھے پھٹکارا کہ آپ کو پسند کرنے کے لیے کوئی اور شاعر نہیں ملا۔ یہ بھی کوئی شاعر ہے؟ ارے بابا! یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں یو پی ایس سی میں انٹرویو دے کر آیا ہوں۔ پانچ آدمیوں کے انٹرویو بورڈ کے سامنے بھی اتنا نروس نہیں محسوس کر رہا تھا جتنا ان کے سامنے۔ اور پھر بھئی یہ کیا کہ آپ میرا انٹرویو لیں۔ کیوں؟ لیکن یہ وقت ان سے سوال کا نہیں تھا۔ اس وقت کی جو حقیقت میرے سامنے تھی وہ میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں اور اعتراضات سے زیادہ بڑی اور بھاری تھی۔ 'اچھا نقادوں کے نام بتائیے۔' ذہن سے دھند چھٹ رہی تھی۔ اس سوال پر تو جیسے بھک سے بتی جل اٹھی۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ ادھر میرا جواب اور ادھر سے گولی کی طرح پلٹ کے آیا ریمارک۔ 'اوہو ہو! ڈاکٹر صاحب! آپ تو بڑے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں'۔ اس بار تو میں واقعی بالکل نروس ہو گیا۔ جس جواب پر میں دس میں دس نمبر حاصل کرنے کی توقع کر رہا تھا، اس میں مجھے بالکل ہی صفر مل گیا تھا۔ اس بات پر ان سے الجھنے کی نہ میری ہمت تھی اور نہ وہ علمی استعداد۔ اب سے پہلے میری کسی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی تھی جو کم از کم ان دونوں کے بارے میں کوئی حرف سوال لا سکتا تھا۔ میرے لیے یہ دونوں بت کی طرح تھے۔ مجھے افسوس ہوا۔ وہی افسوس جو کسی عقیدت مند کو اپنے دیوتا کا بت ٹوٹتے، ڈھیتے دیکھ کر ہوتا ہے۔ پہلے جگن ناتھ آزاد اور اب فاروقی اور نارنگ۔ بڑے لوگ نہیں ہوتے ہیں؟ ضرور ہوتے ہیں، لیکن جن کو ہم بہت بڑا ماننے لگتے ہیں، پورا جانے بغیر، دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت بڑا سمجھنے لگتے ہیں، وہ بت بن جاتے

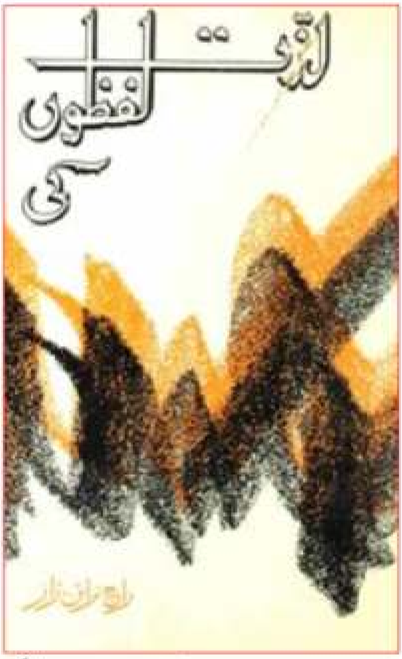

ہیں، دیوتا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن و دل کی کیفیت جو تھی اسے میں نے بعد میں اس طرح سمجھا کہ لوگ کیوں اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کی باتوں یا اعمال پر ذرا سی بھی تنقید برداشت نہیں کر پاتے۔ عقیدت کے ماروں کا علم ناقص ہوتا ہے اور جذبات ناتراشیدہ۔ وہ جلدی ناراض ہو جاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ ان کا بنا بنایا بت ٹوٹ نہ جائے اس لیے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں، اس سے بھی زیادہ جتنے کہ وہ دراصل ہوئے۔ میں اگر راز صاحب کا ماتحت نہ مقرر ہوا ہوتا اور سرکاری ملازمت پیاری نہ ہوتی تو میرا جذبۂ ناتراش جانے اس وقت مجھ سے کیا کہلوا دیتا۔

یہ آجکل کے دفتر میں میرا پہلا دن تھا اور راز صاحب سے پہلی ملاقات۔ 'آجکل' جیسے ملک گیر سطح کے بڑے رسالے کا سب ایڈیٹر ہونے کی خوشی اور اپنے بتوں کو اپنے سامنے ڈھیتے ہوئے دیکھنا اور ان کا دفاع نہ کر پانے کی بے بسی۔ وہ دن مجھے اسی طرح یاد ہے جس طرح پہلی بار سگریٹ پینے والے کو اس کی کھانسی یاد رہ جائے، نشہ نہیں۔

دفتر کا اگلا دن قدرے معمول کا تھا۔ اس سے اگلا دن بھی۔ فروری 1987 کا شمارہ پریس سے آیا تھا۔ اب اگلے شمارے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں آجکل کے دفتر کے روزمرہ میں شامل ہونے لگا۔ مدبرہ عثمانی، جو آجکل کے دفتر میں پہلے سے بطور ٹائپسٹ کام کر رہی تھیں اور جنھیں راز صاحب بٹی کہتے تھے اور اولاد کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے، انھوں نے اب ڈاک میرے حوالے کرنا شروع

کر دیا۔ یہ سب راز صاحب کے سامنے اور ان کے ایما پر ہونے لگا۔ ان دنوں 'آجکل' کی ڈاک میں اوسطاً پچیس تیس لفافے آتے تھے۔ صبح شام دو بار ڈاک آتی تھی۔ پہلی بار میں نے ڈاک میں آئی ہوئی تحریروں کو ایک نظر دیکھ کر اور پھر انھیں ترتیب وار یعنی غزلیں ایک جگہ، نظمیں ایک جگہ، کہانی الگ، مضامین الگ کر کے ان کے سامنے رکھا۔ آپ نے انھیں پڑھا؟ کھڑے لہجے میں کیا گیا سوال تھا۔ جی سب نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ 'پڑھ کر اور اپنی رائے لکھ کر مجھے دیجیے۔' یہ پہلا کام تھا جو انھوں نے مجھے باضابطہ سونپا۔ اس سے پہلے دو ایک بار جب میں نے رسالے سے متعلق کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھے مشفقانہ طور پر مشورہ دیا کہ مجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پڑھوں۔ خوب پڑھوں۔ کون سی لائبریری؟ پرانی دہلی میں ہردیال پبلک لائبریری ہے جہاں اردو کی بہترین کتابیں موجود ہیں۔ انھوں نے خود ہی بتایا۔ عبدالحمید جو میرے ساتھی تھے اور 'یوجنا' میں بطور سب ایڈیٹر تعینات کیے گئے تھے، وہ دہلی پبلک لائبریری کا پتہ لگا کر آئے۔ اس لائبریری میں جانا آنا زیادہ آسان تھا۔ اور راز صاحب کے پڑھنے کے مشورے کو ضروری مان کر اگلے سنیچر کو ہم دہلی پبلک لائبریری پہنچ گئے۔ یہاں پڑھنے کی بھی سہولت تھی اور کچھ ضابطے کی کارروائی کے بعد کتابیں گھر لے جانے کی بھی۔ اب میں پڑھنے لگا کہ یہ میرے شوق کا کام تھا۔ انھیں کچھ کچھ بتانے لگا۔ وہ بھی کچھ کچھ بتانے لگے۔ گاڑی پٹری پر آ گئی۔ میں انھیں، جس روپ میں وہ تھے، قبول کرنے لگا، وہ مجھے قبول کرنے لگے۔

دو تین ہفتے کے بعد ایک دن مجھے ایک کہانی دی۔ پڑھ کر اپنی رائے دیجیے۔ مصنف کا نام فیروز مکرجی لکھا تھا اور پتہ کہیں لندن کا تھا۔ میں اس نام سے واقف نہ تھا۔ تحریر ایسی صاف ستھری نہ تھی۔ کئی جگہ املے کی خامیاں بھی تھیں۔ راز صاحب جب بھی کوئی مسودہ پڑھنے بیٹھتے، ہاتھ میں سرخ روشنائی والا قلم ضرور ہوتا اور وہ کم و بیش متحرک بھی رہتا تھا۔ نقطہ، سکتہ لگانے سے لے کر لفظ بدلنے، جملہ تراشنے اور کسی غیر ضروری لفظ، فقرہ بلکہ پورا پورا پیرا حذف کرنے تک۔ جن دو لفظوں پر ان کے قلم کی گاج سب سے زیادہ گرتی تھی وہ ہیں 'بھی' اور 'ہی'۔ 'بھی' اور 'ہی' کو فضول اور زائد سمجھ کر بیشتر جگہوں سے کاٹ دیتے تھے۔ اس بات پر بڑے زچ رہتے تھے کہ لوگ اس قدر 'ہی' اور 'بھی' لکھتے کیوں ہیں۔ اور وہ غلط نہیں تھے۔ میں نے کئی بار ان کے ذریعہ 'ہی' اور 'بھی' قطع کیے ہوئے فقروں کو پڑھا

اور مجھے کوئی فرق نہیں محسوس ہوا۔ ویسے وہ خود 'ہی' اور 'بھی' کے کوئی مخالف نہیں تھے۔ کوئی لکھنے والا ہو بھی نہیں سکتا۔ ان کی ایک مشہور غزل کی ردیف ہے 'میں بھی'۔

ہاتھ شمشیر پہ ہے ذہن پس وپیش میں ہے
راز کن یاروں کے مابین کھڑا ہوں میں بھی

اور ایک شعر 'بھی' 'ہی' کے اثبات میں:

کیا بات ہے کہ بات ہی دل کی ادا نہ ہو
مطلب کا میرے جیسے کوئی قافیہ نہ ہو

خیر! تو مجھے فیروز مکرجی کی کہانی پڑھ کر اپنی رائے دینی تھی۔ میرے پاس کوئی لال قلم نہ تھا۔ نہ تب اتنی جرأت تھی۔ میں نے پنسل سے نشانات لگائے جہاں جہاں فقروں میں کچھ الجھاوے تھے یا جہاں جہاں املا نادرست تھا۔ یہ اندازہ ہوا کہ مصنف زبان سے کم واقف ہے۔ کہانی مگر ٹھیک تھی۔ میں نے رائے دی کہ شائع کی جاسکتی ہے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ یہ خاتون ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی کالج کے زمانے کی دوست ہیں۔ عرصے سے لندن میں رہ رہی ہیں۔ 'آجکل' میں اشاعت کے لیے یہ کہانی قرۃ العین حیدر نے خود ہی بھجوائی ہے۔ لیجیے صاحب! افسانہ نگار کی، قرۃ العین حیدر کی، راز صاحب کی اور میری سب کی عزت رہ گئی۔ کہانی مارچ 1987 کے شمارے میں شامل کرلی گئی۔ میرے آنے کے بعد یہ پہلا شمارہ پریس جارہا تھا۔ پاکستان سے آرٹسٹ صادقین کے انتقال کی خبر آئی تھی اور وہ صادقین پر گوشہ چھاپنے کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ان کی تصویریں ان کی رباعیاں، خطاطی کے پرانے نمونے، وہ نقوش جو انھوں نے آجکل کے لیے بنائے تھے اور جنھیں راز صاحب نے کئی برس پہلے سرورق پر چھاپے تھے اور جن کی وجہ سے آجکل کو حکومت ہند کی طرف سے بہترین طباعت کا دوئم انعام بھی ملا تھا، سب نکالے جارہے تھے اور میں ان سب کاموں میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پرچہ فائنل کرنے کا وقت آگیا۔ اس روز انھوں نے غالباً مجھے اس وقت، جب کہ کمرے میں میں ہی تنہا تھا مجھے ذرا ٹھوس ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: خورشید صاحب آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ پرچے پر آپ کا نام چھپ جائے گا۔' میں سکتے میں! اور وہ بے روک ٹوک رواں 'پرچے پر آپ کا نام تبھی چھپے گا جب آپ اپنا استحکاک ثابت کریں گے۔' استحکاک یا استحقاق؟ چھوٹی قاف یا بڑی قاف۔ انھوں نے چھوٹی قاف سے ہی بولا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بعض پنجابی حضرات 'ق' کی حسن ادائیگی سے اپنے آپ کو معذور پاتے ہیں۔ ان میں سرفہرست علامہ اقبال تھے۔ وہ خود کو اکبال کہتے تھے۔ جس پر یگانہ نے پھبتی کسی تھی: کہتے ہیں کہ اکبال ہے اکبال، مگر کا ہے کا ہے۔ مگر خیر! اس وقت جو بات تھی وہ چھوٹی قاف اور بڑی کاف کی ادائیگی میں کامیابی اور ناکامی جیسے چھوٹے مسئلے کے مقابلے بہت زیادہ بڑی تھی۔ پرچے پر میرا نام نہیں چھپے گا؟ مجھے اپنا استحقاق ثابت کرنا پڑے گا؟ کیوں؟ میرے ساتھ جنھوں نے نوکری جوائن کی تھی اور جو پبلی کیشنز ڈویژن سے نکلنے والے دوسرے رسالوں 'یوجنا اردو، ہندی یا انگریزی وغیرہ، بال بھارتی، کروکشیترا، ایمپلائمنٹ نیوز، Indian and Foreign Review سے وابستہ ہوئے تھے ان سب کے نام بطور سب ایڈیٹر چھپنے لگے تھے۔ آخر ہم یو پی ایس سی کا امتحان پاس کرکے آئے ہیں۔ ہمیں باضابطہ سرکاری آرڈر کے ساتھ ان دفتروں سے منسلک کیا گیا ہے۔ اب اور کیسے مجھے اپنا استحقاق ثابت کرنا ہے؟ کیسے؟؟ کیسے؟؟؟

اس روز جو میں دفتر سے لوٹا تو میرا من بہت بھاری تھا۔ پچھلے کچھ دنوں میں دفتری زندگی خاصی معمول پر آگئی تھی۔ وہ مجھے کام سونپتے تھے، باتیں کرتے تھے، اکثر تحریروں پر میری درج کی رایوں پر کچھ بولتے بھی تھے، پوچھتے بھی تھے۔ ہم ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ شفقت و مسکراہٹ کے ساتھ بات چیت کررہے تھے۔ مگر یہ؟ ایسا لگتا ہے کہ میں اس دفتر میں نہیں رہ پاؤں گا۔ راز صاحب کی تند مزاجی کا پتہ چل چکا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک سب ایڈیٹر اور ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر سرکاری آرڈر کے باوجود آجکل میں ٹک نہیں پائے تھے۔ لیکن مجھ جیسے ایک نہایت بے قیمت اور بے وقعت نوجوان کے سامنے رسالہ 'آجکل' اپنی اتنی بڑی امیج کے ساتھ ایک بہت بڑا لالچ تھا۔ یہ میرے لیے ایک عطائے غیبی تھا کہ میں 'آجکل' کا سب ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے بیشتر ساتھی، جنھوں نے مجھ سے پہلے سروس جوائن کی کم از کم ایم اے (اردو) ضرور تھے۔ کئی تو جے این یو میں ریسرچ بھی کررہے تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی تقرری 'آجکل' میں نہیں ہوئی۔ ہوئی تو میری جو اردو کے لیے منتخب ہونے والے افسروں کی فہرست میں سب سے نیچے تھا۔ کیا عجب کیا عجب! یہ قدرت کا فیصلہ تھا، اس قدرت کا جسے اپنی دنیا کو، اپنے بنائے ہوئے نظام خیر وشر کے مطابق چلاتے رہنا ہے۔ جس کی مصلحتیں بسا اوقات انسانی سمجھ سے پرے ہیں۔ یہ وہی جانتا ہے کہ وہ جو چٹکی سے مسل کر مار دیے جاتے ہیں مچھر، کھٹمل ان کی خوراک انسانی خون کیوں ہے اور دودھ دینے والی گائے کو سینگ دینے کے باوجود ایسی سیدھی 'گئو' کیوں بنایا ہے۔ یہ بس وہی جانتا ہے کہ ایک نوجوان جس کی علمی وادبی لیاقت وصلاحیت واجبی سی ہی تھی، جو ایک ایسے سماج کا پروردہ تھا جہاں کی زبان کھچڑی اردو تھی، جو ایک ایسے گھرانے کا بیٹا تھا جہاں اردو کی کتاب تو کیا اخبار تک نہیں آتا تھا، اتنوں کے ہوتے ہوئے اسے 'آجکل' جیسے رسالے کا سب ایڈیٹر کیوں مقرر کیا۔ آجکل میں تقرری جو پہلے خوشی بنی تھی، لالچ بنی اور اب ایک چیلنج بن گئی۔'.....تو مجھے اپنا استحقاق ثابت کرنا پڑے گا!' کچھ دیر تک اپنے آپ سے الجھنے کے بعد میں نے گویا خود سے کہا۔ مگر کیسے؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ انھوں نے بتایا نہیں تھا۔ میں اپنی تیاری کررہا تھا، امتحان میں پورا اترنے کے لیے وہ اپنی تیاری کررہے تھے اچھے ممتحن کی۔ دونوں اندر اندر۔ اوپر اوپر یہ کہ دفتری معاملات بالکل معمول پر تھے۔ وہ مجھ سے خوب کام لیتے اور میں بڑھ چڑھ کے کام کرتا رہا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے، مہر ومحبت کے ساتھ، شفقت کے ساتھ۔ میں اپنے بزرگ کی طرح ان کی عزت کرتا رہا۔ ان کے طور طریقے، اخلاق وعادات کی خوبیوں نزاکتوں اور باریکیوں کو اپنے اندر جذب کرتا رہا اور وہ پوری توجہ سے مجھے وہ ساری باتیں بتاتے، سمجھاتے رہے جو ان کے حسابوں میرے لیے ضروری تھیں۔ یہ 'آجکل' کا دفتر تھا۔ یہاں ملک بھر سے ادیب وشاعر آتے رہتے تھے۔ ان دنوں بہت سے ایسے شاعر وادیب حیات تھے جن کا اردو ادب میں بڑا نام تھا۔ ابھی پچاسوں ایسے ادیب وشاعر ہندوستان اور پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں موجود و سرگرم تھے جنھیں اردو معاشرہ جانتا تھا، مانتا تھا، خواہ اس نے ان کا لکھا چھٹانک بھر ہی پڑھا ہو، سنا ہو۔ سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی، آل احمد سرور، ظ انصاری، بشیر بدر... کس کس کا نام لیا جائے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے شجاع خاور، شوکت حیات، علی امام نقوی، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف سے اسعد بدایونی تک سیکڑوں ایسے ادیب وشاعر تھے، جو جب دہلی آتے تو 'آجکل' کے دفتر ضرور آتے۔ جن لوگوں کو میں کبھی دور سے، میں سامعین میں اور وہ اسٹیج پر، دیکھتا تھا اب میں ان کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا، ان کی تواضع کرسکتا تھا اور ان کی گفتگو میں شریک ہوسکتا تھا۔ یہاں کی زبان الگ تھی، ارفع تھی۔ میں جہاں سے آیا تھا وہاں سے دیکھا تو پایا کہ اس دنیا کے ادب آداب اور تھے اس کی نشست و برخاست اور تھی، اس کی زبان اور تھی اس کا Narrative اور تھا۔ یہ زبان

ویبان اور فکر و شعور ہر اعتبار سے ایک بہتر دنیا تھی اور اب میں اس دنیا میں داخل ہونے کے بعد یہاں سے نکل کر عمر بھر کف افسوس ملنے کو تیار نہیں تھا۔ شمارے کے بعد دیگرے پریس میں بھیجے جا رہے تھے، جن میں میری محنت بھی مقدور بھر شامل ہوتی تھی لیکن پرچے پر نام اب بھی نہیں جا رہا تھا اور میرے اندر ایک کشاکش جاری تھی۔ مجھے ان سے یہ پوچھنا چاہیے کہ نہیں کہ کیا یوں ہی...؟۔ دفتر کے ایک اور بزرگوار جو راز صاحب سے میل جول بھی رکھتے تھے اور کد بھی، مجھ سے کہہ چکے تھے کہ کہیے تو میں اس معاملے کو ڈائریکٹر کے سامنے رکھوں، بھئی! آپ سب ایڈیٹر ہیں، کوئی بندھوا مزدور تو نہیں (برسبیل تذکرہ بندھوا مزدوری ختم کرنے کا قانون انھی دنوں بنا تھا اور ان دنوں یہ اصطلاح جبر کی ہر صورت حال پر بجا و بیجا رائج تھی!) تاہم میں نے سنجیدگی سے کبھی نہیں سوچا کہ ان بزرگوار کی مدد لوں۔ ایک طرف راز صاحب کا یہ کٹھور فیصلہ تھا اور دوسری طرف ان کا بزرگانہ، مشفقانہ برتاؤ۔ ایسے ہی عالم میں ایک دوپہر کو جب کہ باہر موسم گرم ہو گیا تھا اور کھانے کے وقفے میں وہ اور میں دفتر کے نسبتاً آرام دہ ماحول میں بہت آرام سے صوفے پر بیٹھے تھے کہ انھوں نے کہا: لڑکے! تمھارے سارے ساتھی بڑے مزے میں ہیں۔ تم میرے پاس کہاں پھنس گئے۔ چاہو تو اپنا تبادلہ کہیں اور کرا لو۔' ادھر کچھ دنوں سے وہ مجھے نام کے بجائے 'لڑکے' کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے اور ان کا یہ مشورہ گویا بڑا مشفقانہ تھا۔ میں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ لہجے سے بہر حال یہ ظاہر کر دیا کہ یہ نہیں ہوگا۔ اب کے میں اداس نہیں ہوا۔ اس شام گھر لوٹتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو پورے شد و مد کے ساتھ یاد دلایا کہ اپنا استحقاق ثابت کرنے کو میں نے اپنے لیے ایک چیلنج بنا رکھا ہے۔ اب میں نے ادب کو اور زیادہ سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا۔ دفتر میں اور زیادہ محنت سے کام کرنے لگا۔ اپنے آپ کو آجکل کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی تگ و دو میں جٹ گیا۔ سیکھنے، سمجھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوانے کا نہیں، میں نے یہ تہیہ کر لیا۔ اب میری ساری توجہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے، زیادہ کارآمد بنانے پر لگ گئی تھی یہاں تک کہ 'نام' کے لوبھ سے تقریباً بے پروا ہو چکا تھا۔ میں دفتر آجکل کے سرگرم ادبی ماحول میں، غالب اکیڈمی کی ادبی محفلوں میں، شعری نشستوں میں اور اپنے ہم عمر مگر مجھ سے کہیں زیادہ با صلاحیت دوستوں بالخصوص مشرف عالم ذوقی اور شاہد انور کی صحبت میں مست تھا۔ میرا ہر دن پچھلے دن سے زیادہ پر مایہ ہوتا۔

میرے پاؤں رقص میں آ گئے تھے۔ میں نے اپنا Rhythm پا لیا تھا۔ پرچے پر نام چھپنے نہ چھپنے کی بات اب میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکی تھی۔ کہ... ایک خوشگوار موسم کے ایک کھلے ڈھلے دن میں، جب کہ ستمبر 1987 کا پرچہ سارا کا سارا فائنل کیا جا چکا تھا، راز صاحب نے فہرست والا صفحہ خوشنویس کی طرف بڑھایا اور ایک جگہ پر اشارہ کر کے بتایا کہ رئیس صاحب! یہاں جگہ بنائیے۔ انھوں نے کچھ نہ سمجھنے والے لہجے میں پوچھا: کیوں؟ کیا کرنا ہے راز صاحب؟ میں بھی کچھ نہیں سمجھا۔ میں لاتعلق سا یہ دیکھ رہا تھا کہ شاید اس میں میرے سمجھنے کی کوئی بات نہیں۔ انھوں نے رئیس صاحب کے پوچھنے پر ایک ذرا سا مسکرا کر، جیسے کوئی بہت مسرور کن، کوئی تسلی بات ہو، کہا: جگہ بنائیے۔ 'پرچے پر خورشید صاحب کا نام جائے گا۔' اس کے بعد

راز صاحب اردو تہذیب کے پروردہ تو نہ تھے لیکن اردو تہذیب سے کچھ اس طرح کسب کیا تھا کہ اردو ان کی اور وہ اردو کے تھے۔ (منشی بشیشور پرساد)منور لکھنوی کے شاگرد تھے اور ان سے شاعری کی صنعت و حرفت گری کے علاوہ لکھنوی تہذیب کے ادب آداب. اس کی نشست و برخاست سیکھی تھی. بلکہ یوں کہیں کہ اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا.

مدبرہ عثمانی سے مخاطب ہو کر کہا: مدبرہ، لڈو منگواؤ۔ رئیس الاسلام صاحب نے خوش ہو کر 'اچھا..!' کہا۔ مدبرہ میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ فلک صاحب جو پروف پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے، مسکرا کر کوئی اچھی سی بات کہی۔ سارا کمرہ خوشی سے بھر گیا تھا اور وسط میں میں تھا، بے قیمت، بے وقعت۔ جس کی بولی لگی تھی اونچی۔ مجھے اپنی نوکری کا پروانہ پا کر جتنی خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ اس دن ہوئی تھی۔ آج میں اس قابل ہوا کہ میرا استحقاق ثابت ہوا۔ اپنا حق پانا اور بات ہے استحقاق ثابت کرنا اور۔

....

راز صاحب اردو تہذیب کے پروردہ تو نہ تھے لیکن اردو تہذیب سے کچھ اس طرح کسب کیا تھا کہ اردو ان کی اور وہ اردو کے تھے۔ (منشی بشیشور پرساد) منور لکھنوی کے شاگرد تھے اور ان سے شاعری کی صنعت و حرفت گری کے علاوہ لکھنوی تہذیب کے ادب آداب، اس کی نشست و برخاست سیکھی تھی، بلکہ یوں کہیں کہ اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔ خود کو لکھنوی پنجابی کہتے تھے۔ یعنی اردو والوں کے درمیان ہوتے تو پورے لکھنوی اور جب جلال میں آتے تو اکھڑ پنجابی۔ پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائریکٹر شیام سنگھ ششی سے اکثر خفا رہتے تھے۔ ان کے سامنے کیسے اپنی برہمی ظاہر کرتے تھے معلوم نہیں۔ لیکن اپنے معنوی جد اعلیٰ جوش صاحب کی کرسی پر بیٹھ کر بلند بانگ پنجابی لہجے میں ڈائریکٹر کو کھری کھوٹی سناتے تھے، جب کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کاریڈور میں ان کے مخبروں کی آن جان رہتی ہے۔ تاہم اردو والوں کے بیچ 'آپ کیا پسند فرمائیں گے' 'میرے ساتھ ایک پیالہ چائے پیجیے'، 'معذرت خواہ ہوں' 'ان شاء اللہ، ماشاء اللہ سے لے کر فی امان اللہ تک لکھنوی تہذیب کے سارے پھول بکھیرتے تھے۔ اس طرح کہ لفظوں کے یہ سچے پھول، سچے ہی لگتے تھے، مصنوعی نہیں۔ دفتر آنے والے ہر شخص سے احترام سے پیش آتے تھے خواہ اس سے ان کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ انھوں نے 'آجکل' کا تنقید نمبر نکالنے کا ڈول ڈالا جس کا خاکہ شارب ردولوی صاحب کے تعاون سے مرتب کیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو وہ نقاد مانتے نہیں تھے (حالانکہ شارب صاحب اپنے مضمون 'نو تنقید' میں جسے راز صاحب نے شوق سے چھاپا تھا، فاروقی صاحب کو ایک اہم نقاد بتا چکے تھے) اور نارنگ صاحب سے ان کا بگاڑ ایک پرانا زخم بن چکا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات ان کی Synopsis میں شامل نہ تھے۔ میں متعجب! لیکن میری کیا مجال جب شارب صاحب انھیں آمادہ نہ کر سکے (ہوں گے)۔ فاروقی صاحب کو اس کی خبر شاید نہ لگی ہو، لیکن نارنگ صاحب... ایک روز دفتر آ گئے۔ راز صاحب اسی تپاک سے ملے جس طرح دفتر میں آنے والے کسی اہم ادیب و شاعر سے ملتے تھے۔ انھوں نے چائے کو پوچھا۔ ہر آنے والے کو چائے پلواتے تھے، کم از کم پوچھتے ضرور تھے۔ 'نہیں'۔ نارنگ صاحب نے کہا۔ گرمی کے دن تھے۔ ٹھنڈا؟ جی ہاں۔ نارنگ صاحب کے لیے کیمپا کولا منگوایا۔ گفتگو ہوتی رہی۔ تنقید نمبر کے سلسلے میں۔ جو باتیں ہوئیں ان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بس اتنا بتا دوں کہ وہ نارنگ صاحب کی ہر تجویز کو جھکائی (طرح) دیتے رہے، بس ایک مان لی، جو اکتسابی تنقید سے متعلق تھی۔ جت تمام! خود نارنگ صاحب سے مضمون کی فرمائش نہیں کی۔ یہ نارنگ صاحب نہ ہوتے، کوئی اور، ان سے کم درجے کا ادیب بھی، اس طرح ان کے سامنے ہوتا، تو وہ اس سے

پوری انکساری سے مضمون کی فرمائش کرتے۔ کمپا کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ نارنگ صاحب کو اسی شریفانہ وضع کے ساتھ رخصت کیا جیسے دوسروں کو کرتے تھے۔ اس واقعہ کے کئی دن بعد میں نے اس 'تماشے' پر اپنی حیرت کا اظہار کیا تو انھوں نے وہی کہا جو میرے لیے متوقع تھا: 'آجکل کے دفتر میں آنے والا ہر شخص آپ کا مہمان ہے۔'

آجکل کے معیار کے لیے بہت Touchy تھے۔ کوئی ذرا خلاف کہہ دیتا تو اکھڑ ہی جاتے۔ عمیق حنفی، جو ان کے ہم عصر تھے اور جن کی تنقیدی صلاحیتوں کے بڑے قدردان تھے، ان سے اس بات پر ٹھن گئی کہ کبھی انھوں نے کہہ دیا تھا کہ آجکل بھی کوئی ادبی رسالہ ہے؟ گی لپٹی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لاگ اور لگاؤ کے آدمی تھے۔ دل کے کھرے۔ یوں بیٹھے بٹھائے کوئی کھرا نہیں ہوجاتا۔ پرانی کہاوت ہے۔ سونا تپتا ہے تبھی کھرا ہوتا ہے۔ راز صاحب نے جس سے لگاؤ رکھا، سدا کے لیے۔ اور جس سے بگاڑ ہوگیا اس سے بھی سدا کے لیے۔ گوپی چند نارنگ اور عمیق حنفی کے بعد جس شخص سے ان کے بگاڑ کی بات مجھے معلوم ہے وہ بلراج ورما ہیں۔ آجکل کی 1985 کی فائل میں ان کی کہانی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے پڑھی۔ کہانی تو بڑی کسی بندھی تھی لیکن کہانی میں Nudity بہت تھی۔ میں حیران کہ یہ کہانی راز صاحب نے چھاپی کیسے تھی۔ انھوں نے افسوس کے ساتھ بتایا کہ یہ کہانی چھاپ کر انھوں نے غلطی کی تھی (اور غلطی جو ہوئی تھی وہ یاری کی دلداری میں!)۔ آجکل کے قارئین نے اس پر بہت شدید ردعمل کیا تھا۔ لیکن یہ وجہ نہ تھی بلراج ورما سے بگاڑ کی۔ وجہ؟ مجھے انھوں نے بتائی تھی۔ لیکن اب جب کہ دونوں مرحوم ہوئے اور تصدیق یا تردید کرنے والا کوئی نہیں، اس لیے اس کا سفید و سیاہ، اس وقت کے حوالے جس کا امین اب صرف خدا ہے۔ ہاں! اتنا ضرور کہ پھر ان سے تعلقات استوار نہ ہونے تھے نہ ہوئے۔ ایک روز دفتر میں ایک خوش قامت، خوش شکل، خوش پوش سن رسیدہ خاتون آئیں۔ راز صاحب نہایت عزت سے پیش آئے۔ انھیں بٹھایا۔ تواضع کی۔ لیکن آخر میں جواب وہی۔ نہیں بھابی جی اب یہ نہیں ہوگا۔ وہ بلراج ورما کی اہلیہ تھیں اور ناراض (راز) کو منانے آئی تھیں۔

راز صاحب کی شاعرانہ خوبیوں اور حیثیت کا تعین بوجوہ نہیں ہوسکا اور اس وقت میرا مقصد یہ ہے بھی نہیں۔ مگر ہاں یہ کہ گفتگو بڑی شاعرانہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسی حیران کرنے والی کہ میں ان کی کھوپڑی کی طرف دیکھنے لگتا جو آگے سے بال اڑ جانے کی وجہ سے اور بھی نمایاں

> **راز صاحب کی شاعرانہ خوبیوں اور حیثیت کا تعین بوجوہ نہیں ہوسکا اور اس وقت میرا مقصد یہ ہے بھی نہیں۔ مگر ہاں یہ کہ گفتگو بڑی شاعرانہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسی حیران کرنے والی کہ میں ان کی کھوپڑی کی طرف دیکھنے لگتا جو آگے سے بال اڑ جانے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار یہ بچکانہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ ایسی ناریل جیسی کھوپڑی میں ہی ذہانت بھری ہوتی ہے۔**

ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار یہ بچکانہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ ایسی ناریل جیسی کھوپڑی میں ہی ذہانت بھری ہوتی ہے۔ بانی جوان کے نہایت قریبی دوست تھے کیا پتہ وہ بھی راز صاحب کے اس وصف سے متاثر ہوں اور وہ اثر شعر میں یوں ڈھل گیا ہو:

وہ اسرار محفوظ بیدار باطن
دم گفتگو صد سخن معتبر راز

ناراضگی کے اظہار میں بھی زبان و بیان کی شدت و شیرینی کا امتزاج رہتا۔ ایک روز میں نے ایک شاعر کا ذکر کیا جو آرٹسٹ بھی ہیں۔ چھوٹتے ہی بولے: وہ شاعروں میں آرٹسٹ ہے اور آرٹسٹوں میں شاعر۔ مطلب؟ مطلب یہ کہ نہ شاعر ڈھنگ کا نہ آرٹسٹ۔ مزید بات چلی تو معلوم یہ ہوا کہ موصوف سے راز صاحب کا کبھی دفتری تعلق بھی رہا ہے۔ اور جب بات نالائقی کی چل ہی پڑی تو رکتے کیا: یہ دوات اٹھا کر دیوار پر مار دو اس سے بھی کچھ نقش بن جائے گا... اس نے بیورو میں اتنا بھی کام نہیں کیا۔' کام کرنے والوں کو پسند کرتے تھے اور نہ کرنے والوں کو اس قدر ناپسند کہ بیان مبالغہ کی حد کو جا پہنچتا۔ ان کی شاعرانہ باتوں کی یاد کے سلسلے میں ایک اور بات بیان کرتا ہوں جس کا Subject گرچہ میں ہی ہوں لیکن اس وقت صرف بیان کنندہ ہوں۔ دروغ برگردن مشرف عالم ذوقی کہ راوی اس قصے کے اور عینی شاہد اس وقت اور منظر کے وہی ہیں۔ وہ 'آجکل' کے دفتر برابر آتے تھے۔ اور اب تو مجھ سے بھی گہرے دوستانہ مراسم ہوگئے تھے۔ وہ دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ منموہن تلخ صاحب آئے۔ میری سیٹ ایسی تھی کہ جو راز صاحب کے سامنے بیٹھتا، اسے ایک ذرا دائیں مڑ کر میری طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ تلخ صاحب نے ایک بار میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں نے انھیں 'آداب' کہا۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور پھر راز صاحب سے گفتگو کرنے لگے۔ ان کے بائیں طرف بیٹھے مشرف عالم ذوقی بھی شریک گفتگو تھے۔ میں دفتر میں ہی کسی کام سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو تلخ صاحب جا چکے تھے۔ ذوقی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے باہر چلنے کو کہا اور کاریڈور میں پہنچ کر نہایت جذباتی لہجے میں بتایا۔ 'جانتے ہو کیا ہوا۔ تمھارے نکلنے کے بعد تلخ صاحب نے تمھارے بارے میں پوچھا، یہ کون صاحب ہیں۔ جانتے ہو راز صاحب نے کیا جواب دیا۔' 'کیا؟' 'کہا، یہ میری تیس سال کی کمائی ہے۔' آدمی تعریف کا کتنا بھوکا ہوتا ہے۔ کوئی تعریف، کیسی بھی تعریف، حتیٰ کہ جھوٹی ہی ہو تعریف۔ آدمی تعریف کا بڑا بھوکا ہوتا ہے۔ میری بھوک مگر بہت تھوڑی ہے۔ جھوٹی تعریف تو در کنار، ہما شما کی تعریف سے بھی مجھے الجھن ہوتی ہے۔ مگر ان کی تعریف جن کی میں قدر کرتا ہوں اور وہ تعریف جو لمبا سفر طے کر کے مجھ تک آتی ہے، اس کو دل میں بساتا ہوں، اور تمغے کی طرح سینے پہ سجاتا ہوں۔ میرے جیسے معمولی آدمی کے لیے یہ تعریفیں دور ایک طاقچے میں جلتے دیے کی طرح ہیں، جس کی جوت میں ایک بے کس کی وہ رات کٹی تھی جو اسے خون کو منجمد کر دینے والے پانی میں گلے گلے ڈوب کر گزارنی پڑی تھی۔ یہ ایک حکایت ہے۔ بجا! مگر ہر حکایت کسی نہ کسی زندگی کا سچ ہوتی ہے۔

جنوری 1988 میں میں نے ایک کہانی 'حبس' لکھی۔ یہ ایک نسبتاً طویل کہانی تھی۔ یہ میری افسانہ نگاری کا باضابطہ آغاز تھا۔ اس سے پہلے میں نے افسانہ لکھنے کی جو بھی کوششیں کی تھیں وہ خود میری نظر میں ناکام تھیں۔ کہانی میں اپنے قریبی دوستوں مشرف عالم ذوقی اور شاہد انور کو اور ان کے اصرار پر کئی اور دوستوں کو سنا چکا تھا اور ان کی پسندیدگی وصول کر کے خزانۂ دل میں ڈال لیا تھا۔ کہانی میں میری دلچسپی زیادہ تھی اور یہ دونوں دوست بطور افسانہ نگار اپنی شناخت مستحکم کر چکے تھے۔ کہانی کی مبادیات پر گفتگو بھی ہمارے درمیان قدرے مشترک تھی۔ میں نے کہانی قدرے اعتماد کے ساتھ راز صاحب کو پڑھنے کے لیے دی۔ وہ افسانہ کے بہت اچھے پارکھ تھے۔ ان کے زمانۂ ادارت میں بہت اچھے افسانے شائع ہوئے ہیں، یہ 'آجکل' کی فائلیں بتاتی ہیں۔ بعض اصحاب

نظر کہتے ہیں، کہ ان کے زمانے میں نہایت اعلیٰ درجے کے تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ افسانے میں ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ افسانہ انھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس بار ہاتھ میں لال قلم نہیں ایک کالا ڈاٹ پین تھا۔ دو ایک جگہ کچھ قطع کیا، کچھ لکھا۔ میں دور سے دیکھا کیا۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ افسانے کی زبان اور بیانیہ کا مجھے اتنا شعور تھا۔ ڈیڑھ دو صفحہ پڑھنے کے بعد کچھ اس لہجے میں جیسے پڑھتے پڑھتے زچ ہو گئے ہوں، اوبنے لگے ہوں، میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہنا کیا چاہتے ہو؟ میرے اندر جیسے فنکارانہ انا اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو گئی۔ سنبھلتے، لڑکھڑاتے اپنے خیال کو زبان دی ''اگر میں کسی اور طرح یہ بتا سکتا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں تو میں یہ سات صفحے کا افسانہ کیوں لکھتا۔'' راز صاحب نے قلم رکھ دیا۔ پڑھنے والا موٹا چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ دور دیکھنے والا چشمہ لگایا۔ مسکرائے اور کہا: ''جسے یہ معلوم ہے وہ افسانہ لکھ سکتا ہے۔'' پھر میں اکا دکا اپنی نہایت دھیمی رفتار سے افسانہ لکھنے لگا۔ سنجیدہ پڑھنے والوں نے نوٹس لیا۔ کبھی کبھی ان تک بھی بات پہنچا دیتا۔ لیکن میرا افسانہ پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی حتیٰ کہ تب بھی نہیں جب 'مذبح کی بھیڑیں' چھپی اور اپنی سماعت خوش گمان کی مانوں تو کافی چرچے میں رہی۔ سوغات میں 'جابین' چھپی تب بھی نہیں، حالاں کہ اس پرچے میں جب نوجوان راز کی نظمیں چھپی تھیں وہ انھیں اب بھی فخریہ یاد تھیں۔ جب میری کہانی چھپی، تب تک اس میں چھپنے والے نوجوان افسانہ نگار اتنے بھی نہ تھے، جتنے ایک ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں۔ مجموعہ چھپا (ظاہر ہے، میں نے انھیں پیش کیا!) تب بھی نہیں۔ میں کچھ منتظر رہا۔ یہ بات لفظوں میں تو نہیں کہی لیکن (میں یہ سمجھا کہ) زبان بے زبانی سے کہہ دی کہ 'افسانے تبھی پڑھوں گا جب تم اپنا یہ استحقاق ثابت کرو گے۔' افسوس کہ اس بار میں نے اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ افسوس کہ اب اگر چاہوں بھی تو یہ کوشش بے سود ہوگی، بے مراد رہے گی۔ عدم اور وجود کی دیوار کے اس طرف اور اس طرف کھڑے دو انسانوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کسی فرشتے کے فریضے میں نہیں لکھا ہے۔

1993 میں دہلی اردو اکادمی نے انھیں شاعری کی مجموعی خدمات کے لیے اپنا سالانہ ایوارڈ دیا تھا۔ اعلان شائع ہوا۔ میں نے مبارکباد دی۔ خوش تو ہوئے مگر یہ بھی کہا کہ لڑکے عمر گزر گئی۔ اب یہ ایوارڈ میرے کس کام کا؟ کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ قدرے درشت لہجے میں پوچھا: تم ایوارڈ فنکشن میں کیوں نہیں آئے؟' 'طبیعت خراب تھی۔ نزلے میں بری طرح مبتلا تھا۔' میرا جواب برائے جواب تھا۔ نہ کوئی صفائی نہ معذرت۔ انھوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا: بابر تھا، انشو تھی، نیلو تھی، اویناش تھے، گائتری تھی۔ تم (زور دے کر کہا!) نہیں تھے۔ افسوس! میرا فیملی فوٹو گراف ادھورا رہ گیا۔ ان کا یہ افسوس بھرا جملہ آج بھی میرے سینے پہ ایک بھاری سل کی طرح دھرا ہے۔ اب بھی جب کبھی نزلہ میں بری طرح مبتلا ہوتا ہوں تو ایک بار یہ یاد کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں کہ کسی بزرگ کسی دوست، کسی عزیز کی خوشی میں شریک تو نہیں ہونا۔ کوئی فیملی فوٹو گراف میرے اس نزلے کی وجہ سے ادھورا تو نہیں رہ جائے گا۔

راز صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ جو دفتری تکلف تھا بلکہ بُعد کہیے وہ ختم ہو گیا تھا۔ اب جو رشتہ تھا وہ

راز صاحب کسی کے بارے میں، اچھی بری کوئی سی بھی رائے قائم کرنے کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ لیکن ایک بار جو رائے بنا لی تو پھر اس میں تبدیلی کو راضی نہ ہوتے۔ انھوں نے ایک بار رائے بنا لی کہ حکیم منظور اس وقت غزل کے سب سے اچھے شاعر ہیں اور اندر سروپ دت نادان نظم کے تو پھر جیتے جی اس رائے میں تبدیلی نہیں کی۔

رسمیات کا پابند نہ تھا۔ بس وہ قدریں تھیں جن کی پاسداری میں نے بیش از بیش انھیں سے سیکھی تھیں۔ ایک روز پارلیمنٹ اسٹریٹ پر کھڑا میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اچانک بس پانچ سات قدم کی دوری پر وہ یوں نظر آئے جیسے سامنے سے چل کر نہیں، یہاں پر، یہیں پر میرے سامنے آسمان سے اترے ہوں۔ میں نے جیسے تیسے سگریٹ چھپایا، بجھایا۔ پھر ہم نے ساتھ بیٹھ کر ایک ریستوراں میں چائے پی۔ اس دن کے بعد میں نے پارلیمنٹ اسٹریٹ پر سگریٹ پینے سے ہمیشہ گریز کیا کیونکہ ادھر وہ اکثر مل جاتے تھے۔ اور کیا پتہ کب وہ آسمان سے اتر پڑیں میری سعادت مندی کا امتحان لینے۔ وہ کبھی ریڈیو میں ریکارڈنگ کے لیے کبھی گایتری شرما جی سے ملنے، کبھی دوردرشن کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے اور کبھی انجم عثمانی صاحب سے ملاقات کے لیے آتے ہی رہتے تھے۔ PTI کی کینٹین میں ایک روز کھانے کے دوران ایک بزرگ ادیب کا ذکر چھڑ گیا۔ چند برس پہلے وہ راز صاحب کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اور راز صاحب کی بعض مہارتوں سے فیض یاب بھی ہوئے تھے۔ مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ ان دونوں کے مزاج ایک دوسرے کے برعکس تھے لیکن اس کا علم نہیں تھا کہ یہ تعلق زیادہ دنوں تک چل نہیں پایا۔ راز صاحب دل تھے، صاحب ضمیر تھے۔ ان کا نام لے کر کہا..... صاحب اگر مجھ سے کہیں کہ میں پانچ ستارہ ہوٹل میں ٹھہراؤں گا اور پانچ ہزار روپے دوں گا تب بھی میں ان کے مشاعرہ میں نہیں جاؤں گا۔ اور فضل تابش مجھ سے کہے گا کہ مجھے بھوپال کے کسی محلے کے مشاعرہ میں آنا ہو تو میں سکنڈ کلاس میں سفر کر کے بھی پہنچ جاؤں گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں ان سے ان کی اس شدید بدگمانی کا سبب پوچھتا۔ لیکن یہ وقت ایک افسوس کا تھا۔ ایک افسوس جس کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ اور وقت نے اس افسوسناک خبر کو ان تک پہنچانے کا کام میرے ذمے کر دیا تھا۔ 'آپ کو معلوم ہے، فضل تابش صاحب کا انتقال ہو گیا، پرسوں۔' ہاتھ کا نوالہ تھالی میں واپس رکھ دیا۔ آدھا کھایا ہوا کھانا ہمارے بیچ دیر تک پڑا رہا۔ میں نے ویٹر کو تھالیاں اٹھانے کا اشارہ کیا۔ اپنی نم آنکھوں کا پانی آنکھوں میں ہی جذب کرنے کی کوشش میں جیسے وہ کچھ اور بوڑھے ہو گئے۔ وہ شاید اس ان دیکھی کو دیکھ رہے تھے، جس کا نام موت ہے اور جس نے ان کا ایک پیارا دوست ہمیشہ کے لیے چھین لیا تھا۔ فضل تابش ان کے جوانی کے دنوں کے دوست تھے۔

راز صاحب کسی کے بارے میں، اچھی بری کوئی سی بھی رائے قائم کرنے کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ لیکن ایک بار جو رائے بنالی تو پھر اس میں تبدیلی کو راضی نہ ہوتے۔ انھوں نے ایک بار رائے بنالی کہ حکیم منظور اس وقت غزل کے سب سے اچھے شاعر ہیں اور اندر سروپ دت نادان نظم کے تو پھر جیتے جی اس رائے میں تبدیلی نہیں کی۔ آجکل میں شائع کرنے کے معاملے میں بعضوں کو وہ اتنا مانتے تھے کہ وہ کچھ بھی لکھ دیں اور کتنا بھی لکھ دیں کم ہے۔ عبدالمغنی صاحب کا ہر مضمون قریب ترین شمارے میں چھپ جاتا۔ شارب صاحب نے جو لکھا عمدہ ہی لکھا ہوگا۔ مالک رام، آل احمد سرور، ظ انصاری، گیان چند جین، اسلوب احمد انصاری، سلیم اختر، ممتاز حسین، علی جواد زیدی وغیرہم کا لکھا سر آنکھوں پر۔ اسی طرح، ٹھیک اسی

طرح ایک وقت میں کالی داس گپتا رضا ان کی کمزوری بن گئے تھے۔ غالبیات پر رضا صاحب نے جس قدر مبسوط تحقیقی کام کیا ہے، وہ نا قابل فراموش ہے۔ راز صاحب ان کی غالب شناسی پر فریفتہ تھے۔

دراصل ان کی ساری محنت، ساری شکایت، ساری دوستیاں، ساری دشمنیاں سب فقط و محض اردو سے تھی، اردو والوں سے تھیں۔ میں نے اردو کی بے لوث محبت میں یوں گلے گلے ڈوبا کوئی اورشخص نہیں پایا جب کہ انھوں نے اردو کی روٹی نہیں کھائی۔

ہندو مسلم یگانگت کے ثنا خواں تھے۔ گنگا جمنی تہذیب کی بات تو میں نے ان کے منہ سے سو بار سنی۔ صادقین پر مضمون لکھا تو اس لفظ کے اعادہ کا محل تلاش کر لیا۔ ''ایک کاغذ پر صادقین صاحب نے دیوناگری میں 'اوم' لکھا۔ انداز خوبصورت اختیار کیا۔ کاغذ کا رخ دائیں سے نیچے کو کر دیں تو لفظ اللہ پڑھا جاتا تھا۔ گنگا جمنی تہذیب کے حامل ہندوستان ایسے ملک کے وزیر اعظم (محترمہ اندرا گاندھی) کے لیے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا تھا؟ اسی انداز کا اوم اور اللہ موصوف نے لکھ کر مجھے عطا کیا تھا، جو میرے غریب خانے میں مختصر سے مندر میں اب بھی موجود ہے۔ گویا اب اللہ میرے مندر میں رہتا ہے۔'' بین مذہبی رواداری کی ایک اور بات یاد آ گئی۔ مشہور سائنسداں پروفیسر ظہور قاسم نے انگریزی میں لکھا اپنا ایک مضمون ترجمہ کے لیے راز صاحب کے پاس بھجوایا۔ یہ مضمون انھیں یوم شہادت علیؓ کے موقع پر غالب اکیڈمی میں ہونے والے جلسے میں پیش کرنا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ دہلی میں ایک سے ایک اردو داں موجود ہیں، پھر ظہور قاسم صاحب نے ترجمہ کے لیے راز صاحب کو کیوں چنا؟ چھوٹا سا مضمون تھا۔ مجھے مضمون پڑھنے کو دیا۔ لفظ موتیوں کی طرح چنے ہوئے تھے۔ ایک ایک لفظ سے مدحت علی کی خوشبو آتی تھی۔ میں نے جانے کیا سوال ذہن میں رکھ کر پوچھا: آپ نے ترجمہ کیسے کیا؟ ان کا جواب تھا۔ 'وضو بنا کر ترجمہ کرنے بیٹھا تھا۔'

دراصل ان کی ساری محنت، ساری شکایت، ساری دوستیاں، ساری دشمنیاں سب فقط و محض اردو سے تھی، اردو والوں سے تھیں۔ میں نے اردو کی بے لوث محبت میں یوں گلے گلے ڈوبا کوئی اور شخص نہیں پایا جب کہ انھوں نے اردو کی روٹی نہیں کھائی۔ مجھے اس تلخ نوائی کے لیے معاف رکھا جائے کہ اردو زبان اور اردو ادب ان کے رگ و پے میں بہتا تھا اور اگر وہ آخر عمر میں اس بات کے شاکی ہو گئے تھے کہ ان کی قرار واقعی قدر دانی نہیں ہوئی تو اسے بشری کمزوری سمجھ کر در گزر بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے ان کی عمر بھر کی خدمات کو بھی نظر میں رکھیے۔

دوستوں کے دوست تھے اور دشمنوں کے دشمن۔ جسے دوست کہتے تھے اس کا گن گان مبالغے کی حد تک کرتے تھے۔ حکیم منظور اور اندر سروپ دت نادان کی شاعری کی کتابیں اہتمام سے چھپواتے تھے۔ میں مانتا ہوں، میری معمولی عقل و فہم کی کسوٹی پر ان کے بہت سے ادبی تاثرات کھرے نہیں اترے مثلاً حکیم منظور کی بات، اندر سروپ دت نادان کی بات یا شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے بارے میں ان کی رائے۔ لیکن ان کی یہ کھری کھوٹی جو بھی ہو، رائے تھی اور تب مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ میں ان سے الجھتا۔ اور اگر آج بھی وہ میرے سامنے اپنی ان رایوں کا اعادہ کریں تو میں ان سے نہیں الجھوں گا۔ اب جان گیا ہوں۔ ان کی خوبیاں اور ساتھ ساتھ ان کی کمزوریاں بھی۔

عمر کے آخری پڑاؤ میں، جو گرچہ وقت سے بہت پہلے آ گیا تھا، وہ اردو ادب سے ایک ذرا کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مطلب یہ کہ اب ویسی سرگرم دلچسپی نہیں رہ گئی تھی جیسی کہ پچاس سال تک رہی۔ کوئی رسالہ ان کے پاس آ جائے تو بتاتے تھے۔ محمود ایاز نے سوغات (دور سوم) کے اولین دو تین شمارے بھجوائے تو مجھے بتایا۔ دراصل وہ محمود ایاز کے قدر داں تھے۔ بتایا کہ محمود ایاز نے 1967 میں جدید نظم نکالا تھا جس نے اردو میں جدید نظم کے رجحان کو مستحکم کیا۔ بتایا کہ میری بھی نظمیں بڑے اہتمام سے چھاپیں اور تبھی سے میں نظم کی طرف سنجیدگی سے راغب ہوا۔ اس سے پہلے وہ غزل کہتے تھے اور بیشتر کلاسیکی انداز کی۔ بتایا کہ نیاز فتحپوری صاحب نے ان کی غزلیں چھاپیں۔ اس زمانے کا کلام محفوظ نہیں رکھا۔ وہ جدیدیت کو لبیک کہنے والوں میں نہیں تھے۔ اگرچہ اس کی تخلیقی تازگی و توانائی کے رجحان سے استفادہ کیا۔ میں نے انھیں جدیدیت کے مقابلے ترقی پسندی کا ہمنوا زیادہ پایا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ جدید شاعر تھے۔ راز صاحب جدید تھے، لیکن مثال کے طور پر وہ کمپوزیشن سیریز کے افسانے لکھنے والے بلراج مین را جیسے جدید نہیں تھے۔ ان کی ایک نظم ہے کمپوزیشن 203:

گھول کے پانی میں رنگوں کو/ میں نے پھیلایا کاغذ پر/ گندم لی ایک مٹھی بھر/ کاغذ پر پھیلایا اس کو/ پھر کاغذ کو دھوپ میں رکھا/ سوچا اب چڑیاں آئیں گی۔ ان کے پنجوں اور چونچوں سے/ نقش نو یلے بن جائیں گے/ لو تیار ہے کمپوزیشن/ نمبر دو سو تین ہے اس کا۔

اس نظم کے بارے میں بتایا کہ یہ انھوں نے بلراج مین را کی ان نا قابل فہم کہانیوں کے مضحکہ کے طور پر لکھی تھی۔ وہ ترقی پسندوں کے بھی غیر مشروط ہمنوا نہیں تھے۔ موٹے طور پر یوں سمجھیے کہ سخن فہم تھے، طرفدار نہیں۔

عمر کے آخری پڑائو میں، جو گرچہ وقت سے بہت پہلے آگیا تھا، وہ اردو ادب سے ایک ذرا کنارہ کش ہوگئے تھے۔ مطلب یہ کہ اب ویسی سرگرم دلچسپی نہیں رہ گئی تھی جیسی کہ پچاس سال تک رہی۔

آخری بار! آخری بار 5 نومبر 1998 کی سہ پہر، ڈھلتے دن کی بیلا میں، میں راز صاحب سے ملنے گیا۔ گھر بھرا ہوا تھا۔ گہما گہمی یہ تھی کہ ان کے امریکہ جانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ میں اس وقت خوش کا گواہ!

کس حنا ہاتھ سے آنگن ہے معطر اتنا
وقت خوش: ساعت بیدار کہاں سے آئی

منظور صاحب انھیں اور ان کی اہلیہ کو لے کر پہلے گڑگاؤں اپنے گھر چلے جائیں گے اور کل وہاں سے انھیں ایئرپورٹ پہنچا دیں گے۔ اسی طرح پلان کے مطابق دو مہینے 28 دن کے بعد جب وہ لوٹیں گے تو حکیم صاحب انھیں اتار کر اپنے گھر لے جائیں گے، اگلے روز ان کے گھر پہنچائیں گے۔ جیسا کہ اس سے پچھلی بار ہوا تھا، اور جیسا کہ اس سے اگلی بار بھی ہوتا۔ یار زندہ رہتے، صحبت باقی رہتی۔

یہ سلسلہ ان کے بعد، ان دونوں کے بعد، آج بھی جاری ہے۔ مسز راز اب جب بھی امریکہ سے آتی ہیں یا جاتی ہیں، حکیم منظور صاحب کے صاحبزادے انھیں پہلے اپنے گھر لے جاتے ہیں پھر پٹیل نگر چھوڑتے ہیں اور واپسی میں پہلے اپنے گھر پھر اگلے دن ہوائی اڈہ پر۔ انسان فانی ہے مگر جو نیک قدریں وہ چھوڑ جاتا ہے، زندگی کے حسن و خیر پر ہمارے یقین کو تقویت پہنچاتی ہیں، مستحکم کرتی ہیں۔ ■

سلیم شہزاد

صحافتی زبان کے مسائل

اظہار خیال کے تین شعبوں، خطابت، صحافت اور ادب میں زبان کو وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ایک ہی ذریعے کو برتنے کے باوجود تینوں شعبوں کے مخاطبات آپس میں کوئی شناختی اشتراک نہیں رکھتے۔ زبان کے جدلیاتی تعملات یعنی تشبیہیں اور استعارے وغیرہ مذکورہ شعبوں میں معانی کی ترسیل کے ذرائع بنتے ضرور ہیں مگر خطابت کی تشبیہ، صحافت کی تشبیہ سے اور صحافت کی تشبیہ ادب کی تشبیہ سے مختلف معنویتوں کی حامل ہوتی ہے گویا یہ سیاسی تقریر، سیاسی خبر اور سیاسی افسانے کا مخاطبہ ہے جو یکساں صفتی پہلو رکھنے کے باوجود تقریر کو خبر سے اور خبر کو افسانے سے مختلف لسانی شناخت دیتا ہے۔ تقریر خطابت کی، خبر صحافت کی اور افسانہ ادب کی صنف ہے۔ اسی طرح مذکورہ تینوں اظہاری شعبے کسی معاشرے کی ثقافت سے رشتہ رکھنے کی وجہ سے اپنے اپنے ثقافتی تقاضوں کے بھی حامل ہوتے ہیں اور یہ معاشرے کی زبان ہے جو ان تقاضوں کو آپس میں ہم رشتہ بناتی ہے۔

خطابت، صحافت اور ادب کے یہ ثقافتی اور لسانی رشتے ڈاکٹر ظ انصاری کی شخصیت اور ان کے لسانی متون میں بڑے واضح طور پر اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ معاشرے میں ایسے افراد بہ شمار انگشت ہی پائے جاتے ہوں گے جنھوں نے مذکورہ شعبوں میں اہمیت کے حامل تفاعلات سے خود کو منوایا ہو۔ پھر کسی ایک شخصیت میں لسانی اظہار کے تینوں مخاطبوں کے اجماع کو تو بالکل منفرد وقوعے کہا جاسکتا ہے۔ ظ انصاری بیک وقت خطیب، صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے مختلف النوع نثری متون سے اپنے صاحب اسلوب ہونے کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ یہاں چونکہ لسانی اظہار کے تین بالکل انفرادی پہلوؤں کا مطالعہ مقصود ہے، اس لیے ان کی انفرادیت اور خصوصیات کے پیش نظر زبان کے بعض ان مسائل پر توجہ کا مرکوز ہونا لازمی ہے جو ظ انصاری کی تحریروں سے نمود کرتے نظر آتے ہیں۔

ظ انصاری کو اپنے اظہار پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ وہ خطابت کے وقت محض خطیب رہتے اور اخباری آدمی کے کردار میں ان کی زبان صحافتی مخاطبے سے ذرا انحراف نہ کرتی۔ اسی طرح کسی ادبی موضوع پر ان کی تحریر ادبی زبان کا حق ادا کردیتی تھی۔ ان سب سے قطع نظر ان کا اصلی رنگ تو وہ تھا جب وہ ہر کردار بیک لحمہ ادا کرتے نظر آتے تھے۔

'کانٹوں کی زبان (مطبوعہ 1987) ظ انصاری کی خالص صحافتی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں روزنامہ 'انقلاب' (ممبئی) کے ان کی ادارت کے زمانے میں لکھے گئے اداریوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ 'ورتے چند' کے عنوان سے مصنف نے اردو صحافت کے میدان میں اپنی آمد اور بعد کی صحافیانہ زندگی کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس تحریر کو جدید اردو صحافت کا تکنیکی خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے جس میں اس معاشرتی بیوہار کے مواصلاتی ذریعے کی کاغذی کارروائیوں سے لے کر خبر وغیرہ کی نشر و اشاعت تک کے مراحل سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف نے صحافت کے سماجی افادی پہلوؤں کے ساتھ مالی افادی پہلوؤں پر اس بحث میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے متعدد سوالات اٹھائے ہیں، مثلاً:

(1) صحافی اور اخبار کا نظریاتی تال میل کیا ہے؟
(2) کیا صحافتی متن کی کچھ لسانی اہمیت بھی ہوتی ہے؟
(3) صحافت اور ادب کے رشتے کی نوعیت کیا ہے؟
(4) اخبار میں روزمرہ خبروں کو اہمیت حاصل ہے کہ مدیر کا عصری اداریہ بھی کچھ اہمیت رکھتا ہے!
(5) اخبار کے ضمیر یعنی اس کی پالیسی اور ایڈیٹر کے ضمیر کا اخلاقی ربط کیا ہے یا کیسا ہونا چاہیے؟ وغیرہ کے جوابات میں ظ انصاری نے نہ صرف کلاسک اردو صحافت اور صحافیوں پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں بلکہ دیگر زبانوں، خاص طور پر انگریزی، عربی اور روسی وغیرہ زبانوں کی صحافت اور صحافیوں کی آرا اور میدان صحافت میں ان کی کارکردگیوں کو تقابلی تنقیدی مطالعے کا موضوع بھی بنایا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

''بیسویں صدی کے ابتدائی بیس بائیس برس اردو صحافت کے لیے اور اردو صحافیوں اور مدیروں کے لیے ویسی ہی اہمیت رکھتے ہیں جیسی انقلاب فرانس (1790) سے پہلے کے بیس سال کی عالمانہ تحریروں اور تصنیفوں کی یلغار یا ناکام انقلاب روس (1905) کے زمانے کی روپوش صحافت اور ادب کے ہماہمی کا زمانہ جب بلقان، روس و جاپان اور پہلی جنگ عظیم کی دو دہائیوں کی گرم فضا میں ہندوستانی سیاست کو گرماگرمی اور دیسی اخباروں خصوصاً اردو صحافت کو گرمی بازار نصیب ہوئی۔''

عبدالحلیم شرر کے اخبار 'مہذب' کے حوالے سے ظ انصاری بتاتے ہیں کہ:

''تین ہی اصول ہیں جن پر عام اخبارات کی تحریروں کا مدار ہے: پالیٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر۔ پالیٹکس کی حیثیت سے وہ اوّل درجے کا آزاد ہوگا، سوشل یعنی اخلاقی معاملات میں وہ رہنمائے ملک بن کر ظاہر ہوگا اور باقی رہا لٹریچر، اس حیثیت سے ملک والے 'مہذب' کے سارے وعدوں کو قبول کرلیں گے۔''

اپنے سوالوں کے جوابات اور صحافتی شعبے کے نشیب و فراز کے تذکرے میں ظ انصاری ابتدائی بیسویں صدی کی اردو صحافت کے فراز سے اپنے زمانے کی صحافت کے نشیب تک آتے ہیں۔ اس ذیل میں متعدد واقعی صحافیوں اور واقعی صحیفوں کے تعارف و تقابل کو بھی وہ سامنے لاتے ہیں۔ اخبار کی ظاہری ساخت و بافت کے

ساتھ انھوں نے اس کی باطنی صورت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اپنی کم مائگی اور کم رنگی کے سبب سے خاص طور پر آج کل کے اردو اخبارات معیار کی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کے اسباب موصوف کے نزدیک یہ ہیں:

(1) اداریوں اور مدیروں کی بے پروائی یا بے بسی یا بے عملی یا تینوں

(2) ہمارے اخبار پڑھنے والوں کو آگاہی اور باخبری کی اس سطح تک نہیں لے جاتے جہاں ملک کے دوسرے ترقی یافتہ اخبار ورسائل لے جاتے ہیں۔

ادارت، اداریہ اور مدیر وغیرہ کے مسائل کے ساتھ 'کانٹوں کی زبان' میں انداز بیان اور موضوع کے حوالے سے ظ انصاری اپنے بعض اداریوں میں جو اس کتاب میں 'ادبی' اداریوں کی طرح شامل کیے گئے ہیں، صحافت، صحافتی مخاطبے اور معاشرے میں ترسیل خیال اور علم و آگہی کے زاویوں سے اردو زبان و ادب کے بعض مسائل کو بھی چھیڑتے ہیں، مثلاً:

دوستوفسکی کے ناول 'ایڈیٹ' اور گورکی کے ناول 'ماں' کے انداز بیان کا فرق۔

روس اور امریکہ میں لکھے گئے ناولوں کا جغرافیائی فرق

تیمن چن کے ناول 'چینی گاؤں' اور شرر کے ناول 'ایام عرب' میں دو زمانوں کا فرق۔

یہ مسائل زبان کے اسلوب اور زمان و مکان کے بیان پر اسلوب کے اثرات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ظ انصاری دو فنکاروں کے مزاج اور زبان کے فرق کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر دونوں پر ان کے عصر اور زمانے کی تاثر آفرینی سے بھی انکار نہیں کرتے جس کی وجہ سے مزاجوں کے اختلاف کے باوجود ان کے فن میں بعض عوامل میں اشتراک نظر آتا ہے۔ آج کل کی تنقیدی زبان میں اس صورت کو عصری حسیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ ممکن ہے کسی بھی زبان کے فنکاروں پر صادق آسکتا ہو مگر علاقائی اور زمانی فرق بہرحال اتنا تاثر آفرین نہیں ہوتا کہ زمانی و مکانی فاصلوں کے باوجود روسی اور امریکی فنکاروں کے فنی اظہار میں کچھ باتوں کو مشترک کر دے۔ ہر زبان ایک مخصوص ثقافتی پس منظر کی حامل ہوتی ہے اور یہ پس منظر زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں پر اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ مثلاً محبت یا نفرت کے عام انسانی جذبات کو بھی روس اور امریکہ یعنی مشرق اور مغرب میں بہت حد تک مختلف رنگ دے دیتا ہے۔ اسی وجہ سے خیالوں، زبانوں اور لفظوں کے معانی میں اختلاف اور کثرت کے خواص پیدا ہوتے ہیں۔ ظ انصاری زمان و مکان کے ان فاصلوں کو اہم نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ اتنی بڑی دیوار نہیں ہے جو ایک ملک کے ادب کے انداز بیان کو دوسرے ملک کے رائج انداز بیان سے جدا کر سکے یا ایک عہد کے ادب کو دوسرے عہد کے ادب سے علاحدہ کر سکے۔"

یہاں 'کسی ملک کے ادب کے انداز بیان' کا تصور ہی لغو ہے، پھر ملکوں کے ادب کے اندازہائے بیان کا اختلاف مزید لغویت پھیلاتا ہے۔ یہی بات مختلف زمانوں کے ادب کے انداز بیان کے تعلق سے کہی جا سکتی ہے۔ ظ انصاری دراصل مارکسزم کی حمایت میں قضیہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ادبی انداز بیان کے تاریخی اور جغرافیائی فاصلوں کو درمیان لاکر وہ الجھ گئے ہیں اور فوراً ہی انھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ دوستوفسکی اور گورکی اور اہرن برگ اور مام اور تیمن چن اور شرر کے انداز بیان ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، کیوں الگ ہیں! جواب میں وہ کہتے ہیں کہ انھیں جانچنے تولنے کا نظریہ الگ ہے۔ یہ کہہ کر وہ ایک اور سمت نکل گئے ہیں کہ نطشے، مارکس اور گبن وغیرہ نے تاریخ اور معاشیات کے موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی بھی ایک ادبی حیثیت ہے مگر ان کا علوم کے تحریری متن کو ادبی متن سمجھنا اور کہنا محل نظر ہے۔ ظ انصاری مارکس اور اینگلز کے لکھے کی زبان کا ایک انداز بیان تو غلط نہیں بتاتے مگر ان کا یہ کہنا کہ اس انداز نے دنیا کی زبانوں کو متاثر کیا ہے، سوال انگیز ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ انداز، انداز بیان اور موضوع اور فکر وغیرہ کے تصورات ان کے یہاں علمی اصطلاحی معنی نہیں رکھتے۔ کبھی کبھی وہ موضوع اور اظہار کے سانچوں کو بھی انداز بیان سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس جائزے سے ظ انصاری کے خطیبانہ، صحافیانہ اور ادیبانہ مخاطبوں کی درج ذیل مثالیں سامنے آتی ہیں:

خطیبانہ: مارکسزم کی نئی تحقیق کم و بیش سو برس سے زندگی کے ہر شعبے میں سوچنے والے ذہنوں کو جھنجھوڑ رہی ہے اور اس نے ہر موضوع پر سوچنے کے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی ہے۔

صحافیانہ: یورپ کے آخری ساحل سے لے کر کوریا کے شمالی نقطے تک مارکسزم کے اثر سے پیدا ہونے والے مختلف زبانوں اور مختلف ذہنوں کے ادب میں بہت کم فرق ہے۔

ادیبانہ: جدلیاتی مادیت کے فلسفے نے بیان میں عبارت آرائی، لفظی شعبدہ بازی اور گلکاری کو کانٹنا چھانٹنا شروع کر دیا ہے اور اس کی جگہ واضح، سادہ، منطقی اور طاقتور انداز بیان کی اہمیت تسلیم کرا دی ہے۔

یہ مثالیں مارکسزم کے حاوی موضوع کا احاطہ کرتی ہے اور ان سے ایک ہی اداریے میں شامل ہونے کے باوجود ظ انصاری کے اس اسلوب کی نشان دہی ہوتی ہے جس کے تحت وہ متن ساز کی حیثیت سے مختلف مخاطبوں کو ایک مخلوط لسانی تعمل بنا دیتے ہیں۔ 'ذہنوں کو جھنجھوڑ رہی ہے' (خطیبانہ)، 'یورپ سے کوریا تک' (صحافیانہ) اور 'عبارت آرائی/لفظی شعبدہ بازی/منطقی انداز بیان' وغیرہ (ادیبانہ) لفظیات ان مثالوں میں مخاطبے کی حاصل ہے۔

اداریہ بعنوان 'لفظوں پر کچھ لفظ' میں ظ انصاری کہتے ہیں:

اردو الفاظ کے استعمال، تلفظ، ان کے بدل اور ان کے معانی و مفہوم کے تعلق سے مختصراً کچھ کہنا ہے۔

اظہار مدعا کے بعد اداریہ نگار نے الفاظ 'اثر، روایت، موقف، وقف، جدوجہد' اور دو ناموں 'تاناشاہ' اور 'تکا خاں' کی زبان میں روزمرہ کے طور پر قبول اور استعمال کیے جانے پر بحث کی ہے اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ کی کثیر معنویت کا تصور کوئی واقعی آج کا یا مابعد جدیدیت کا لایا ہوا تصور نہیں بلکہ اردو کے ماہرین اس پر پہلے ہی خیال آرائی کر چکے ہیں، بس یہ کہ انھوں نے اس تصور کو نظریے کے طور پر متعارف نہیں کرایا۔

'اثر' کے مادّے سے حاصل ہونے والے بہت سے اشتقاقی لفظوں مثلاً آثار، اثرات، تاثر، تاثیر، مؤثر، مؤثر اور متاثر وغیرہ کی کثیر معنویت کو ظ انصاری نے اشعار سے ظاہر ان کے معانی سے واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک لفظ کے معنوی پرتو سے متاثر ہوکر استعمال میں آنے والے دوسرے مترادف الفاظ کی بھی بحث اٹھائی ہے یعنی لفظ 'اثر' کو بھی صحافت اور خطابت میں (ظ انصاری کہتے ہیں، ہمارے ادب میں Reaction کا ترجمہ کرکے 'ردعمل' لکھا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں:

ردعمل برا لفظ ہے۔ Re کو 'رد' لکھ کر زبان کا مزہ بگاڑا تھا یار لوگوں نے۔ 1930 کی اردو میں یہ لفظ نہیں ملے گا۔

Re اور رد کے معنوی فرق کے شعور سے واضح ہے کہ زبان کا مزہ کیا ہوتا ہے اور کیسے لیا جاتا ہے۔ ظ انصاری لفظ 'اثر' کے معنوی تاثرات کی مثالیں بھی فراہم کرتے ہیں مثلاً 'اثر' بمعنی 'نقش/تصویر/مورتی/ دوا اور دعا کی تاثیر/ ایک شخص یا چیز کا دوسرے شخص یا چیز پر بہاؤ' وغیرہ۔

انگریزی کے اثر اور ترجمے کے چلن کے تحت نئے گھڑے جانے والے لفظوں کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ہم

نے نئے نئے لفظ گھڑے اور:

''اچھے خاصے لفظوں کے آدھے چوتھائی معنی کو پورے لفظ کے اوپر چڑھا دیا، اس کی مثال ہے لفظ روایت''

یہ بھی انگریزی لفظ Tradition کا ترجمہ ہے۔ انگریزی Tradition اور اردو/ فارسی/ عربی روایت کے معنوں میں ترادف کا بس شائبہ نظر آتا ہے، دونوں کا ایک دوسرے پر انطباق نہیں ہوتا۔

ظ انصاری Tradition کے متعدد معانی بتاتے ہیں یعنی وہ بات جو سینہ بہ سینہ چلتی ہو، نقل در نقل پہنچتی ہو جیسے حدیث رسول کو انہی معنوں میں Tradition کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کی معنوی پرتوں میں معنی کے دوسرے متعدد شائبے ملتے ہیں مثلاً 'اگلوں کا چلن، رواج، دستور اور قصہ، کہانی، بیان وغیرہ Tradition لاطینی لفظ Tradere سے بنا ہے جس کے معنی عقیدے اور عمل کا نسل در نسل پہنچنا ہے۔ اسی سے لفظ Trade بھی بنا ہے جو اپیچنی اور پست والی جرمن سے گزر کر انگریزی تک پہنچا ہوا ہے اور اس کے معنوں میں عقیدہ و عمل کی جگہ 'تجارتی لین دین/ خرید وفروخت' کی سمائی ہوگئی ہے۔'' (بحوالہ آکسفرڈ اشتقاقی لغت)

لفظ 'روایت' اب اپنے ترجمہ شدہ معنوں میں اس قدر چل چکا ہے کہ آج اکیسویں صدی کے پندرہ برس گزر جانے پر اس لفظ کے تعلق سے ظ انصاری کا قضیہ ماضی کی چیز ہی کہلائے گا۔ الفاظ 'موقف' اور 'پوزیشن' کا بھی یہی حال ہے۔ پھر الفاظ کے گذشتہ و حالیہ معنوں میں فرق آجانا لازمی امر ہے۔ ایک لفظ بیس پچیس برس پہلے جن معنوں میں مستعمل تھا، ضروری نہیں کہ آج بھی انہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہو۔ زمانے کی گزران کے ساتھ بدلتے رہنا تو لفظوں اور ان کی کلیت یعنی زبان کی فطرت ہی ہے۔ 'موقف' کی طرح اس کے اشتقاقی ساختیوں 'اوقاف/ وقف/ موقوف' وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ ایک لفظ کے معنی دو شعبوں میں یکساں ہی ہوں۔ اگر 'اوقاف' کے اسلامی شرعی معنی 'ایک قسم کی جائیداد' ہیں تو قواعد میں اس کے معنی عبارت میں استعمال کی جانے والی مختلف علامات کیوں نہیں ہو سکتے۔

خطیب اور ادیب ہونے کی وجہ سے ظ انصاری لفظوں کے تلفظ پر بھی خیال آرائی کرتے ہیں۔ لفظ 'جدوجہد' پر ان کی بحث سے عیاں ہے کہ وہ عربی کے روایتی تلفظ کی حمایت میں تھے اگرچہ بالضرورت وہ 'جدوجہد' کی جگہ انگریزی Struggle اور ہندی، سنگھرش بولنے کی بھی حمایت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''اردو اپنی بولی میں بازار کی زبان ہے۔ بازار میں چلنے والا ہر ایک سکہ اسے قبول ہے۔ جب یوں ہے تو Crisis کے معنی میں صرف 'بحران' کیوں لکھیں۔ کہیں وہ بحران ہوگا اور کہیں سنکٹ اور کہیں توڑ کا وقت۔''

'توڑ کا وقت' سے ظ انصاری کی مراد کیا ہے، کچھ کھلتا نہیں (ممکن ہے کہ کسی مخصوص صحافتی سیاق میں یہ فقرہ بولا جاتا ہے) مگر Crisis کی لفظ اصل بتاتی ہے کہ یہ کسی مرض کی مختلف حالتوں میں تبدیلی کا وقت اور کسی واقعے کا وہ نقطۂ عروج ہے جب ایک فیصلے پر پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔ گویا Crisis یا بحران ہم جن معنوں میں استعمال کرتے ہیں، وہ اپنی اصل سے کچھ خاص ربط نہیں رکھتے۔

لفظ 'سنگھرش' کے تحت ظ انصاری کہتے ہیں کہ:

''یہ لفظ ہنگامہ خیز معرکوں اور سخت تاتنی کے لیے بھی استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ اپنی آواز سے پورے معنی ظاہر کر دیتا ہے۔''

آواز سے معنی کا اظہار صوتیات اور معنیات کا ایک نظریہ ہے (ویسے دیکھا جائے تو زبان کے معانی، آوازوں ہی سے پیدا ہوتے ہیں) ظ انصاری سے پہلے یعنی 1985 تک یہ بات اردو لسانیات میں لسانی اصول کے طور پر عام نہیں ہوئی تھی۔ ظ انصاری نے بھی اسے کسی لسانی نظریے کی طرح نہیں پیش کیا ہے مگر یہ ان کا لسانی شعور یا کہنا چاہیے کہ زبان کا مزہ لینے کا شعور تھا جو مختلف زبانوں کے لفظوں کی صوتی خصوصیات سے ان کے معانی اخذ کر لینے پر قادر تھا۔

بعض الفاظ محض اپنی آوازوں کے بل پر خاص معنی دینے لگتے ہیں۔

یہ صورت معنوی نظریہ دہرا کر ظ انصاری دو اصطلاحی لسانی ساختوں 'تانا شاہ' اور 'تکّا خان' کے صحافتی اور عام زبان میں ان کے استعمال کی وضاحت کرتے ہیں:

''بی بی سی والے احباب ظلم وستم، جبر، زبردستی کو تاناشاہی اور ڈسپوٹک کو تاناشاہ بولتے ہیں، یہ بجائے خود ایک اتیاچار ہے۔''

آگے اداریہ نگار 'تاناشاہ' کی تاریخی اصلیت بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک نجیب الطرفین سید زادہ گولکنڈہ کا حاکم، شاعر، فنون کا دلدادہ، عوام پسند لیکن نازک مزاج بادشاہ تھا وغیرہ۔ 'تاناشاہ' کی لفظ اصل انھوں نے یہ بتائی ہے کہ یہ لقب موسیقی کی تان اور 'تنہ نا' سے چل پڑا لیکن واقعیت یہ ہے کہ لفظ 'تانا' دکن کی بولی میں آج بھی 'ننھے' کے معنوں میں مستعمل ہے۔ بادشاہ کی نازک مزاجی نفاست پسندی اور کہتے ہیں کہ بچوں کی سی ضدی طبیعت نے اسے 'تانا' کا لقب دیا۔ ظ انصاری کا خیال ہے کہ انہی خصوصیات کی وجہ سے:

اس کی آزادہ روی پر یہ محاورہ گواہ ہے: تانا شاہ دیوانہ جس کی چٹھی نہ پروانہ

عرض ہے کہ تکنیکی لحاظ سے یہ محاورہ نہیں، ضرب المثل یا کہاوت ہے۔ ظ انصاری لکھتے ہیں کہ تاناشاہ کو ظلم اور اندھیر گردی سے منسوب کر دینا یا تو نادانی اور بے خبری ہے یا زبان کے ساتھ تاناشاہی۔

پھر وہ اس اصطلاح کے وجود میں آنے کی قیاسی تاریخ بیان کرتے ہیں کہ ممکن ہے 'نادر شاہی' کی جگہ کسی نے تاناشاہ لکھ دیا اور یہ اصطلاح چل پڑی ہو لیکن زبان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اردو میں بے شمار لسانی تعملات ایسے ہیں جن کے معانی تو زبان میں معروف ہیں لیکن لفظ و معنی آپس میں دال اور مدلول کا رشتہ نہیں رکھتے مثلاً ایک قرآنی جملہ جو اردو نظم ونثر میں خوب استعمال ہوتا ہے یعنی 'لن ترانی' جس کے معروف معنی 'غرور کرنا/ اکڑنا' وغیرہ ہیں، ان معنوں کا 'لن ترانی' کے ترجمے (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) سے بھی کوئی تعلق نہیں دکھائی دیتا۔

اس طرح ظ انصاری 'تکّا خاں' کے تعلق سے کہتے ہیں:

''تکّا خاں ایک فوجی جنرل تھا، قطعی غیر سیاسی اور سادگی پسند سپاہی مگر جو تکّا بوٹی اس کے عہد میں ہوئی، اس کے باعث تکّا خاں ایک بوچر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس میں لفظ 'تکّا' یا 'تکہ' کا ہاتھ ہے۔''

'تکّا خاں' اور 'تکّا بوٹی' میں کم از کم ایک لفظی اشتراک ضرور ہے جس نے اردو میں ایک نئے لسانی ساختیے کا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح ظ انصاری کا خیال ہے کہ:

''لفظ 'تانا' نے 'تانتے اور طعنے' کے ہم آواز ہونے کے مغالطے میں یہ صورت اختیار کر لی ہو۔''

اور تکّا خاں اور تکّا بوٹی کی لفظی مماثلت کی طرح 'تانا اور طعنہ' کی صوتی مماثلت نے تانا شاہ کا ایک نیا لسانی ساختیہ بنا دیا ہو۔

ایک اداریے بعنوان 'عربی اور کاشی پوجا' میں ظ انصاری اردو رسم الخط کا مسئلہ اٹھاتے ہیں جس میں ایک جگہ انھوں نے رسم خط کی تاریخ کو Philology کہا ہے جو غلط ہے۔ رسم خط کی تاریخ کو Graphology کہتے ہیں اور فلولوجی تاریخی لسانیات کا نام ہے۔ اسی جگہ انھوں نے اردو کو ہندی کی شیلی (طرز یا انداز) بھی کہا ہے جبکہ یہ نام نہاد ہندی والوں کا دعویٰ ہے کہ اردو کسی ہندی کا ایک اسلوب ہے، اپنے آپ میں زبان نہیں۔ ویسے عصری لسانی مطالعات میں دونوں زبانوں پر طول طویل مباحثوں

نے ثابت کردیا ہے کہ اردو دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی کی پیشرو ہے۔ اس ہندی کو فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں ڈھالا گیا تھا، اردو کی ٹکسال شاہی قلعوں اور مدرسوں سے لے کر بازاروں تک پھیلی ہوئی ہے۔

اداریہ نگار کا قضیہ یہ ہے کہ اردو عربی رسم الخط میں لکھی جانے کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے ربط رکھتی ہے اس لیے اردو مخالف گروہ کے خیال میں اس کا تحریر نقش بدل دینا چاہیے۔ مذہبی تعصب کے ساتھ یہ زبان اور اس کی تحریر سیاسی تعصب کا بھی شکار ہے۔ ظ انصاری کہتے ہیں کہ مہاراشٹر میں شیوسینا کی مراٹھی گردی نے بازاروں میں آویزاں تجارتی بورڈوں، گلی محلوں کے ناموں کی تختیوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر شہروں کے ناموں کی فہرستوں سے اردو ناموں کو ختم کردیا ہے مگر:

''اب ان بڑے بڑے شہروں اور مہنگے بازاروں میں نئے رئیسوں کی آمد شروع ہوئی۔ جابہ جا عرب گھومنے لگے۔ ایک روپے کی چیز چار میں خریدنے اور دس کی جگہ سو کا نوٹ پھینکنے لگے تو دکان داروں، دلالوں، پیشہ وروں کی چاندی ہوگئی ہے اور پہلی چیز جو اس چاندی کے ساتھ چمکی، وہ 'قرآن کے حروف میں' عربی کے سائن بورڈ تھے۔''

لکشمی دیوی کی مسکراہٹ کی وجہ سے سارے دکاندار اور تاجر اب روپے کو ماتھے سے لگاتے اور اپنی دکانوں پر عربی بورڈ کے علاوہ اور اشتہار لگاتے پھر رہے ہیں۔ مصنف کے مطابق:

''یہ بھی ایک آواگون ہی ہوا کہ اردو نے اپنا قلب بدل کر عربی حروف میں نیا روپ لیا۔''

یہ ہے جادو جو سر چڑھ کر بولے اور یہ مایا کا نہیں سرمائے کا کھیل ہے کہ جن اردو حروف کو مخالفین نے دیس نکالا دیا تھا، وہی حروف اب عربی روپ میں ان کی تجارتی کوٹھیوں کے ماتھے پر چسپاں ہوگئے ہیں۔

اردو کو ہندیانے کی ایک بڑی مثال ظ انصاری کے اس اداریے میں بھی بحث کا موضوع بنی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

''بی بی سی لندن والے ہندی کو ہندوستان سے اور اردو کو پاکستان سے نتھی کیے بغیر نہیں مانتے۔''

چونکہ معاملہ لندن یعنی انگریز کا ہے اس لیے یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ فورٹ ولیم کالج کی متعصب لسانی سیاست یہاں بھی اور اب بھی کام کررہی ہے کہ دو زبانوں کو دو مذہبوں سے جوڑ دو۔ اداریے کے مطابق اگر دریائے راوی کے اس پار اور اس پار اردو زبان کے لب و لہجے میں فرق آگیا ہے اور علاقائی زبانوں کے اثر سے اردو کے دو روپ سے ہوگئے ہیں (اور ایسا ہونا غیر فطری بھی نہیں) لیکن صحافتی، ادبی اور تعلیمی زبان کا معیار بہرحال دونوں خطوں میں اردو کے لیے ایسا کچھ بدلا ہوا نہیں ہے۔ دونوں طرف کلاسک زبان اور ادب کے نام پر میر و سودا اور 'سب رس' اور 'خطوط غالب' ہی طلبا کو اردو تہذیب و ثقافت سے متعارف کراتے ہیں۔ بقول اداریہ نگار:

''عام ہندوستانی اردو، ہندی یا انگریزی کے پرچلت لفظوں سے خار نہیں کھاتا۔ سیوا، خدمت اور سروس/ مسافر، یاتری اور پسنجر تین تین لفظ ایک ساتھ چل رہے ہیں۔''

اخبار اب صرف خبر یا آگہی پہنچانے یا سماجی صورت حال پر اداریہ لکھنے یا تبصرہ کرنے تک محدود نہیں۔ صارفیت اور اشتہاریت نے اس پر اپنی گرفت سخت کررکھی ہے، بالخصوص متعصب سیاسی حلقوں کے زیراثر اخبار اب مخصوص افراد کی زبان بولنے لگے ہیں۔ ایسے میں یہ توقع کرنا کہ صحافی، اداریہ نگار، خبرنگار، مبصر، مشتہر اور مالی منفعت پر نظر رکھنے والا صحافتی صنعتی ادارہ (مالک، مدیر، طابع، ناشر وغیرہ) اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے ذریعے نشر کیے جانے والے لسانی متن کو نک سک سے درست رکھنے پر توجہ دے گا، فی زمانہ یہ ممکن نہیں نظر آتا۔

یہ بھی معاشرے کی زبان کا رنگ ہے اور میڈیا اس سے خود کو بچا نہیں سکتا چنانچہ معیاری، بازاری اور اخباری زبان کو اردو کے تین مختلف مخاطبے سمجھنا بیجا نہیں۔ ایک ہی زبان کے مختلف لب و لہجے، اسالیب یا مخاطبوں کو زبان کے ایک اصول کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ زبان کا ہر مخاطبہ اور اس کا علاقائی لب و لہجہ اس کی معیاری ساخت ہی کی طرح اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس تعلق سے ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کی زبان کو انھی تک محدود سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ سننے اور دیکھنے والے عوام اس زبان کا بھی خاصا اثر قبول کرلیتے ہیں۔

صحافتی زبان کے اپنے مسائل ہوتے ہیں جو اخبارات سے جڑے ہوئے صحافیوں کی زبان سے پیدا ہوتے ہیں پھر اخباری متن چونکہ زبان کے عارضی استعمال کی مثال ہے اس لیے عین خبر لکھنے کے لمحے میں لکھنے والے کو جو مناسب/ نامناسب لفظ/ فقرہ سوجھ جائے، وہ اپنی مقصد برآری کے لیے اسے خبر میں شامل کرلیتا ہے۔ ظ انصاری کی مثال لیں تو واقعی سیوا/ خدمت/ سروس وغیرہ مترادفات نے اخباری زبان کو عام لسانی ساخت اور استعمال سے مختلف شناخت دے دی ہے۔

صحافت کی تاریخ و تنقید پر تو اردو میں مواد مل جاتا ہے لیکن خیالات کی ترسیل و ابلاغ کے اس ذریعے کی زبان کے علمی مطالعے پر شاید ماہرین و ناقدین ویسی توجہ نہیں دے رہے جیسی دینی چاہیے۔ اردو صحافت کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہمارے کلاسیک صحافی جن کے ناموں کی فہرست خاصی طویل ہے، نہ صرف پختہ سماجی اور سیاسی شعور کے حامل افراد تھے بلکہ لسانی اور ادبی شعور کی پختگی بھی ان کا ایسا وصف تھی جسے برت کر انھوں نے اردو صحافت کو اس کی بالکل نوعمری کے زمانے میں ہندو مسلم ثقافتی نظریات کا مکمل نمونہ بنا دیا تھا۔ جیسے جیسے اردو معاشرہ ثقافتی، تعلیمی، لسانی، ادبی، سماجی اور سیاسی وغیرہ شعبوں میں پچھڑتا گیا، اس کی صحافت کی مذکورہ صفات بھی تنزل کے نشان کی طرف بڑھتی گئیں۔ عصری صورت حال میں جب اردو پڑھنے والے افراد پر متعدد معاشرتی اور معیشتی دباؤ بڑھ گئے ہیں، اخباری صحافت سے ان کا رشتہ کچھ یوں ہی سا رہ گیا ہے۔ آج اردو صحافت محض اردو صحافت بن کر نہیں رہ سکتی۔ ملک اور دنیا کی دوسری زبانوں کے خیالات کی شدید تاثر آفرینی اس کے رنگوں میں اضافے کررہی ہے اور ایسی تبدیلیاں لارہی ہے جن کی وجہ سے صحافتی مخاطبے کا ماحول انیسویں بیسویں صدی کے ماحول سے یکسر مختلف لسانی تناظر میں ابھر رہا ہے۔

صحافت طباعتی اشاعتی صنعت میں تبدیل ہوچکی ہے۔ اخبار اب صرف خبر یا آگہی پہنچانے یا سماجی صورت حال پر اداریہ لکھنے یا تبصرہ کرنے تک محدود نہیں۔ صارفیت اور اشتہاریت نے اس پر اپنی گرفت سخت کررکھی ہے، بالخصوص متعصب سیاسی حلقوں کے زیراثر اخبار اب مخصوص افراد کی زبان بولنے لگے ہیں۔ ایسے میں یہ توقع کرنا کہ صحافی، اداریہ نگار، خبرنگار، مبصر، مشتہر اور مالی منفعت پر نظر رکھنے والا صحافتی صنعتی ادارہ (مالک، مدیر، طابع، ناشر وغیرہ) اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے ذریعے نشر کیے جانے والے لسانی متن کو نک سک سے درست رکھنے پر توجہ دے گا، فی زمانہ یہ ممکن نہیں نظر آتا۔

■

Saleem Shahzad
323, Mangalwar Ward
Malegaon - 423203 (Maharashtara)
Mob.:09890331137

اتساہی بیکل!

امتیاز رومی

اتساہ سے لبریز بیکل نے جب 'نغمہ وترنم' کا راگ الاپا اور کومل مکھڑے نے بیکل گیت سنائے تب گاؤں کے باسیوں کو یقین ہو گیا کہ ''اپنی دھرتی چاند کا درپن'' ہے۔ 'لہکے بگیا مہکے گیت' کے ذریعے انھوں نے ہندی میں 'وجے بگل' بجایا۔ ''مٹی ریت اور چٹان' سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کرنے والے بیکل نے 'رنگ ہزاروں خوشبو ایک' سے اردو شاعری کو معطر کر دیا۔ جب 'پروائیاں' چلیں تو اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کھیتوں اور کھلیانوں میں تحلیل ہو کر 'موتی اگے دھان کے کھیت' کی صورت میں دیہات کو نایاب تحفہ دے گئی۔ توشۂ عقبیٰ، تحفۂ بطحا، نغمۂ بیکل، موج تسنیم، جام گل، نشاط زندگی اور نور کی برکھا وغیرہ ان کے اخروی سرمائے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیکل نے دین و دنیا میں بیک وقت سرخروئی حاصل کی۔ تاہم ان کی بدنصیبی یہ رہی کہ ان کے جیتے جی نقاد نے ان پر توجہ نہ دی۔ نیز وہ اس کے خواہاں بھی نہیں رہے۔ نام ونمود اور ادبی سیاست سے کوسوں دور رہے۔ ''میں تو ایک کسان .محنت اور لگن سے ادب کی دھرتی پر کشت قلم سے شعری فصل اگا تا رہا ہوں، یہ کبھی بھی نہیں سوچا کہ بازار نقد وتبصرہ میں کس بھاؤ میری گاڑھی کمائی جائے گی''[1] خیر غالب جیسا عظیم شاعر بھی اپنی زندگی میں اس سے محروم رہا۔ لمبے عرصے تک نظیر اکبرآبادی کو تو قابل التفات ہی نہیں گردانا گیا لیکن جب وقت کا غبار ہٹا تو یہ دونوں شاعری کی دنیا میں موضوعاتی واسلوبیاتی سرخیل ٹھہرے۔

لودھی محمد شفیع خان 1928 کو رموا پور، اترولہ تحصیل ضلع بلرام پور کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام لودھی محمد جعفر خان اور والدہ کا بسم اللہ بی بی تھا۔ بچپن سے ہی شعر وشاعری سے شغف تھا۔ سوشلسٹ تحریک سے جڑنے کی پاداش میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ محمد شفیع خان 1945 میں جب وارث پیا کی درگاہ دیوا گئے تو شاہ حافظ پیارے میاں نے کہا ''بیدم گیا بیکل آیا'' اسی وقت سے انھوں نے خود کو بیکل وارثی سے موسوم کر لیا۔ 1952 کو گونڈہ میں ایک انتخابی پروگرام ہوا جس میں جواہر لعل نہرو نے شرکت کی تھی۔ اس موقع پر بیکل وارثی نے اپنی نظم 'کسان بھارت کا' پیش کی تو نہرو جی نے کہا ''یہ ہمارا اتساہی شاعر ہے''۔ اس کے بعد سے ہی وہ بیکل 'اتساہی' ہو گئے۔ نہرو جی کا کہا صد فی صد صحیح نکلا۔ ملک و ملت کے تئیں جوان کا اتساہ اور جذبہ تھا وہ مرتے دم تک قائم رہا۔ 1976 میں بیکل اتساہی پدم شری ہو گئے۔ 1986 میں کانگریس نے ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں راجیہ سبھا کی رکنیت دی۔ 2015 میں انھیں یو پی کے سب سے بڑا ایوارڈ 'یش بھارتی' سے نوازا گیا۔ 3 دسمبر 2016 کو بیکل اتساہی نے سب کو بیکل چھوڑ دیا۔

بیکل ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ گنگا جمنی تہذیب کے روشن مینار تھے۔ وضع قطع میں صوفی مشرب اور حافظ ملت کے مرید خاص تھے۔ مذہب ومسلک کی سرحد سے بے نیاز ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ہم آہنگی کے حسین سنگم تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔ دوستی سب سے تھی مگر بیر کسی سے نہ تھا۔ زمین دار گھرانے سے تعلق ہونے کے باوجود مزدوروں اور کسانوں سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ دردمند دل سوز وگداز سے پر تھا۔ اردو کے دو عظیم شاعر اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی سے گہری وابستگی تھی۔ ان کی صحبت نے ان کے فکر وفن کو جلا ضرور بخشی تاہم تقلید سے محفوظ رہے۔ آٹھویں جماعت سے ہی جگر اور اصغر کی صحبت میسر تھی۔ 1944 میں انھوں نے اپنا پہلا کلام اصغر گونڈوی کو سنایا جس کا مطلع تھا:

نظاروں کے لیے ویرانہ جب آباد ہوتا ہے
جنوں میں اشتیاقِ دید بے بنیاد ہوتا ہے

بیکل اتساہی قدیم روایات کے امین اور جدید اقدار کے حامل تھے۔ تقریباً سات دہائی تک آسمان شعر وسخن پر جلوہ فگن رہے۔ اس دوران بے شمار غزلیں، نظمیں، نعتیں، دوہے اور گیتیں کہیں۔ ایک درجن سے زائد ان کے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنی طویل عمر میں اردو کی تین بڑی تحریکات ورجحانات کے وجود وعدم کو دیکھا۔ ان کے سامنے بہت سی تحریکیں عدم کو سدھار گئیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود کو ان سے وابستہ کیا اور نہ ہی

متاثر ہوئے۔ البتہ استفادہ ضرور کیا۔ بیکل کے ذہن وفکر نے ہمیشہ اردو کا راگ الاپا۔ اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی کوشش کی۔ جنگ آزادی اور قومی یک جہتی میں اردو کی شراکت کو واضح کیا:

گھرا طوفان میں جب بھی وطن، آواز دی میں نے
ہوئی انسانیت جب بے کفن، آواز دی میں نے
میں اردو ہوں، مجھی سے عظمت فصل بہاراں ہے
خزاں نے رخ کیا سوئے چمن، آواز دی میں نے

بیکل کے شعری سفر کے ہونٹوں پر بے پناہ تجربوں کا تبسم اور کڑواہٹ نظر آتی ہے۔ چونکہ انھوں نے غلامی کی زندگی، آزادی کی جد وجہد اور پھر آزاد ہندوستان کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ انگریزوں، زمین داروں اور ساہوکاروں کا ظلم بھی محسوس کیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری کسانوں، مظلوموں اور مزدوروں کی نقیب بن کر ان میں ہمت وحوصلے کا دیپ جلاتی رہی۔ جب وہ ایوان بالا میں پہنچے تو وہاں بھی ان کی فریاد رسی کی۔ بیکل نے بلا تفریق مذہب وملت کسانوں اور بے کسوں کی مسیحائی کی۔ ان کی بے جان آواز میں روح پھونک دی۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی اور بے ہنگم آواز کو سرتال دے کر نغمۂ سرمدی بنا دیا۔ اس طرح ان کی شاعری میں پورا ہندوستان جاگزیں ہوگیا۔ بیکل کی شاعری میں تخیل وتفکر کے مابین ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ فن امیجری بھی منتہائے کمال پر ہے۔ اردو کے ساتھ ہندی کے سبک الفاظ اس طرح مدغم ہیں کہ ان میں ایک طرح کی شیرینی پیدا ہوگئی ہے۔ فراق گورکھپوری رقم طراز ہیں:

''بیکل کے وہاں جن الفاظ کا تصرف ہے اس میں علامات کی بہتات کم اور خیال کا بہاؤ زیادہ ہے۔ ان کے فکر وفن میں کچھ اس طرح کی وابستگی ہے کہ کلام میں ہندی اور اردو کے حسین سنگم سے یکجہتی کا رنگ پھوٹ نکلا ہے۔ بیکل کی غزلوں میں بھی زندگی اور کائنات کے تمام محرکات موجود ہیں۔ زندگی اور سماج کے نازک رشتوں کے بنیادی اور افادی پہلوؤں کی تفسیر ہے۔ فن کے نئے معیار کی جمالیاتی اور فکری قدروں کے احساس میں جذباتی اور ذہنی عناصر کی رنگ آمیزی ہے۔ نئے عنوان، ندرت اور ہیئت کے حسین تجربوں کی فنی حیثیت کا تعین ہے۔ روایتی قدروں کے صالح عناصر کو اس رنگ سے استعمال کیا ہے کہ شعری شعور میں افادی پہلو اور تفہیم کی جلوہ گری معلوم ہوتی ہے۔ رومان اور فکر کے دونوں پہلوؤں کو آئینہ بنا کر زندگی کے خوش رنگ خاکے بنائے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ پہلے شاعر ہیں کہ جس نے فن امیجری کو صحیح اور پر معنی صرف کیا ہے۔ ابہام کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ فرسودہ طلسم کو توڑ دیا۔ تمثیلی اعجاز کا حسین راستہ تراشا، موسیقیت اور جمالیاتی پہلوؤں پر توجہ دی۔ اگر ان کا کلام رہ گزار شاداب کہا جائے تو ان کے گیت اور غزلیں رہ گزار حیات میں منزل نو کے امین بن سکتے ہیں۔''[2]

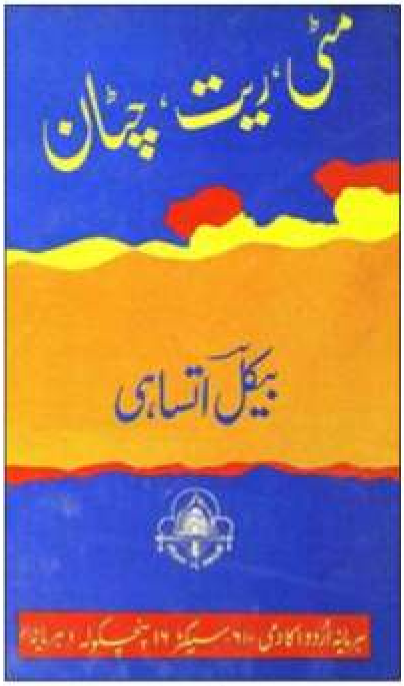

بیکل نے شاعری کے تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ تاہم وہ بنیادی طور پر نظموں اور گیتوں کے شاعر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی غزلیں بھی بہت دل کش ہیں۔ انھوں نے غزل کے حسن وعشق اور تقاضے کا لحاظ رکھتے ہوئے عصر حاضر کے مطالبات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ زمانے کی نیرنگیوں اور نت نئے مسائل نے غزل میں حسن وعشق کے ساتھ ساتھ ان مسائل کو بھی سمونے کی کوشش کی جن سے غزل کا دائرہ وسیع ہوا۔ بیکل نے اردو غزل کی رائج لفظیات سے انحراف کرکے ایک نیا رنگ وآہنگ بخشا۔ غزل کی نازکی اور شائستگی کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے زبان کی سطح پر بھی تجربہ کیا۔ عربی وفارسی الفاظ کی جگہ خالص ہندی کے سبک وشیریں الفاظ کو شعوری طور پر استعمال کیا اور انھیں ہندی تہذیب سے ہم آہنگ کرکے دوآتشہ بنا دیا۔ ''بیکل صاحب نے اپنی غزلوں اور گیتوں میں صنف غزل کی رائج لفظیات کے بجائے عوامی کہاوتوں اور لوک روایت سے لفظیات اور ترکیب کشید کی ہیں، ان کو بیکل صاحب کی انفرادیت کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور خود غزل کے نئے لہجے کی پہچان کے طور پر بھی''۔[3] بیکل نے غزل کو گیت کا رنگ وروپ دے کر اسے ایک دیہی حسن بخشا ہے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کے استعمال سے اشعار میں حسن اور نغمگی دونوں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کو دو قالب اور ایک جان قرار دیا ہے اور اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ذیل کے اشعار دیکھیں:

ان دونوں کی ایک ہی ماں ہے دو قالب ہیں ایک ہی جاں ہے
پھر بھی اردو کو ہندی کی لوگ کہیں سوتیلی ہے
میری زباں ہر دل کی زباں ہے کومل کومل حسن بیاں ہے
برسوں تک یہ خسرو کی انگنائی میں کھیلی ہے
اس کا لہجہ چنچل چنچل روپ کا درپن جیوت کی جھل جھل
میری غزل کی بحر نہ دیکھو یہ تو میر کی چیلی ہے
آگئیں یاد کٹھور کی بتیاں برسے نین دھڑک گئیں چھتیاں
پردیسی اب بھیج دے پتیاں برہن آج اکیلی ہے
طنز کی تیغ مجھی پر کبھی کھینچے ہوں گے
آپ جب اور مرے اور نکیلے ہوں گے

بیکل اتساہی چونکہ گاؤں کے اس ماحول کے پروردہ ہیں جہاں کبیر، تلسی، جائسی اور نظیر اکبرآبادی کی نظمیں لوگوں کی زبان زد تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ان کی شاعری کانوں میں رس گھول جاتی۔ چنانچہ ان کی نظمیں، دوہے اور کویتائیں بیکل کی سائیکی کا حصہ بن گئیں، جو لاشعوری طور پر شعری سفر میں ان کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں اور وہ ان ہی کی ڈگر پر چل نکلے۔ نظیر نے اردو شاعری کے موضوعات میں جو سیندھ لگائی تھی بیکل بھی اسی راہ سے اندر داخل ہوگئے۔ نظیر کے تعلق سے احتشام حسین کا یہ جملہ ''نظیر درحقیقت ایک اہم قومی شاعر اور مبلغ انسانیت پیامبر ہیں''۔[4] بیکل پر بھی ہو بہو صادق آتا ہے۔ ان دونوں نے حب الوطنی، قومی یک جہتی، ہندوستانی دیومالائی اور اساطیری عناصر کو کثرت سے موضوع سخن بنایا اور اردو شاعری کو تصویر گنگ وجمن کا آئینہ دار بنایا۔ مناظر فطرت، قومی ہم آہنگی، ہولی، دیوالی، رام، کرشن، نانک وغیرہ پر ان دونوں نے خوب نظمیں کہیں۔ بیکل کی ایک نظم 'دلی' ہے جس میں دلی کی پوری تاریخ وتہذیب سمٹ آئی ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ اور اتر پردیش کو بھی اپنی نظم میں بسا دیا ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی، سماجی اور لسانی روح تو گاؤں میں بستی ہے۔ جہاں کی صبح وشام میں مسجد کی اذانیں اور مندروں کے گھنٹے صاف سنائی دیتے ہیں۔ مختلف قسم کے رسم ورواج، گیت اور راگ راگنیاں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ کھیتوں میں لہلہاتی فصلیں، باغیچوں میں تناور درخت اور ندی تالاب فطرت کی چغلی کھاتے ہیں۔

مگر اس کے باوجود بہت سے شعرا کو ان میں حسن نظر نہیں آتا۔ وہ ان سے نظریں چرا کر نکل جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید نقادوں کی سرد مہری رہی ہے۔ چونکہ اس طرح کے موضوعات برتنے والے شعرا کو عوامی یا بازاری کہہ کر انھیں ادب میں کوئی مقام نہیں دیا جاتا۔ اس لیے شعوری طور پر وہ ان موضوعات سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ تاہم بیکل کی حساس طبیعت نے نام و نمود کی پرواہ کیے بغیر ان بے جان موضوعات کو از سر نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لیے انھوں نے غزل کے علاوہ نظموں اور گیتوں کا

''بیکل کی زنبیل میں اودھی اور برج کے گیتوں کا، دوھوں اور چوپائیوں کا، بھوجپوری، پدو، کبیتائوں کا ایسا رنگ برنگا خزانہ ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ ان کی طلب میں گائوں گائوں نہیں پھرے، اسے پیشہ نہیں بنایا، پبلسٹی نہیں کی، یہ گیت ان کی طلب صادق دیکھ کر خود ہی آئے، زنبیل بھرتے گئے۔

سہارا لیا اور اردو زبان کو کسانوں، کھیتوں، کھلیانوں اور جھوپڑیوں میں بسا دیا۔

یہ شہر کے باسی کیا جانیں کیا روپ ہے گاؤں کے پنگھٹ کا
کیا عشق ہے لاج کی الہڑ کا کیا حسن ہے موہ کے نٹ کھٹ کا
شرمائی سی ماتھے کی بندیا اٹھلائی سی پاؤں کی پائلیا
السائی سی آنکھوں میں نندیا بے سدھ وہ سرکنا گھونگٹ کا

بیکل دیہی جمالیات کے شاعر ہیں۔ جو کھیت کھلیان، رسم و رواج اور لوک کہاوتوں کو شعری پیکر میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں گاؤں کا تصور اتنا گہرا ہے کہ ان کی شاعری میں یہ لفظ ایک الگ حسن پیدا کر دیتا ہے۔ گاؤں کی کہاوتیں جیسے داہنی آنکھ کا پھڑکنا نیک شگون مانا جاتا ہے، اس کو کتنی خوبصورتی سے باندھا ہے:

رات بھر گاؤں دل کا سلگتا رہا زندگی آسروں میں دہکتی رہی
چاند بیٹھا منڈیروں پہ گلتا رہا چاندنی چھپروں سے ٹپکتی رہی
راہ میں آنے والے کی بیٹھی ہوئی عمر کا لمحہ لمحہ پگھلتا رہا
ڈاکیہ تار پڑھ کر سناتا رہا داہنی آنکھ بیکل پھڑکتی رہی

حد تو یہ ہے کہ کھیتوں، کھلیانوں اور کسانوں کے اس شاعر پر ترقی پسند نقادوں نے بھی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ بقول سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری ''ترقی پسندی کے جو کام ترقی پسندوں کو کرنا چاہیے وہ بیکل اتساہی نے بہت پہلے کر دکھایا۔ جس میں مزدوروں کسانوں کی آواز اردو زبان کے پرچم تلے اٹھائی ہے''[5]۔ ان کا منشور ہی دبے کچلے لوگوں، مزدوروں اور کسانوں کی آواز بننا تھا۔ یہ اشعار دیکھیں:

اب تو گیہوں نہ دھان بوتے ہیں
اپنی قسمت کسان بوتے ہیں
گاؤں کی کھیتیاں اجاڑ کے ہم
شہر جاکر مکان بوتے ہیں
فصل تحصیل کاٹ لیتی ہے
ہم مسلسل لگان بوتے ہیں

بلاشبہ مشاعرہ اردو زبان کی توسیع کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ بستی بستی قریہ قریہ ناخواندہ عوام تک اردو زبان کی شیرینی پھیلانے میں اس کا اہم رول ہے۔ بیکل نے بھی مشاعروں کے ذریعے عوام کے دلوں میں اس کی شیرینی اور حلاوت کو رچانے بسانے کا کام کیا۔ بدلے میں انھیں مشاعرے کا شاعر قرار دے کر نقادوں نے صرف نظر کر لیا۔ ''ان حضرات نے یہ نہیں سوچا کہ اردو زبان کی توسیع و اشاعت کی ارتقائی منزلوں میں مشاعروں کو ذریعہ بنا کر غیر اردو داں حلقوں تک اردو کو پہنچانے میں اور اردو کا دل دادہ بنانے میں جو محنت اور مشقت کی ہے وہ کیا کلاسیکل، جدیدیت مابعد جدیدیت، تجریدیت، ساختیات و ترقی پسند لوگوں نے یہ کام کیا ہے''۔[6] تاہم ان کی یہ بدنصیبی کہیے یا خوش نصیبی کہ انھوں نے خود کو ادبی سیاست سے دور رکھا اور نقادوں کی خوشامد نہیں کی۔ جس کے سبب ادب میں انھیں وہ مقام نہ ملا جس کے وہ حق دار تھے۔ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اردو زبان کو گاؤں کی روح میں بسایا۔ اردو شاعری کی لفظیات میں ہندی، اودھی اور برج الفاظ کا اضافہ کیا۔ ہندوستانی لوک روایت سے استفادہ کر کے گیتوں کو جدید رنگ و آہنگ بخشا۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہے کہ انھوں نے گیتوں کے دم توڑتے ہوئے سامراٹ کو استحکام بخشا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ظ انصاری لکھتے ہیں:

''بیکل کی زنبیل میں اودھی اور برج کے گیتوں کا، دوہوں اور چوپائیوں کا، بھوجپوری، پدو، کبیتاؤں کا ایسا رنگ برنگا خزانہ ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ ان کی طلب میں گاؤں گاؤں نہیں پھرے، اسے پیشہ نہیں بنایا، پبلسٹی نہیں کی، یہ گیت ان کی طلب صادق دیکھ کر خود ہی آئے، زنبیل بھرتے گئے۔ ...بیکل غزلوں کو لوک گیتوں کی، گیت کو غزلوں کی چاشنی دے کر ایسا آمیزہ تیار کرتے ہیں جو زود ہضم بھی ہو اور پر کیف بھی''۔[7]

بیکل نے اپنے مجموعے 'موتی اگے دھان کے کھیت' میں ارباب نقد و نظر کے سامنے یہ سوال قائم کیا ہے کہ اردو شاعری کے نصاب میں تمام اصناف سخن شامل ہیں تاہم نعت اور گیت کو اس میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ بھی اردو شاعری کی اہم اصناف ہیں۔ چنانچہ ارباب ادب کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بیکل نے اپنی پوری زندگی اردو شاعری کی آبیاری میں گزاردی اور کسانوں کی سر میں تال ملاکران کے اندر اتساہ پیدا کیا۔ غزل کے شہر میں گیتوں کا گانوں بسانے، گاؤں والوں کے من میں غزل کا رس گھولنے، کھیتوں، کھلیانوں اور پگڈنڈیوں سے اردو شاعری کو آشنا کرانے اور انجمن انجمن گنگنانے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

بیکل نے اپنی پوری زندگی اردو شاعری کی آبیاری میں گزار دی اور کسانوں کی سر میں تال ملا کر ان کے اندر اتساہ پیدا کیا۔ غزل کے شہر میں گیتوں کا گاؤں بسانے، گاؤں والوں کے من میں غزل کا رس گھولنے، کھیتوں، کھلیانوں اور پگڈنڈیوں سے اردو شاعری کو آشنا کرانے اور انجمن انجمن گنگنانے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

بیکل ترا جگ جگ نام یہاں اتساہی ترے سب کام یہاں
تری بھور یہاں تری شام یہاں پھر کاہے پھرے بھٹکا بھٹکا

حواشی

(1) بیکل اتساہی۔ مٹی، ریت، چٹان، ص 17 ہریانہ اردو اکادمی، 1992
(2) فراق گورکھپوری، مٹی ریت چٹان، ص 11,12 ہریانہ اردو اکادمی 1992
(3) پروفیسر ابوالکلام قاسمی۔ مقدمہ موتی اگے دھان کے کھیت، بیکل اتساہی، ص 10، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، 2002
(4) سید احتشام حسین۔ ذوق ادب اور شعور، ص 144، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2014
(5) بیکل اتساہی، موتی اگے دھان کے کھیت، ص 8 کاک آفسیٹ پریس دہلی 2002
(6) ایضاً ص 8-7
(7) بیکل اتساہی، رنگ ہزاروں خوشبو ایک، ص 12-11، اردو اکادمی دہلی، 1989

■

Imteyaz Rumi Room No.: 34, Mahi Hostel, JNU, New Delhi - 110067
Mob.:9810945177

ایک باکمال شاعر جاوید کمال

حیدر علی

جاوید کمال کا اصل نام واجد علی خاں تھا۔لیکن قلمی نام جاوید کمال سے مشہور ہوئے۔وہ رام پور، یوپی میں پیدا ہوئے، سرٹیفکیٹ کے مطابق تاریخ پیدائش 24 جون 1930 ہے۔دراصل وہ خود اپنے دوستوں سے بتاتے تھے کہ یہ تاریخ ان کی اصل عمر سے ڈیڑھ سال زیادہ ہے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والدین کی نگرانی میں ہوئی اور آٹھویں کلاس تک رام پور میں پڑھائی کی۔ ہائی اسکول سے ایم اے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور پھر پوری طرح علی گڑھ کے ہوکر رہ گئے۔

1950-55 کے بعد جن شاعروں نے اردو شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے،ان میں جاوید کمال کا نام سر فہرست ہے۔ہم عصر بزرگ نسل کے بعد نئی نسل کے شاعروں مثلاً جذبی، راہی معصوم رضا،خلیل الرحمٰن اعظمی، خالد سلطان،اشفاق پاپے،ذوقی صاحب، وحید اختر، زاہدہ زیدی،اختر انصاری،شہریار،نوری شاہ اور اطہر پرویز جیسے فن کاروں کی صف میں جاوید کمال کا نام اور ان کی شاعری نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔

جاوید کمال کی زندگی میں دھوپ ہی دھوپ تھی، انھوں نے کنبہ کی پرورش کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔جوتوں کی دکان کی،بھی کتب فروشوں کے ایجنٹ بن کر جانے انجانے شہروں کا چکر لگایا۔ ہزاروں روپے کمائے اور خرچ کردیے۔مستقبل کے لیے پیسے جوڑنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔آخر کار یونیورسٹی کے مخلص دوستوں کی مدد سے ان کو ایک چائے اسٹال مل گئی جس نے بعد میں کینٹین کی شکل اختیار کرلی۔ان کے بارہ سال بہت اچھے گزرے اس زمانے میں انھوں نے شاعری بھی خوب کی۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔یہ وہ دور تھا،جب اردو ادب میں جدیدیت کا بول بالا تھا اور ہر دوسرا ادیب جدیدیت کے سائے تلے آنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔مگر ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے جدیدیت کی اصل روح کو جانے بغیر اس کوچے میں قدم رکھ دیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی توڑ پھوڑ ہونے لگی اور تجربے کے نام پر عجیب وغریب چیزیں قاری کے سامنے آنے لگا۔

اس کے برعکس جاوید کمال کا رجحان بائیں بازوں کی جانب ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت اور شاعری میں دہراپن نہیں دیکھنے کو ملتا وہ جیسے تھے سب کے سامنے تھے۔ان کا صرف ایک مجموعہ کلام 'آواز نہ دو' 1992 میں شائع ہوا جو ان کے انتقال کے 15 سال بعد ان کے کچھ کرم فرماؤں کی محبت کا ثمرہ ہے۔ان کا انتقال 31 جولائی 1978 کو دہلی میں ہوا۔

جاوید کمال کی زندگی میں دھوپ ہی دھوپ تھی، انھوں نے کنبہ کی پرورش کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ جوتوں کی دکان کی،کئی کتب فروشوں کے ایجنٹ بن کر جانے انجانے شہروں کا چکر لگایا۔ ہزاروں روپے کمائے اور خرچ کردیے۔ مستقبل کے لیے پیسے جوڑنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔آخر کار یونیورسٹی کے مخلص دوستوں کی مدد سے ان کو ایک چائے اسٹال مل گئی جس نے بعد میں کینٹین کی شکل اختیار کرلی۔ ان کے بارہ سال بہت اچھے گزرے اس زمانے میں انھوں نے شاعری بھی خوب کی۔جن لوگوں کا 1956 سے 1968 تک علی گڑھ سے واسطہ رہا ہے وہ جاوید کمال کو نہ جانتے ہوں، یہ ناممکن ہے۔وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ تھا۔علی گڑھ میں اس زمانے میں تمام ادبی اور کلچرل زندگی کا مرکز یونیورسٹی کینٹین ہوا کرتی تھی۔علی گڑھ کے چھوٹے بڑے شاعر، ادیب اور فن کار شام کو کینٹین میں جمع ہوتے تھے۔جاوید کمال میزبان ہوتے،چائے اور کافی کے دور چلتے رہتے تھے اور ادب، ڈرامہ، سنیما،کھیل کود، یونیورسٹی کی سیاست، ادھر ادھر کی کبھی نہ ختم ہونے والی بات چیت اور بحث چلتی رہتی۔ان محفلوں کے اپنے آداب، قاعدے اور طریقے تھے۔ بڑے چھوٹے کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا لیکن ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا پورا حق حاصل تھا۔

ان محفلوں میں جذبی، راہی معصوم رضا،خلیل الرحمٰن اعظمی، ذوقی صاحب، بلدیو مرزا، حکیم محبوب عالم، اور بھائی خاں شامل ہوا کرتے تھے۔ادب، آرٹ اور کھیل کی دنیا میں جو شخصیتیں ابھر رہی تھیں ان میں فلم ساز مظفرعلی، کہانی کار اصغر وجاہت، صحافی ریاض پنجابی، ہاکی کے کھلاڑی علی سید اور گرودیو سنگھ کے علاوہ مشہور فلمی ہستی نصیرالدین شاہ بھی اکثر کینٹین آتے تھے۔جاوید کمال ان کے آرٹ کے قائل تھے۔جاوید کمال کی کینٹین میں شام چھ بجے کے بعد محفل جمتی اور رات دیر تک آراستہ رہتی۔ شعر وشاعری ہوتی یا جاوید کمال کی گپ چلتی رہتی تھی۔ انھیں بولنے کا بہت شوق تھا۔ان کے پاس باتوں کا خزانہ تھا۔مزے دار لطیفے سناتے عام طور پر رام پوری پٹھانوں کے لطیفے سناتے۔شعر سنانے کو دل چاہتا تو میر کے شعر

غم نے جنھیں بہلا دیا

علی گڑھ میں آزادی کے بعد جتنے شاعر ہوئے ہیں ان میں جاوید کمال کی شاعری کا اپنا الگ رنگ تھا۔ فکر وفن کا ایسا خوبصورت امتزاج مشکل ہی سے دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ جس محفل میں جاتے، اس زمانے کے تمام شہرت یافتہ شاعر ان کے سامنے پھیکے پڑ جاتے اس لیے انھیں مشاعروں میں بلانا بند کر دیا گیا۔1968 میں سیل ٹیکس والوں نے کئی جھوٹے مقدمے کرکے ان پر دباؤ ڈالا کہ کینٹین بند کردیں۔آدمی نہایت شریف تھے اس لیے مکاروں کے فریب میں آکر انھیں کینٹین بند کرنی پڑی۔

سناتے، میر ان کے پسندیدہ شاعروں میں تھے۔

دوستوں کی جتنی اونچی اور مضبوط دیوار جاوید کمال نے اپنے چاروں طرف اٹھا رکھی تھی اتنی ہی اونچی اور مضبوط دیوار انھوں نے اپنے دشمنوں کی بھی بنا رکھی تھی۔ علی گڑھ کے بااثر شاعروں اور ادیبوں سے ان کی نہیں بنی اس لیے اردو کے اخباروں اور رسالوں میں ان کا کلام چھپنا بند ہو گیا اور آخر میں انھوں نے خود ہی بھیجنا بند کردیا کیوں کہ انھیں اس کا احساس ہو گیا تھا۔ان کا ماننا تھا کہ ادب میں جوڑ توڑ کرکے کوئی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے شاعری چھپنے یا شہرت پانے کے لیے نہیں کی اور نہ ہی مشاعروں میں جاکر پیسہ کمانے کے لیے شاعری کی۔ان کا ماننا تھا شاعری اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے اچھا دوسرا کام نہیں کرسکتا۔

علی گڑھ میں آزادی کے بعد جتنے شاعر ہوئے ہیں ان میں جاوید کمال کی شاعری کا اپنا الگ رنگ تھا۔فکروفن کا ایسا خوبصورت امتزاج مشکل ہی سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ جس محفل میں جاتے، اس زمانے کے تمام شہرت یافتہ شاعر ان کے سامنے پھیکے پڑ جاتے اس لیے انھیں مشاعروں میں بلانا بند کردیا گیا۔ 1968 میں سیل ٹیکس والوں نے کئی جھوٹے مقدمے کرکے ان پر دباؤ ڈالا کہ کینٹین بند کردیں۔آدمی نہایت شریف تھے اس لیے مکاروں کے فریب میں آکر انھیں کینٹین بند کرنی پڑی۔

اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر علیم جو جاوید کمال کی شاعری کے قدر دان تھے۔انھوں نے انھیں پبلک ریلیشن آفس میں چار سو روپے ماہوار کی نوکری دے دی۔ایک شعر جو اپنے دوستوں کے درمیان اکثر گن گنایا کرتے تھے:

کوئی بھی حادثہ ہوا،کوئی بھی سانحہ ہوا
گردش روزگار نے میرا پتہ بتا دیا

لوگوں نے انھیں چائے بیچنے والا شاعر کہنا شروع کردیا۔ اردو کا ایسا حساس شاعر جس کا کلام دل ودماغ کو ایک ساتھ چھوتا تھا۔وہ گمنامی اور ناقدری کی زندگی جینے کو مجبور ہوا۔ہر عہد میں جگنوؤں نے سورج سے روشنی کا حساب مانگا ہے لیکن اس سے سورج کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی۔

جاوید کمال کی اس دوران بہت کم تخلیقات شائع ہوئیں۔محمد حسن نے عصری ادب میں ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں چھاپی تھیں۔کچھ تخلیقات ہندی میں بھی شائع ہوئی ہیں۔سچ مانیے تو جاوید کمال جیسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ان کا یہ شعر پریشانی کے وقت ہمیشہ ہمت دیتا ہے:

اپنے پیدا کیے سورج سے اجالے مانگو
بھیک مانگی ہوئی کرنوں کا بھروسہ کیا ہے

تھی نہ قسمت میں اگر اعلیٰ مقامی یا رب
ہم کو کس واسطے بخشا یہ مزاج عالی

بے ساختگی ان کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔وہ نہ روایتی شاعری کے اسیر ہیں اور نہ اس سے یکسر منحرف ہوکر غزل میں نئی ردیفیں یا تجربہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔جاوید کمال کے شعری اسلوب کی تشکیل میں خود جاوید کی شخصیت نے جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے یہاں جو ضبط وتوازن کے ساتھ وقفہ خاموشی ہے وہ سب ان کے شعری اسلوب کا بھی حصہ ہے۔

جاوید کمال نے اپنی شاعری میں تنہائی، بیگانگی، افسردگی اور احساس محرومی جیسے الفاظ کا بار بار استعمال کیا۔ اس میں شک نہیں جاوید کمال کی شاعری میں تنہائی، بیگانگی اور احساس محرومی کے عناصر ضرور موجود ہیں مگر یہ تمام چیزیں جدیدیت کے زیر اثر وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان کی اپنی ذاتی محرومی کی وجہ سے یہ تراکیب ان کی شاعری میں اتر آئی ہیں۔مثلاً:

ہاتھ پھر بڑھ رہا ہے سوئے جام
زندگی کی اداسیوں کو سلام

بعد مدت کے ہوا تھا کوئی ہم سا پیدا
ہائے پھر رہ گیا آغوش بیاباں خالی

نیند آنکھوں میں ہے کم کم مجھے آواز نہ دو
جاگ جائے گا کوئی غم مجھے آواز نہ دو

وحشت نے ہم سے چھین لی دم بھر میں دوستو
جو مدتوں میں آئی تھی شائستگی ہمیں

جاوید کمال کی غزلوں میں فکر سے بڑھ کر احساس کا عنصر غالب ہے۔اسے آپ محسوس استغراق کی کیفیت کہہ لیجیے۔وقت کی ڈور جب ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور شخصیت کا استحکام جب چور چور ہوجاتا ہے اور تنہائی کی اذیت برابر کچوکے دیتی رہتی ہے تو شاعری میں بے اطمینانی ہی نہیں بلکہ افسردگی اور اضطراب کی لہر سر اٹھاتی ہے اور گردوپیش کا ماحول ناسازگار نظر آنے لگتا ہے اور خلا میں گھومتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ جاوید کمال کی غزلوں کی کائنات چھوٹی چھوٹی تصویروں کی یکجائی سے تشکیل پاتی ہے ان کے یہاں جذبات سے زیادہ ان کے انعکاس کا فارم اہمیت رکھتا ہے۔

خوں رو چکے لالہ وگل بارہا مگر
بے غازہ حنا ہے نگار وطن ہنوز

جاوید کمال کی شاعری ایسے شخص کی شاعری ہے جس کا بہت کچھ، یا شاید سب کچھ کھو چکا ہے، یا چھن گیا ہے۔وہ اس صورت حال پر رائے زنی کر سکتا ہے،لیکن اس صورت حال کو بدلنے پر وہ قادر نہیں۔بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ تجربے کی شدت نے عمل کی قوت چھین لی ہے۔اس میں کسی قسم کا اخلاقی یا سیاسی تذبذب یا ڈائیلما نہیں،بس ایک منزل ہے،ایک وقت ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ایسے بہت سے لوگ ہیں، یا شاید سب لوگ ایسے ہیں وقت جن کے لیے ٹھہر تا نہیں، تجربہ جن کے لیے ایک گزرتی ہوئی فلم کی طرح ہے، کبھی کبھی وہ پردے پر ہونے

بے ساختگی ان کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔وہ نہ روایتی شاعری کے اسیر ہیں اور نہ اس سے یکسر منحرف ہو کر غزل میں نئی ردیفیں یا تجربہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔جاوید کمال کے شعری اسلوب کی تشکیل میں خود جاوید کی شخصیت نے جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے یہاں جو ضبط وتوازن کے ساتھ وقفہ خاموشی ہے وہ سب ان کے شعری اسلوب کا بھی حصہ ہے۔

والے واقعات میں ذہنی طور پر اس قدر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعات انھیں اصلی اور خود اپنے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر انھیں اس قدر بے قابو کردیتے ہیں کہ وہ خود ان کے ساتھ دوڑنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے بعض اور حقائق بھی بیان کرنے پڑتے ہیں:

دل یہ امید وار کس کا ہے
کیا کہیں انتظار کس کا ہے
میری آنکھوں کے سامنے یا رب
دیدہ اشک بار کس کا ہے
آج دیوانگی فزوں تر ہے
یہ غم انتظار کس کا ہے

ان اشعار میں شکوہ شکایت نہیں، رنج بھی نہیں۔ ان میں خود آگہی اور ماحول کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش ہے۔ ان کا لہجہ ایسے شخص کا لہجہ ہے جس نے دکھ درد سنانے، لوگوں کو متوجہ کرنے، اور خود کو گفتگو یا دلچسپی کا محور بنانا سیکھا ہی نہیں..... جاوید کمال کی شاعری کا سب سے بڑا کمال اس کا Understatement ہے، کہ وہ اپنے کلام میں جذبات کا وزن کم ڈالتے ہیں انھیں کسی بات کو کہنے کے لیے کم سے کم توجہ انگیزی اختیار کرنے کی عادت تھی۔ یہ ان کی پختگی اور شاعرانہ قوت کے مزید عروج کی علامت ہے۔ ان کی بات اتنے فطری انداز میں، اتنے نامیاتی رنگ سے ادا ہوتی ہے کہ اعلی درجے کے ستارے کسی راگ کے بے تکلف ادا ہو جانے کا تاثر پیدا ہوتا ہے.....

غزل میں جاوید کمال کی محزونی اور احساس زیاں ان کی نظم سے بھی ہلکے لہجے میں معرض بیان میں آئے ہیں۔ ان کا انداز لطیف اور لہجہ دھیما ہے:

دل کو ملتا نہیں قرار کہیں
غم بھی ہوتا ہے سازگار کہیں
جب گھٹائیں اٹھ کر آتی ہیں
بیٹھ جاتے ہیں بادہ خوار کہیں

ہائے وہ لوگ ہم سے روٹھ گئے
جن کو چاہا تھا زندگی کی طرح
جب بھی ظالم وہ یاد آتا ہے
دل دکھاتا ہے چاندنی کی طرح

ہم جو تم سے نہ آشنا ہوتے
سوچتے ہیں کہ جانے کیا ہوتے

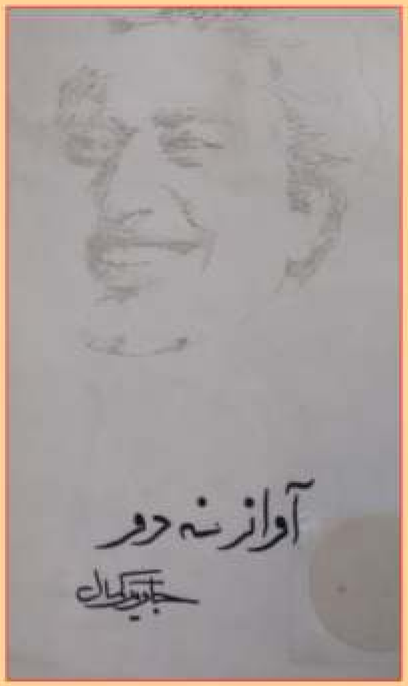

لطف آتا تیری جفاؤں میں
کاش کچھ ہم بھی بے وفا ہوتے
پھر سے ملنے کا ہے یقین مگر
جانے ڈرتے ہیں کیوں جدا ہوتے

ان اشعار کی خوبصورتی اور ان کے معنی کے تہوں تک پہنچنے کے لیے تامل کی ضرورت ہے۔ جاوید کمال جیسی شاعری کہنے کے لیے اور پڑھنے کے لیے بھی، خاص مشق اور تفکر درکار ہے۔

جاوید کمال نے زبان و بیان کی سطح پر غزلیہ روایت سے انحراف کو نئی غزل کا حصہ بنایا۔ نئی اشیا اور قدروں پر معصومانہ حیرت کا اظہار، اس حیرت کے پیچھے دانشورانہ سوال کی موجودگی، ان کی شاعری میں تازگی اور لطف پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے ایسے الفاظ و تراکیب سے گریز کیا جو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ تو تھے لیکن روزمرہ میں تکلف کا باعث تھے اور ایسے لفظوں کو شعریت عطا کی جو روزمرہ کے حصے تھے خواہ وہ کھردرے ہی کیوں نہ ہوں۔ موضوع اور فکر کی سطح پر بھی اس رویے کو ترجیح دی۔ موجودہ زندگی سے لاتعلق موضوعات اور افکار کو بھی اپنی شاعری کا حصہ نہیں بنایا:

پھر کئی زخم دل مہک اٹھے
پھر کسی بے وفا کی یاد آئی

جھومتی گاتی صبا پھرتی ہے ڈالی ڈالی
اور غنچوں کی قبائیں وہی خالی خالی

کچھ دیر اور جینے کی حسرت رہے گی پاس
کچھ دیر اور پاس رہو میں نشے میں ہوں

آدمی ہیں کوئی گرتی ہوئی دیوار نہیں
تم سہارا بھی نہ دوگے تو سنبھل جائیں گے

عہد، ماحول اور ذات پر دیدہ و نادیدہ، خوف و دہشت کا شعری اظہار جاوید کمال کا خاصہ ہے۔ ویرانی، نحوست، بے رونقی اور وحشت کے سبب مٹتے ہوئے آثار کا ماتم وہ نت نئے انداز میں کرتے ہیں۔ شعری تجسیم کے مرحلے میں انھوں نے مختلف علائم اور استعارے سے کام لیا ہے۔

رشتے انسانی زندگی میں بامعنی ہوتے ہیں۔ رشتوں کی پامالی کے نتیجے میں زندگی کی بے معنویت، ناآسودگی اور اضطراب جسے اجمالاً کرب ذات سے موسوم کرسکتے ہیں، جاوید کمال کی شاعری کا نمایاں عنصر ہے اور کرب ذات اور غم کائنات کا ادغام ان کی فکری ہنرمندی ہے۔ یہی ہنرمندی جوان کی معاشرتی اور سماجی تفہیم کو غزل کے فن اور تہذیب سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ انھوں نے سماج اور معاشرے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔

ایک مدت سے غزلخواں نہ ہوئے سو ہوئے
ہم ہی بس چاک گریباں نہ ہوئے سو ہوئے

کارواں آتے ہیں اور آکے چلے جاتے ہیں
ایک ہم ہیں کہ اسی سمت تکے جاتے ہیں

کچھ دیر اور شعلہ شمع شب فراق
کچھ دیر اور رقص شرر جاگتے رہو
ہوگی کبھی تو ختم یہ غم کی طویل رات
ہوگی کبھی تو غم کی سحر جاگتے رہو

اگر سکون سے عمر عزیز کھونا ہو
کسی کی چاہ میں خود کو تباہ کر لیجے

دروازوں کے پہرے ہیں دیواروں کی سنگینیں
ہوتا جو میرے بس میں اس گھر سے نکل جاتا

جاوید کمال ایک مخلص دوست اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ زمانے کا جو رویہ رہتا ہے وہی ان کے ساتھ بھی ہوا۔

■

Dr.Haider Ali, Rekhta Faundation, B-37, Sector-01, Noida- 201301 (UP)

'کتاب نما'

خواجہ احمد فاروقی نمبر

غلام نبی کمار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (مرکزی دفتر) نئی دہلی ایک اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کی شاخیں ہندوستان کے مشہور شہروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ادارہ اشاعت کے ضمن میں سالہا سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا آیا ہے۔ اس ادارے کا قیام 1922 میں عمل میں آیا تھا۔ اب تک اس ادارے کی جانب سے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں شعر و ادب، تنقید و تحقیق اور تخلیق و ترجمہ وغیرہ ہر نوع کی مطبوعات شامل ہیں۔ 'کتاب نما' کے نام سے اس ادارے سے 1960 میں ادبی پرچہ جاری ہوا جس کے اوّل مدیر ریحان احمد عباسی تھے۔ مشہور شاعر غلام ربانی تاباں کی زیرِ سرپرستی اس ادبی مجلّے نے بال و پر نکالے۔ وہی اس کے مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ اس کے صفحہ اول کے ٹائٹل کے اوپر لکھا ہے ''نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب''۔ ظاہر ہے کہ نظریاتی اور اصولی اختلاف کے شور شرابے میں اپنی غیر جانبداری کو محفوظ رکھنا سہل نہیں ہے۔ ''لیکن 'کتاب نما' نے اس سلسلے میں بڑی جگر کاوی کا ثبوت دیا۔ کتابی سائز میں علمی و ادبی مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے عرصۂ دراز سے اردو ادب کی خدمت کرنا ہی اس مجلّے کا شیوہ رہا ہے۔ ابتدا میں یہ رسالہ نئی مطبوعات سے روشناس کرانے کا مقصد لیے ہوئے تھا۔ بعد میں یہ پرچہ کتابوں کی دنیا میں قطب نما بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کی بساط برسوں محض کتابوں پر تبصرے تک محدود رہی یا پھر مکتبہ یا دیگر اداروں کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں اطلاعات کی فراہمی تک۔ لیکن بعد میں اس نے ایک باقاعدہ ادبی ماہنامے کی صورت اختیار کر لی، اور اس میں تنقید و تحقیق اور شعر و ادبی تخلیقات جیسے مضامین، گفتگو، خاکے، طنز و مزاح، انشائیہ، شاعری، افسانے، خطوط، یادیں، مانگے کا اجالا اور جائزے کے عنوانات کے تحت مختلف النوع تحریریں اور تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے قلم کاروں میں نئے ناموں کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے نام بھی شامل رہے ہیں۔ 'کتاب نما' میں شائع ہونے والے مضامین نے قارئین کے ادبی ذوق کی صرف تسکین ہی نہیں کی۔ بلکہ تحقیق کے طالب علموں کے لیے راستہ ہموار کیا اور تنقید کے شعبے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تنقید نگار ادیب اور تخلیق دونوں کے قد و قامت کا جائزہ لیا۔

اس معیاری مجلّے کو عظیم شاعر، ادیب اور صحافی وغیرہ کا تعاون حاصل رہا ہے۔ مذکورہ بالا مینجنگ ایڈیٹر اور مدیر کے علاوہ اس کے مینجنگ مدیران میں مندرجہ ذیل حضرات شامل رہے ہیں۔ شاہد علی خاں، حامد علی خاں اور مدیران میں ولی شاہجہاں پوری، شاہد علی خاں، ظفر ہمایوں، خالد محمود اور عمران احمد عندلیب وغیرہ۔ 'کتاب نما' میں ایک اور خوشگوار تبدیلی اس وقت آئی جب 1987 سے اس میں 'مہمان اداریہ' کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس سلسلے کے تحت بعض نامور ادیبوں کو مہمان مدیر کا اعزاز دیا گیا۔ رسالے کو ترتیب دینے کے علاوہ اداریہ کے طور پر ابتدائی مضمون بھی مہمان مدیر ہی تحریر کرتا تھا۔ پہلے پہل اداریہ کو 'اشاریہ' کے عنوان سے تحریر کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اداریہ ہی لکھا جاتا ہے۔ چند مہمان مدیران کے نام یوں ہیں: آل احمد سرور، علی سردار جعفری، حامدی کاشمیری، رفعت سروش، آفاق حسین صدیقی، عبدالقوی دسنوی، خلیق انجم، ظہیر احمد صدیقی، وارث علوی، عبدالمغنی، صغریٰ مہدی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی وغیرہ۔ مہمان مدیران کی تصویریں بھی متعلقہ پرچوں کے سرورق کی زینت بنیں۔

'کتاب نما' رسالہ آجکل، نقوش، نگار، سب رس، علی گڑھ میگزین، ایوان اردو، شیرازہ وغیرہ کی راہ پر چلتے ہوئے خصوصی شماروں میں ان سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ 'کتاب نما' کے خصوصی شمارے دیگر رسالوں کی بہ نسبت اس لحاظ سے قدرے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کو صرف رسالے تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے انھیں الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اگر قاری باقی رسالوں کے کسی مخصوص شمارے کو حاصل کرنا چاہے تو اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کیونکہ اوّل تو کسی بھی رسالے کی پوری فائلیں ایک جگہ مل پانا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ اگر شمارہ مل بھی جاتا ہے تو نہایت ہی بوسیدہ حالت میں۔ جس کی فوٹو کاپی کرنا تک محال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے 'کتاب نما' کو بہت بڑی وقعت اور اہمیت حاصل ہے۔

'کتاب نما' میں اب تک پچاس سے زائد خصوصی شمارے شائع کیے گئے ہیں۔ ماہنامہ آجکل کے بعد 'کتاب نما' کو ہندوستان میں دیگر رسالوں کے اعداد و شمار کے مطابق سب سے زیادہ خصوصی شمارے شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس میں شائع شدہ خصوصی شماروں میں چند کے نام اس طرح ہیں۔ نئی نظم نمبر، یادگار جوش ملسیانی نمبر، سلامت علی دبیر نمبر، محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی نمبر، عرش ملسیانی نمبر، پریم چند نمبر، سید عابد حسین نمبر، لغت نویسی کے مسائل نمبر، محمود احمد ہنر نمبر، اجمل اجملی نمبر، آل احمد سرور نمبر، خلیق انجم نمبر، فرمان فتح پوری نمبر، اختر سید خاں نمبر، نثار احمد فاروقی نمبر، عابد علی خاں نمبر، خواجہ احمد فاروقی نمبر، اردو افسانہ ممبئی میں 1970 کے بعد، مغیث الدین فریدی نمبر، صالحہ عابد حسین نمبر، محبوب حسین جگر نمبر، علی سردار جعفری نمبر، حامدی کاشمیری نمبر، جمنا داس

اختر نمبر، ابوسلمان شاہجہانپوری نمبر، رشید حسن خان نمبر، حنیف ترین نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، شاد عظیم آبادی نمبر، صوفیا کا بھگتی راگ نمبر، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، ابوالکلام قاسمی نمبر، مشفق خواجہ نمبر، عبدالستار دلوی نمبر، مجتبیٰ حسین نمبر، غلام ربانی تاباں نمبر، جگن ناتھ آزاد نمبر، عبدالطیف اعظمی نمبر، عبدالوحید صدیقی نمبر، شاد عارفی نمبر وغیرہ۔

فروری 1993 میں 'کتاب نما' میں 'خواجہ احمد فاروقی نمبر' کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ خواجہ صاحب بھی بقیدِ حیات تھے، جب اس خصوصی نمبر کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمبر کو بعد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے بھی 2011 میں نہایت ہی اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع کیا گیا۔ اس خصوصی شمارے کے مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم تھے جب کہ مکتبہ جامعہ کے اس وقت کے مینجنگ ڈائریکٹر خالد محمود تھے۔ اس خصوصی نمبر میں خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت اور فکروفن پر اردو زبان کی ممتاز اور معروف ترین شخصیات نے جو کہ ان کے معاصرین بھی رہے ہیں، بسیط اور بلیغ مضامین رقم کر کے خواجہ صاحب کو گلہائے عقیدت پیش کیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی اعلیٰ پایہ کے محقق، نقاد، خاکہ نگار، صفِ اول کے انشا پرداز اور مکتوب نگار تھے۔ میر 'میر تقی میر: حیات اور شاعری' پر اردو میں باقاعدہ پہلا تحقیقی مقالہ انہی کا لکھا ہوا ہے، جس کے بعد سے میر شناسی کی روایت نے طول پکڑا۔ غالب کی فارسی کتاب 'دستنبو' کی پیچیدہ نثر کا انگریزی میں فاروقی صاحب نے ہی بہت شاندار ترجمہ کیا۔ وہ اعلا درجے کے منتظم اور اردو تحریک کے علمبردار تھے۔ پروفیسر امیر عارفی سابق صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی اردو کی بقا کے تئیں ان کی کاوشات کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

''جب اردو کے خلاف تیز تند آندھیاں چل رہی تھیں اور اردو کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا تو فاروقی صاحب نے دہلی یونی ورسٹی میں اردو کی بقا کے لیے ایک ننھا سا دیا روشن کیا، جس نے ان کے خلوص، لگن اور غیر معمولی جدوجہد سے بہت جلد مہر نیم روز کی شکل اختیار کر لی۔''

(بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت: خواجہ احمد فاروقی، مرتبہ از خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2000، ص 9)

ایک وقت تھا جب پوری اُردو دنیا میں دو تین ہی نام گونجتے تھے۔ ان میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا نام بھی شامل تھا اور دانش گاہوں کی دنیا میں تو یہ نام سرفہرست تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لیے ان کی خدمات اور کاوشات کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ پہلے اس یونیورسٹی میں اردو، فارسی اور عربی کا مشترکہ ڈپارٹمنٹ تھا، بعد میں اُردو کو الگ ڈپارٹمنٹ کی حیثیت دلانے میں ان کا ہی پورا کردار رہا ہے۔ پیلیو گرافی (مخطوطہ شناسی) کا ایک سالہ کورس انھوں نے ہی شروع کیا تھا اور آج بھی ہندو پاک میں صرف اسی شعبے کو یہ فخر حاصل ہے۔ متنی تنقید پر پہلی باضابطہ، باقاعدہ اور معتبر کتاب لکھنے کی تحریک خلیق انجم میں خواجہ صاحب نے ہی پیدا کی تھی۔ اس کے علاوہ تحقیقی، طباعت اور ترجمے کے کاموں کی ابتدا، رسالہ اردوئے معلی کا اجرا، عظیم الشان سیمناروں، کانفرنسوں،

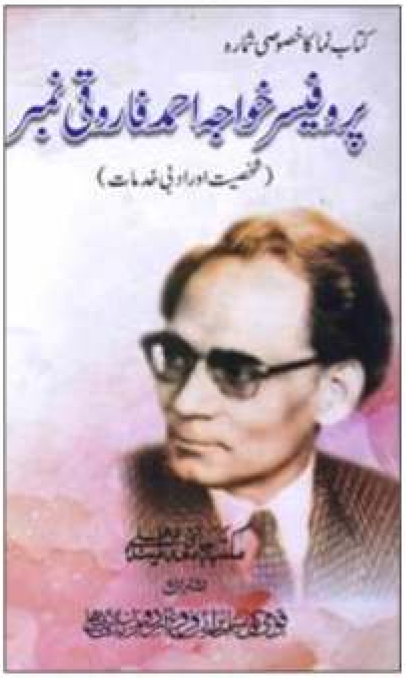

پُروقار تقریبوں کا انعقاد ان کی زیر سرپرستی عروج پر تھا۔ دہلی یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو واحد شعبہ ہے جس کے سیمناروں میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے شرکت کی۔ 'خواجہ احمد فاروقی نمبر' مرتبہ از ڈاکٹر خلیق انجم 'کتاب نما' کے اداریہ میں ایسی بہت سی باتوں کا نہایت ہی عمیق انداز میں تذکرہ کرتے ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم خواجہ احمد فاروقی پر اپنے ایک مضمون 'اردو کے خواجہ: خواجہ احمد فاروقی' میں ان کی شخصیت کے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں:

''خواجہ کے لفظی معنی خداوند، صاحب، مالک، آقا، سردار کے ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو خواجہ احمد فاروقی کی 'خواجگی' ان کی حیات میں اور مرنے کے بعد بھی باقی ہے۔ لیکن ان کو یہ مقام یا مرتبہ اس لیے نہیں ملا کہ وہ کسی متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے یا پوتڑوں کے رئیس تھے بلکہ انھوں نے اپنی قوم، زبان اور ادب کے لیے ایسے پائیدار اور مستحکم کام کیے جنھیں 'صدقہ جاریہ' کی حیثیت حاصل ہے جن سے تا دورِ آفتاب ان کا زندہ رہے گا۔''

اسی مضمون میں پروفیسر ارتضیٰ کریم ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''خواجہ احمد فاروقی عملی انسان بھی تھے اور علمی وقار کے حامل بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ٹھوس کام بھی کیے تو دوسری جانب کئی یادگار تصنیفات اور تالیفات، مضامین اور دیگر تحریریں بھی دیں۔''

اس خصوصی نمبر میں کل پندرہ مشاہیر ادب کے مضامین شامل ہیں۔ اداریہ کے بعد خواجہ صاحب کے سوانحی کوائف کا اندراج کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی پیدائش، تعلیم (اردو، انگریزی، عربی، فارسی میں ایم۔اے، بعد میں اردو میں پی ایچ ڈی)، درجنوں تصنیفات، تالیفات جیسے مرزا شوق لکھنوی، کلاسیکی ادب، مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، ذوق و جستجو، نئی شاعری، چراغ راہ گذر وغیرہ۔ مخطوطات کی ترتیب و تدوین میں تذکرۂ سرور یا عمدۂ منتخبہ، کربل کتھا: فضلی کی قدیم نثر، گنج خوبی، دیوان بقا، دیوان میر وغیرہ۔ کتابوں کے لیے خاص ابواب، انعام و اکرام، درجنوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت، خصوصی اور توسیعی خطبات، درجنوں علمی و ادبی انجمنوں سے تعلق، علمی اسفار، تحقیقی اور تنقیدی مقالے جو ان کے متعلق لکھے گئے وغیرہ کا اس میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے پہلے پروفیسر ایمی ری ٹس ہونے کا فخریہ اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ موصوف اپنی زندگی میں کئی معزز عہدوں پر فائز رہے۔ ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے انھوں نے کئی بیرونی ممالک ماسکو، تاشقند، فرانس، مغربی جرمنی وغیرہ کا سفر کیا۔

'خواجہ احمد فاروقی نمبر' کا پہلا مضمون پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بعنوان 'خواجہ احمد فاروقی' ہے۔ خواجہ صاحب ان کے معاصرین میں بھی شامل تھے اور ان سے بہت قربت بھی رکھتے تھے۔ خلیق احمد نظامی صاحب نے ان کے بچپن، دوران طالب علمی کے زمانہ کا ذکر، ان کی تعلیمی قابلیت، ذہنی اور علمی ذکاوت، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت، خیالات اور فکر و احساسات وغیرہ سے خوش اسلوبی سے روشناس کرایا ہے۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب ماضی کے سرمایے کے قدر دان اور حال کے صحت مند رجحانات کے ہمدرد ہیں۔ ان کی

آنکھوں میں حال کا عزم اور مستقبل کا نور ہے۔ جو لوگ ماضی سے خفا اور حال سے بیزار ہیں۔ ان کے لیے خواجہ صاحب کی تنقید صبح عید کی نوید ہے۔''

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 16)

پروفیسر خلیق صاحب کا مضمون مختصر لیکن بے حد مفید، کارآمد اور جامع ہے، جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کے تعمیری کاموں کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مضمون 'شائستگی کے ڈھانچے میں ڈھلا انسان' سید حامد کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں بھی خواجہ صاحب کی بحیثیت ایک منتظم، ایک ادیب اور ایک استاد کے ان کی خدمات اور کاوشات کا ذکر ملتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا مضمون 'اردو خواجہ' معنی آفرین مضمون ہے۔ جس سے خواجہ صاحب سے متعلق بہت سی نجی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے دوسروں دوستوں کے توسط سے ملاقاتیں اور کبھی براہِ راست ہوئی ملاقاتوں کا ذکر، دلی کالج سے اپنی وابستگی، ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کا منظرنامہ، ان کے اسلوب، ان کی برگ و بار شخصیت کا حوالہ، ان کے حیرت انگیز تجربات، ان کی وسیع النظری اور کشادہ دلی اور اردو کے فروغ کے تئیں ان کی جدوجہد وغیرہ کے متعلق اثر انگیز تحریر لکھی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے مضمون کا ایک اقتباس خواجہ صاحب کے آفاقی نظریہ کو سمجھنے میں ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے:

''خواجہ صاحب کے یوں تو بہت سے کارنامے ہیں لیکن سب سے بڑا اور سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اوّل تو 1947 کے بعد کی خون آشام دہلی میں اردو کے برگ و بار پھر سے اگائے اور انھیں پروان چڑھایا اور دوسرے انھوں نے اردو کو عالمی پیمانے پر دیکھے دکھانے کی کوشش کی اور اسے عالمی سیاق و سباق اور آفاقی نظر بخشی اور یہ کام جس طرح ان سے سرانجام پایا اور کسی سے نہیں ہوسکا۔''

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 27)

'خواجہ احمد فاروقی نمبر' نمبر کا اگلا مضمون 'یاد نامہ: ایک مطالعہ، ایک تجزیہ' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے نوکِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ خواجہ صاحب کے ساتھ دلّی کالج کے ابتدائی اساتذہ میں ان کا نام سرفہرست ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو شعبے کے کاموں میں مصروفیت اور مشغولیت کا شرف بھی انھیں حاصل ہے۔ اپنے معاصرین میں خواجہ صاحب کی اس قدر قربت شاید ہی کسی دوسرے استاد سے رہی ہو، جتنی کہ ظہیر صاحب کے ساتھ تھی، موصوف انھیں بہت عزیز تھے۔ خواجہ صاحب مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بیرون ملک گئے تو صدر شعبے کی باگ ڈور انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے خواجہ صاحب پر ایک قابل تعریف خاکہ قلمبند کیا ہے جو ان کی کتاب 'فکری زاویے' میں بھی شامل ہے۔ قومی کونسل کے ماہنامہ رسالہ 'اردو دنیا' کے دسمبر 2015 شمارے میں خواجہ صاحب کو یاد کرتے ہوئے اس خاکے کو دوبارہ شائع کیا گیا۔ زیر نظر مضمون میں انھوں نے خواجہ صاحب کے خاکوں پر مشتمل کتاب 'یادِ یارِ مہرباں' کا بہترین مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے بعنوان 'یاد نامہ' میں سترہ مرحومین کے خاکے لکھے گئے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مضمون میں ابتداً صنفِ خاکہ کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے اور بعد میں خاکہ نگاری کے فن اور اسلوب کے ذیل میں آنے والی جابہ جا خوبیوں پر اپنی مدلل آرا سے مستفید فرمایا ہے۔ چونکہ موصوف کو خود بھی فن خاکہ نگاری پر دسترس حاصل ہے، اس لیے خاکے میں پائے جانے والی خوبیوں اور خامیوں پر ان کی بصیرت افروز نظر ہے۔ 'یادِ یارِ مہرباں' میں خواجہ صاحب کی خاکہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یادِ یارِ مہرباں' میں جو گرفت کردار نگاری اور حسن بیان پر ہے وہ اس عہد میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس میں جو خاکے ہیں ان کو اگرچہ خواجہ صاحب نے قریب سے دیکھا ہے مگر ان کی بزرگی نے بے تکلفی کی بجائے عقیدت کو درمیان میں لاکھڑا کیا ہے۔ مگر اس عقیدت میں غیریت اور اجنبیت نہیں بلکہ محبت اور خلوص شامل ہے۔ اس کے برخلاف 'یاد نامہ' کے تمام کردار خواجہ صاحب کے لیے ہم نشین کی حیثیت رکھتے ہیں اور خواجہ صاحب کو 'جمال ہم نشیں در من اثر کرد' کا اعتراف بھی ہے۔ مگر ان کرداروں پر وہ گرفت نظر نہیں آئی جو 'یادِ یارِ مہرباں' کا طغرائے امتیاز ہے۔''

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 40)

متذکرہ بالا میں پیش کیے گئے اقتباس کی روشنی میں قارئین پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی ناقدانہ اور فنکارانہ مہارت سے بخوبی واقف ہوگئے ہوں گے۔ کہ کس طرح اور کس زاویے سے انھوں نے خواجہ صاحب کے فن خاکہ نگاری کی خصوصیت کو سنجیدگی سے پرکھا ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا مضمون 'خواجہ احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر ایک نظر' تین صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مضمون نگار نے سوا دو صفحات میں خواجہ صاحب کے ساتھ آزادی کے فوراً بعد اپنی پہلی ملاقات، تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال، دلی میں اردو پر پنجابی کے اثرات، اردو اخباروں کی صورتِ حال، ہندوستانی دستور میں اردو کا مقام، ادیبوں، صحافیوں اور سیاست دانوں کا اردو کی بحالی میں رول، مرحوم دلی کالج کا سرسری ذکر اور اس سے معروف ہستیوں کے تعلق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ آخری بیس سطروں میں خواجہ صاحب کی ادبی خدمات کے طور پر صرف چند کتابوں کے نام گنوائے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس مضمون سے خواجہ صاحب کی ادبی خدمات کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا جاسکا ہے۔

''پروفیسر خواجہ احمد فاروقی: جیسا میں نے انھیں پایا'' ڈاکٹر اسلم پرویز کا رقم کیا ہوا مضمون ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز دلّی کالج میں شعبۂ اردو کے اولین طلبا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا داخلہ دلّی کالج میں خواجہ احمد فاروقی کے زمانے میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی خواجہ صاحب کی نگرانی میں ہی مکمل کیا تھا۔ اس تاثراتی نوعیت کے مضمون میں انھوں نے خواجہ صاحب کی شخصیت اور سیرت، لیکچرر سے ریڈر بننے، ریڈر سے پروفیسر اور پھر ریٹائرمنٹ تک، تقرریوں کے عمل میں ان کا کردار، محنتی اور مشفقانہ شخصیت کا اثر وغیرہ کے کئی پہلوؤں سے آشکار کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے 'خواجہ احمد فاروقی صفِ اوّل کے مکتوب نگار' کے عنوان سے ایک بیش قیمتی مضمون تحریر فرمایا ہے۔ ان کے مطابق:

''خواجہ صاحب بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہیں، لیکن ان میں ایک تخلیق کار چھپا ہوا ہے۔ ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے خطوط اور خاکوں کا مطالعہ کیجیے۔ خواجہ صاحب اگر انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری کی طرف توجہ کرتے تو صفِ اول کے انشائیہ نگاروں اور خاکہ نگاروں میں ان کا نام ہوتا۔''

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 71)

'خواجہ احمد فاروقی' نمبر کے دیگر مضامین بھی معلومات سے مزین ہے۔ ان مضمون نگاروں میں عزیز قریشی، سید ضمیر حسن دہلوی، محمد نفیس حسن، ایم حبیب خاں شامل ہیں۔ اس نمبر میں ڈاکٹر آصف زمانی کی خواجہ صاحب سے گفتگو، شمیم جہاں کا مضمون 'خواجہ احمد فاروقی ادیبوں کی نظر میں' اور نمونے کے طور پر خواجہ احمد فاروقی کے مختلف مشاہیرِ ادب کو لکھے گئے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔

■

Ghulam Nabi Kumar House No.: B-20, 3rd Floor, Ghafoor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Email.: ghulamn93@gmail.com

اردو تنقید سہ زاویے

سعد مشتاق حصیری

اردو تنقید پہلے بیاض، تقریظ، تذکروں تک محدود تھی وہ بھی عربی وفارسی کے زیراثر، جب مولانا محمد حسین آزاد نے مغربی ادب کی گونج سنی، مغربی نقادوں کی صحبت ورفاقت پائی، ان سے استفادہ کیا تو آزاد نہ صرف مغربی ادب سے آشنا ہوئے بلکہ مرعوب بھی ہوئے، حتی کہ 15 اگست 1867 میں انجمن پنجاب کے ایک لکچر میں بیانگ دہل اعلان کیا:

''نئے انداز کے خلوت وزیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں، ہاں صندوق کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔''

(سید محمد نواب کریم 'اردو تنقید حالی سے کلیم تک' تخلیق کار پبلی کیشنز دہلی 1993، ص 64)

اسی لیے پروفیسر آل احمد سرور نے خوب کہا ہے کہ ''آزاد کی حیثیت نئی تنقید میں ایک نقیب کی سی ہے۔''

حاصل یہ کہ حالی سے قبل مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی اردو تنقید کا بڑا نام ہے۔ گرچہ ان کو باضابطہ حصول علم کا موقع میسر نہ آیا، دہلی وپانی پت آتے جاتے رہے، ملک کے سیاسی حالات بھی نہایت ناسازگار تھے، تعلیم جو بھی رہی ادھوری اور ناقص رہی۔ تاہم صحبت کچھ ایسے دانش وران علم وفن کی رہی کہ مزاج بھی صیقل ہوا، علم وفن میں گہرائی وگیرائی بھی پیدا ہوئی، وسعت مطالعہ دیگر ہم عصر نقادوں کی طرح بحر بے کنار نہ تھی لیکن اس میں سمندر کی سی گہرائی تھی۔ ناقابل بیان حد تک اس میں پختگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب، شیفتہ، سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، کرنل ہالرائڈ، میجر فلر اور دیگر مغربی مفکرین کی معیت ورفاقت اور استفادے نے جہاں ان کے فکر ونظر کو صیقل کیا وہیں وقت کے دھارے پر چلنے کا ان میں گن آیا، شاید اسی وجہ سے شوکت سبزواری لکھنے پر مجبور ہوئے کہ:

''انگریزی ادب کی فضا نے حالی کے خوابیدہ تنقیدی شعور کو بیدار کیا۔''

(حوالہ: نئی اور پرانی قدریں از شوکت سبزواری، مکتبہ اسلوب مسلم لیگ کوارٹرز کراچی، 1961، ص 163)

حالی نے برملا اس کا اظہار بھی کیا:

''زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا، اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی، نہ یاروں کے ابھارنے سے دل بڑھتا تھا اور نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔''

(تنقیدی شعور، از ڈاکٹر عبد القیوم اعتقاد پبلشنگ ہاؤس اردو بازار جامع مسجد دہلی، 1972، ص 182)

حالی کا مشہور شعر ہے۔

حالی آؤ اب پیروی مغرب کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہوچکی

مشرقی ادب کو نکھارنے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں حالی نے جو رول ادا کیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا حالی پر مشرق سے زیادہ مغرب کا اثر تھا، کیوں کہ ترجمے کے واسطے سے حالی، افلاطون، ارسطو، دانتے، گوئٹے، کولرج، ملٹن، لارڈ میکالے، آرنلڈ، ٹی ایس ایلیٹ، اور فرائڈ وغیرہ کے خیالات سے واقف ہوئے چنانچہ 1882 ہی میں اردو شاعری پر ایک مقدمہ لکھنے کا جذبہ ان میں موجزن ہوا۔ 9 جنوری 1882 کے مکتوب کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(مکتوبات حالی جلد دوم، ص: 162، بحوالہ مقدمہ شعروشاعری، مرتبہ وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص: 13)

ترجمہ کے واسطے سے انگریزی ماخذوں کے علاوہ حالی نے عربی وفارسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا بلکہ مشرقی مآخذ میں سب سے بڑا ماخذ 'آب حیات' ہے، ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''مقدمہ کے اردو ماخذوں میں سب سے بڑا ماخذ آب حیات ہے، جس کا اثر بجا طور پر کتاب (مقدمہ) میں نظر آتا ہے۔''

(حوالہ مقدمہ شعروشاعری مرتبہ وحید قریشی، ص: 14)

حالی سے قبل اردو تنقید اولاً تو منظم ومرتب نہ تھی اور جو بھی تھی عربی وفارسی کے زیراثر علم معانی، بیان، بدیع، قافیہ، عروض، صنائع اور بدائع، ظاہری چیزوں کے اردگرد گردش کررہی تھی پُرمغز تنقید سے آشنا نہ تھی کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''اردو تنقید کی ابتداء حالی سے ہوئی، اردو تنقید کی دنیا محذوف ومقصور کے جھگڑوں، زبان ومحاورات کی صحت، اساتذہ کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی، حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کرکے بنیادی اصول پر غوروفکر کیا...... جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت تک اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ اشاعت سوم، 2015، ص 74)

حالی کی تنقید کا اصل محور تخیل، مطالعۂ کائنات، تفحص، سادگی، اصلیت جوش، غزل کی اصلاح، قصیدے اور مرثیے کی توسیع، مثنوی کی خوبیوں کی نشاندہی، اس کی

کی کا احساس اور شاعری سے اخلاق آموزی وغیرہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ گھسے پٹے مضامین کی تکرار، پست خیالی، چھچھورے جذبات واحساسات کو اپنانے، امرد پرستی، قافیہ پیمائی کے خلاف خاموش بغاوت بھی ہے۔

حالی کی تنقیدی کاوشوں کو ایک بڑے طبقے نے سراہا بھی ہے۔ اور ہنوز ان کو داد تحسین مل رہی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں اردو کی تمام متداول اصناف شاعری پر اصول فن کے مطابق بحث کی، اور آج معنوی حیثیت سے اردو لٹریچر میں بھی مقدمہ فن تنقید کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔''

(شعر الہند جلد دوم عبدالسلام ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ 1954، ص15)

ڈاکٹر عابد حسین نے بھی اعتراف کیا ہے کہ حالی نے شعر وشاعری پر دل چسپ بحث کی ہے جس سے اردو میں علمی تنقید کی بنیاد پڑی، مزید کہتے ہیں:

''حالی نے اس مقدمے میں فن شعر خصوصاً اردو شاعری کا وہ دستور العمل مرتب کردیا ہے جو شعر کہنے اور پڑھنے والوں کے لیے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دے گا۔''

(مضامین عابد (حالی) عابد حسین کتابی دنیا لمیٹیڈ دہلی، 1947، ص77)

حالی کے تنقیدی تصورات نہ خالص مشرقی ہیں، نہ مغربی، بلکہ مغرب سے بالواسطہ استفادہ کیا ہے اس لیے اس کی حیثیت ثانوی ہے وہ اساس نہیں ہے بلکہ اپنے مشرقی تصورات کی تائید مغرب کے ادبی تصورات سے کرتے ہیں، اس کے برخلاف وحید قریشی، کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی جیسے نقادوں نے حالی پر اپنا تیکھا تیور دکھایا، ان کے کشکول میں تنقید کے جتنے تیر تھے ان سے حالی پر نشانہ سادھا، جو بقول وارث علوی کے Rational آدمی کا رویہ نہیں ہے اور بقول وہاب اشرفی ان سے ان کے اکھڑے اور متعصبانہ ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔ کلیم الدین احمد کے جملے معروف زمانہ ہیں احسن فاروقی کا تیور دیکھیے۔

''ایسی باتیں تو پڑھ کر یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ ایسا شخص کسی طرح شاعری پر تنقید کرنے کا اہل نہیں ہوسکتا۔ کم عمل کس قدر خطرناک ہوسکتا ہے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔'' (اردو تنقید، احسن فاروقی، ص47)

حالی کے مقابلے علامہ شبلی نعمانی کی تعلیم باضابطہ ہوئی۔ ابتدائی عربی، فارسی، علم کلام، فلسفہ ومنطق، فقہ وادب وغیرہ علوم اپنے وقت کے نابغہ روزگار شخصیات سے حاصل کیے، اس لیے ان کے علم میں وسعت تھی، ہمہ گیری تھی، مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھتے تھے، نثر وسوانح نگاری، تاریخ وفلسفہ، شاعری وادب اور زبان کے نشیب وفراز سے واقف تھے، انھوں نے بھی حالی کی طرح سرسید اور ان کے رجحانات سے خوب تر غذائیت حاصل کی تھی، البتہ مغربی علوم سے واقفیت محدود تھی تاہم اس وقت کے جدید تنقیدی نظریات سے اچھی طرح روشناس تھے۔ لیکن مغربی نظریات کے سیل رواں میں مشرقی خوبیوں کے خس وخاشاک کی طرح بہ جانے کے خیال نے ان میں مشرقی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا جذبہ پیدا کیا، عربی ادب کا عمومی رجحان چونکہ بہت کم ہوچکا تھا چنانچہ انھوں نے اردو اور فارسی کو اپنی جولان گاہ بنایا اور سب سے پہلے 'موازنہ انیس ودبیر' لکھی جس میں انھوں نے گرچہ حالی کی طرح جامع انداز میں تنقید کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی نہیں کی البتہ کچھ اہم مباحث پر عالمانہ گفتگو ضرور کی۔ جس سے عملی اور تقابلی تنقید کا رجحان اردو تنقید میں عام ہوا۔

موازنہ کے بعد شبلی نے سات سالوں میں شعرالعجم پانچ جلدوں میں لکھی جو تنقیدی تاریخی شاہکار سے کم نہیں۔ شبلی نے مشرقی شعریات کے حوالے سے فصاحت وبلاغت، علم معانی وبیان، علم بدیع، تشبیہات واستعارات، صنائع وبدائع، شعر کی ماہیت، لفظ ومعنی کے باہمی رشتے، آب وہوا، تمدن وماحول کا شاعری پر اثر، جغرافیائی پہلو، علم کلام اور فلسفہ تصوف وغیرہ پر پُر مغز اور وقیع کلام کیا ہے۔

الطاف احمد اعظمی نے شعر العجم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''شعر العجم میں فارسی شعرا کے کلام کا جائزہ انھیں تنقیدی اصولوں کی روشنی میں لیا گیا ہے (جو) مشرقی تنقید کے اہم اصول ہیں۔'' (بحوالہ تفہیم شبلی ص153)

علامہ شبلی نے تنقیدی تصورات گرچہ حالی اور اثر کی طرح منظم انداز میں نہیں بیان کیے ہیں، لیکن جو کچھ لکھا ہے جامع اور واضح ہے، فروگذاشت تو لازمۂ انسانی ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت وافادیت پر آنچ نہیں آتی۔

نقادوں میں ماہر القادری نے بجا لکھا ہے کہ:

''غلطی چاہے زبان وبیان کی ہو یا واقعہ وتاریخ کی اس کا پایا جانا اچھی بات نہیں مگر شبلی نے جتنا بھی تاریخی مواد جمع کردیا ہے وہ قابل تحسین کوشش اور سعی مشکور ہے۔'' (بحوالہ تفہیم شبلی ص85)

شعر العجم کا تحقیقی تجزیہ بسط وتفصیل کے ساتھ محمود شیرانی نے کیا ہے چنانچہ 'تنقیدات شعر العجم' میں بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے تحقیقی وتاریخی کوتاہیوں کو اجاگر کیا ہے اور برملا اظہار کیا ہے کہ:

''شعر العجم کے مطالعے سے میری ذاتی رائے یہ قائم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران مورخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے بڑی حد تک غافل رہے ہیں، رطب ویابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے بشرطیکہ دل چسپ ہو حوالۂ قلم کردیتے ہیں...... زیادہ تحقیق وتفتیش سے کام نہیں لیا ان سب کے باوجود شعر العجم ایک دُرِ نایاب شاہکار ہے جس کے اب تک کوئی ہمسر تصنیف نہ آسکی۔''

(حوالہ: تنقیدات شعر العجم، از محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو ہند لاہور، 1942، ص1-2)

سید امداد امام اثر (ولادت 17 اگست 1849، وفات: 17 اکتوبر 1934 ابتدائی اردو تنقید کے اہم معمار ہیں۔ جن کی تعلیم وتربیت حالی وشبلی کے مقابلے زیادہ منظم طریقے سے ہوئی اہل ثروت خاندانوں کے طرز پر عربی فارسی کی تعلیم ہوئی جس کے لیے قابل اتالیق رکھے گئے، انگریزی تعلیم تو باضابطہ اسکولوں اور کالجوں میں ہوئی، بھاگلپور سرکاری اسکول، پٹنہ، پھر بنارس کے کالج میں انہوں نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ صحبت ورفاقت بھی عربی وفارسی اور انگریزی کے بڑے بڑے اسکالروں کی رہی۔ جس کا ذکر انھوں نے کاشف الحقائق کے آغاز میں کیا بھی ہے، اثر کا مطالعہ بھی عربی وفارسی کی مبہمات کے ساتھ وسیع پیمانے پر مغربی ادب کا تھا اس کا کھلا ثبوت ان کی کاشف الحقائق ہے انھوں نے مختلف علوم وفنون پر رشحات قلم بکھیرے، مذہبی، تاریخی، زراعتی، ادبی، اور تنقیدی موضوعات پر ان کی کتابیں موجود ہیں، اثر نہ صرف انگریزی پڑھتے تھے بلکہ انگریزی میں مضامین بھی لکھتے تھے ان کا ایک انگریزی مضمون جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی پٹنہ ستمبر 1917 کے شمارے میں چھپا ہوا The Pirs : or the Muhammadon of Bihar اب ثبوت کے لیے شائع بھی کردیا گیا ہے نیز قدیم وجدید فلسفہ کی تاریخ پر ان کی تصنیف کردہ 'مرآۃ الحکما' جس کا انتساب J.M.Lewes Esquire ضلع جج بھاگلپور کے نام انگریزی زبان میں ہے ایک اہم کتاب ہے جس کا سویڈش زبان میں کیا ہوا ترجمہ کرشچیانا اور اسٹاک ہوم کی یونیورسٹیوں میں ایک زمانے تک داخل نصاب رہی جس کے متعلق سرسید احمد خاں نے فرمایا تھا کہ: ''یہ کتاب ہندوستان میں بہت قبل از وقت لکھی گئی ہے۔'' (نقوش، آپ بیتی جون 1964، لاہور ص572)

ہنوز اس کے مضبوط ثبوت وشواہد دستیاب نہیں ہوسکے ہیں جس پر قطعیت سے کچھ کہا جاسکے، البتہ کاشف الحقائق مطبوعہ 1897 کی تقریظ بہ قلم علی محسن بلگرامی کا یہ

اقتباس کسی بھی محقق کو سرے سے انکار کے بجائے ان یونیورسٹیوں کی خاک چھاننے اور اس سے پہلے رد و انکار پر نظرِ ثانی کی دعوت ضرور دیتا ہے۔ بلگرامی لکھتے ہیں:

''یہ دونوں کتابیں (مرآۃ الحکما اور کتاب الاثمار) زبان سویڈش میں ترجمہ ہوگئی ہیں اور ایک فرمان شاہ سویڈن وناروے کا بنام مصنف، مصنف کے پاس ہے، حضرت شاہ خلد اور ملکہ نے یہ دونوں کتابیں اپنی یونیورسٹیوں کو استفادۂ ملکی کے خیال سے سپرد فرمائی ہیں جیسا کہ مضمون فرمان ہے۔''

(تقریظ، کاشف الحقائق امداد امام اثر مطبع اسٹار آف انڈیا، آرہ، 1897، ص 19)

سچ یہ ہے کہ کاشف الحقائق بھی مقدمہ حالی کی تصنیف کے زمانے ہی میں لکھی گئی، اشاعت گرچہ 4 سال بعد ہوئی، کیونکہ اثر کی چالیس منتخب غزلوں کا مجموعہ 'ارمغان' کے نام سے سید نصیر الدین نے مرتب کیا ہے جو 1894 میں مطبع اسٹار آف انڈیا بہار سے چھپی اور جس کی کاپی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے اس ارمغان کے دیباچے میں سید نصیر الدین رقم طراز ہیں:

''کتاب بہارستان سخن، کاشف الحقائق، حال میں مطبع الیخ میں بھیجی گئی ہے۔''

(دیباچہ ارمغان (مرتبہ) سید نصیر الدین مطبع اسٹار آف انڈیا آرہ، 1894، ص 3)

اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مشمولات کتاب یعنی شاعری کی فطری و غیر فطری صنفیں، اغراض پھر یورپی ادب کے تقابل کا بھی ذکر کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی بحوالہ نہ سہی لیکن اپنے ایک مضمون، اردو غزل کی روایت اور فراق، پس نوشت، میں کاشف الحقائق کے مقدمہ شعر و شاعری کے چھپنے سے پہلے تصنیف کیے جانے کی بات کہی ہے۔

(اردو غزل کی روایت اور فراق پس نوشت۔ مشمولہ شب خون، اکتوبر نومبر دسمبر 1894، ص 30)

ان حقائق کے باوجود تصنیف کے بُعد زمانی کا قائل ہونا کہیں عدم تحقیق یا اکہری ذہنیت کی عکاسی تو نہیں؟

بہر حال امداد امام اثر ایک قاموسی ذہن کے مالک تھے ہر طرح کے ادب کو پڑھا۔ مغربی ادب کا بلا واسطہ مطالعہ کیا متاثر بھی ہوئے، وسیع کینوس میں انھوں نے ادبیات کا تقابل کیا، مشرقی ادب کو بے آبرو کرنے کے بجائے سرخ رو کیا گرچہ اس میں ان سے دامن اعتدال چھوٹ گیا ہو۔

مغربی ادب کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مشرق کی سربلندی بھی دکھائی ان کا مشہور قول ہے:

حالی نے عناصر شاعری، اس کے لوازمات وغیرہ کو مقصود بالذات بنا کر جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے جب کہ اثر کی تفصیل کلامی میں یہ باتیں ضمنی ہو کر رہ جاتی ہیں کھوج کرید کر نکالنی پڑتی ہیں شبلی کے نزدیک چونکہ دو نمونے موجود تھے اس لیے حالی کے اختصار اور سپاٹ زبان اور اثر کی طول کلامی اور کھردری زبان کے بین بین شبلی نے وہ باتیں جامعیت کے ساتھ دلکش پیرایے میں بیان کی ہیں۔

''یورپین شاعری کی آگہی اور معلومات سے ایشیائیوں کو بہت کچھ ملا ہے، پھر بھی یورپین شاعری ایسی نہیں کہ آنکھیں بند کر کے ان کا تتبع کیا جائے، کیوں کہ اگر ان کی شاعری سے ہمیں فائدہ پہنچ سکتا ہے، تو یورپین شاعری کو بھی ہماری شاعری سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''

(کاشف الحقائق از امداد امام اثر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2015)

امداد امام اثر کے وفور اطلاع، قوت دماغی، خوش مذاقی کا اعتراف کرتے ہوئے اختر قادری نے لکھا ہے کہ: '' کاشف الحقائق اردو تنقید کے ارتقا میں تاریخی اہمیت کی حامل ہے، اثر کا واحد تنقیدی سرمایہ اردو فن تنقید کو ان کا بیش بہا عطیہ اور ان کی ناقدانہ صلاحیت کی ایک زندہ و پائندہ یادگار ہے۔''

(بحوالہ رسالہ زبان و ادب پٹنہ اپریل 1979)

علاوہ ازیں علی محسن بلگرامی، وہاب اشرفی، ڈاکٹر عبدالخالق، سید عابد علی عابد، ناصر عباس نیر، قیوم خضر، ڈاکٹر احمد شمیم، اعجاز علی ارشد جیسے قد آور نقادوں نے اس کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ تصنیفی اعتبار سے حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری جو بہ حیثیت مقدمہ لکھا گیا اور اثر کی کاشف الحقائق جلد اول جو باضابطہ تنقید پر ایک مفصل کتاب ہے دونوں کا زمانۂ تصنیف ایک ہے، اشاعت کے اعتبار سے گرچہ کاشف الحقائق 4 سال بعد منظر عام پر آئی۔

حالی نے عناصر شاعری، اس کے لوازمات وغیرہ کو مقصود بالذات بنا کر جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے جب کہ اثر کی تفصیل کلامی میں یہ باتیں ضمنی ہو کر رہ جاتی ہیں کھوج کرید کر نکالنی پڑتی ہیں شبلی کے نزدیک چونکہ دو نمونے موجود تھے اس لیے حالی کے اختصار اور سپاٹ زبان اور اثر کی طول کلامی اور کھردری زبان کے بین بین شبلی نے وہ باتیں جامعیت کے ساتھ دلکش پیرایے میں بیان کی ہیں۔

کئی مباحث پر سب نے اپنے اپنے انداز میں گفتگو کی ہے، جیسے تخیل، تفحص، شوکت لفظی جوش، اخلاق آموزی وغیرہ جب کہ کچھ چیزیں سب کا مابہ الامتیاز ہیں۔ جیسے غزل کی اصلاح سب نے کی ہے حالی کا انداز تیور لیے ہوئے ہے اور وہ غزل سے نالاں ہیں تو اثر نے اصلاح کی خاطر ہدایت نامہ جاری کیا ہے اور پُر امید ہیں، خارجی اور داخلی کی بحث بھی اثر کی اولیات میں سے ہے۔ اثر نے عالمی ادب کا تجزیہ جس وسیع Canvas میں کیا ہے اور عالمی ادب کے تناظر میں اردو ادب کا جائزہ لیا ہے، وہ حالی و شبلی کے یہاں نہیں ہے۔

حالی کے یہاں تعریف و توصیف میں اعتدال ہے جب کہ اثر و شبلی کے یہاں افراط یا تفریط، طعن و تشنیع، تکذیب و تکفیر میں بھی حالی کا رویہ ہمدردانہ، اثر کا جارحانہ اور شبلی کا منصفانہ ہے، اظہار خیال حالی کا جامع اور مختصر ہے، اثر کا مفصل اور شبلی کا معتدل۔

ان سب کی روشنی میں اثر پر کاشف الحقائق کی پہلی جلد میں حالی ہی کی باتوں کو دہرانے یا ان سے استفادہ کا الزام شاید انصاف پر مبنی نہ ہو، ان حقائق کے باوجود مقدمۂ شعر و شاعری کی مقبولیت میں داخلی مشمولات کے ساتھ ساتھ، مرکز علم و ادب اور زرخیز علاقے سے قربت، سرسید سے وابستگی، معرکۃ الآرا تصانیف کے ذریعے پہلے سے شہرت، انداز ہمدردانہ و مصالحت آمیز اور ان کے اعلیٰ خلوص کو بہت بڑا دخل ہے، یہی باتیں شبلی میں بھی کم و بیش تھیں، لیکن مرکز و سرسید سے دور کی قربت تھی، ذہنی ہم آہنگی میں فاصلہ تھا، اس لیے شبلی کو بھی مقبولیت تو ملی لیکن اس قدر نہیں۔

اثر میں مذکورہ اسباب تقریباً مفقود تھے پھر مزید طرّہ یہ کہ خوشنودی انگریز میں ''ہدیۂ قیصریہ'' بھی لکھ دی، مذہبی رسہ کشی بھی رہی، ان سب اسباب و علل کے ساتھ ساتھ اہل اردو کا غیر متوازن رویہ بھی رہا کہ کاشف الحقائق جیسی ناقدانہ بصیرتوں سے پُر اردو تنقید کی ابتدائی کتاب کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا جو یقیناً اردو ادب کا بڑا المیہ ہے ضرورت ہے کہ ان باتوں سے بلند و بالا ہو کر تنقید کی اس ابتدائی معرکۃ الآراء کتاب سے اخذ و استفادہ کیا جائے۔

■

Saad Mushtaque Hasiri Shifa Home, A-23, Gali No: 10, New Govindpura, Krishna Nagar, Delhi - 1100051

آفاق عالم صدیقی

جنوبی ہند کا موجودہ ادبی منظر نامہ

یہ بات تو مسلم ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں سلاطین بہمنیہ نے بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے، اگر وہ دکنی زبان کو سرکاری زبان نہیں بناتے تو اردو زبان اتنی تیزی سے ہندوستان میں نہیں پھیلتی اور لوگ اس زبان کو علمی و ادبی زبان کے طور پر دل سے قبول نہ کرتے، یہ تو سلاطین بہمنیہ ہی کی دور اندیشی تھی کہ انھوں نے دکنی کو سرکاری زبان قرار دے کر اس زبان کو علمی و ادبی زبان کے اس مقام پر فائز کر دیا جس کا مقابلہ اس وقت کی کوئی دوسری ہندوستانی زبان نہیں کر سکی اور پھر یہ زبان اپنی لطافت اور شیرینی اور علمی و ادبی اظہار کی خوبیوں کی وجہ سے پورے ہندوستان پر چھا گئی۔ اب یہاں پر ایک لمحہ کے لیے بھی رک کر غور کریں تو حیرت دامنگیر ہو جائے گی کہ جنوب جس نے اردو کی نشو و نما اور ترقی میں بنیادی رول ادا کیا اور ایک نوزائیدہ زبان کے سر پر علم و ادب کا تاج رکھا اور ایسے ایسے علما و ادبا اور شعرا پیدا کیے جن کی صلاحیتوں نے شمال کی آنکھیں خیرہ کر دیں وہی جنوب اور وہی دکنی زبان جو اردو زبان کی تشکیل اور فروغ کا ضامن تھی اردو زبان و ادب کی تیز رفتار ترقی کے زمانے میں کیوں کر پیچھے چھوٹ گئی؟ اور از کار رفتہ سمجھی جانے لگی؟ اور پھر صورت حال اتنی بدل گئی کہ جنوب والوں کو صحت زبان کی سند شمال والوں سے حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات کے لیے ہمیں تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لینا پڑے گا۔ جس کا فی الحال یہاں موقع نہیں ہے۔ مگر سرسری طور پر تو اس کا ذکر کرنا ہی پڑے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ دکنی زبان کی نکھری ہوئی شعری جمالیات کا زندہ لہو جب ولی کی غزلوں کے رخسار کا غازہ بن کر دلی کے افق پر نمودار ہوا تو وہاں کے شعرا متحیر رہ گئے۔ اور پھر انھوں نے اس زبان کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنانے کی سعی شروع کر دی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ مگر ان کی تربیت چونکہ فارسی زبان اور شاعری کی گھنی چھاؤں میں ہوئی تھی اس لیے وہ لاشعوری طور پر دکن کے حسن میں شیراز کے جمال کا رنگ گھولتے چلے گئے اور پھر زمانے کے تغیر کے ساتھ دکنی کا آہنگ معدوم ہوتا چلا گیا۔ مگر یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ کیونکہ اس درمیان دکنی یا یوں کہیں کہ قدیم اردو کو کئی طرح کے انقلابات سے گذرنا پڑا۔

ہندوستان کی تاریخ کا علم رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ شمال میں رونما ہونے والے ہنگاموں اور باہمی تصادم کی فضا نے وہاں کے لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ مختلف قسم کی تنظیموں اور ان کے مذہبی اور تہذیبی احیا کے جارحانہ خروشوں نے مسلمانوں کو بھی اصلاح حال پر مجبور کر دیا اور جب اردو کے مقابلے میں ہندی زبان کو فروغ دینے کا غلغلہ بلند ہوا تو لوگوں نے اردو کو بچانے کی کوشش میں ہندوستانی الاصل دکنی کے رنگ کو رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا چنانچہ اردو فارسی کا ہندوستانی روپ نظر آنے لگا۔ اس طرح اردو، اور دکنی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتی چلی گئی اسی تسلسل میں شمال اور جنوب میں بھی ایک طرح کا حد فاصل قائم ہو گیا۔ کیوں کہ شمال کی بہ نسبت جو مختلف قسم کے ہنگاموں کی آماجگاہ بن چکا تھا، جنوب گوشۂ عافیت معلوم ہونے لگا تھا اور اتنی بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ گوشۂ عافیت میں لکھا جانے والا ادب عرصۂ محشر میں تخلیق کیے جانے والے ادب سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جنوب کے اردو ادب پر شمال میں رونما ہونے والے سیاسی اور ادبی تحریکوں اور ہنگاموں کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا ہے۔

سرسید تحریک ہو کہ حلقہ ارباب ذوق کا ادبی رجحان، حالی کی تنقیدی شدت ہو کہ انگارے کی اشاعت سے پیدا ہونے والی بے چینی۔ خلافت تحریک سے جذباتی لگاؤ ہو کہ جلیان والا باغ کا انسانیت سوز سانحہ۔ قحط بنگال کا روح فرسا واقعہ ہو کہ تقسیم وطن کے بعد پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ۔ جنوب کے ادب میں اس کی شدت کا احساس برائے نام ہی پایا جاتا ہے۔ سو

اس رویے نے بھی دونوں خطوں کے ادب میں حد فاصل قائم کرنے کی روایت کو استحکام بخشا اور ایک عرصے تک دونوں علاقوں کے قلمکار دل ہی دل میں ایک دوسرے سے منہ پھلائے رہے۔

مگر جب ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا تو ان دونوں علاقوں کے درمیان پائی جانے والی حد فاصل مٹ گئی اور ایک اجتماعی ادبی حسیت کا احساس بڑھتا چلا گیا اس کے بعد تو صورت حال اور بھی بدل گئی کیونکہ جب جدیدیت کا دور آیا تو کم و بیش ایک بار پھر جنوب کو مرکزیت حاصل ہوگئی۔ کیوں کہ جدیدیت کا سنگ بنیاد رکھنے میں یا یوں کہیں کہ جدیدیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں محمود ایاز اور ان کے رسالے سوغات نے اہم رول ادا کیا اور ایسے ایسے قلمکاروں کو متعارف کرایا جنھوں نے آگے چل کر اردو زبان و ادب کو ایک نئی سمت بخشنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک عرصہ کے تعطل کے بعد ترقی پسند تحریک کے زمانے میں جنوبی ہند کے قلمکاروں نے جب اعتماد کے ساتھ واپسی کی تو پورے اردو ادب کو اپنی صلاحیتوں سے گہربار کردیا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر زور، گیان چند جین، مخدوم، دانش فرازی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، سکندر علی وجد، عزیز قیسی، عالم خوندمیری، وحید اختر، ممتاز شیریں، صمد شاہین قاضی سلیم، بشر نواز، عوض سعید، شیخ چاند، حمید الماس، مجتبیٰ حسین، حسنی سرور، شفیق فاطمہ شعریٰ، جیلانی بانو، مغنی تبسم، کاوش بدری، اکرام باگ، حمید سہروردی، وہاب عندلیب، اسلم مرزا، مختار بدری، اقبال متین، محمد علی اثر، خورشید احمد جامی، مظہر الزماں خان، بیگ احساس، شاہ حسین نہری، علی ظہیر، خالد سعید، خالد قادری، راہی فدائی، خلیل مامون، رفیعہ منظور الامین، ساجد حمید، سلیمان خمار، علیم صبا نویدی، وغیرہ کی ادبی خدمات نہ صرف یہ کہ جنوبی ہند کے تناظر میں لائق توجہ اور قابل ستائش ہیں بلکہ پوری اردو دنیا کے ادبی تناظر میں بھی خصوصی توجہ کی حقدار ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی بھی عہد میں بہ یک وقت تین نسلوں کے قلمکار سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کسی علاقے یا عہد کے حالیہ ادبی منظر نامے کا ذکر ہوگا تو اس میں ان تینوں نسل کے فنکاروں کو شامل کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اس تخلیقی عہد یا عرصے کا چہرہ واضح نہیں ہوگا۔ اس وقت جنوب کا موجودہ ادبی منظر نامہ جن پیش رو قلمکاروں کی وجہ سے خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ان میں شاہ حسین نہری، خلیل مامون، مصحف اقبال توصیفی، اسلم مرزا، اقبال

سرسیدتحریک ہو کہ حلقہ ارباب ذوق کا ادبی رجحان، حالی کی تنقیدی شدّت ہو کہ انگارے کی اشاعت سے پیدا ہونے والی بے چینی، خلافت تحریک سے جذباتی لگاؤ ہو کہ جلیان والا باغ کا انسانیت سوزسانحہ، قحط بنگال کا روح فرساواقعہ ہو کہ تقسیم وطن کے بعد پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ۔ جنوب کے ادب میں اس کی شدّت کا احساس برائے نام ہی پایا جاتا ہے۔ سو اس رویے نے بھی دونوں خطوں کے ادب میں حد فاصل قائم کرنے کی روایت کو استحکام بخشا اور ایک عرصے تک دونوں علاقوں کے قلمکار دل ہی دل میں ایک دوسرے سے منہ پھلائے رہے۔

متین، خالد سعید، مختار بدری، م۔ن سعید، ڈاکٹر سحر سعیدی، عارف خورشید، سلیمان اطہر جاوید، حمید سہروردی، اکرام باگ، محمد علی اثر، بیگ احساس، مظہر الزماں خاں، راہی فدائی، پروفیسر ایس ایم عقیل اور مرحوم علی ظہیر وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ خلیل مامون کی انفرادیت یہ ہے کہ نثری نظم کا جتنا سرمایہ وہ بھی دانشورانہ فراست کا حامل ان کے یہاں پایا جاتا ہے وہ ہندوستان میں کسی شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نثری نظم ہی کے حوالے سے علی ظہیر اور شائستہ یوسف بھی مستحکم شناخت بنا چکی ہیں۔ مصحف اقبال توصیفی جدید فکر و نظر کے حامل ایسے غزل پسند شاعر ہیں جن کی نظمیں بسا اوقات ان کی غزلوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ مگر ان کا کمال یہ ہے کہ وہ غزل کی کلاسیکی روایت کو جدیدیت کے آہنگ میں حل کر کے ایک نیا آہنگ دریافت کرلیتے ہیں اس طرح ان کی غزلیں غزلوں کے انبار میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہیں۔ اسلم مرزا ان دنوں اپنے فنکارانہ کمال کی بہ نسبت محققانہ فکر و نظر کی وجہ سے توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ مرحوم اقبال متین کے افسانے کرشن چندر کی رومانیت خیز فضا میں فنکارانہ ہنرمندی کے اضافے اور دانشورانہ بصیرت کی بازیافت کے احساس کے باوجود اپنا منفرد وژن رکھتے ہیں۔ اور گم کردہ اقدار کے ملال کو فسوں کاری کے احساس کے ساتھ پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ مظہر الزماں خان کے افسانے ذہنی جھماکے کی تابکاری کے باوصف ایسے علامتی رنگ کی نمائندگی کرتے ہیں جنھیں ادب کے عام قارئین کی بہ نسبت سنجیدہ اور ذہین قارئین زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور ان کے مطالعے سے بصیرت کے ساتھ ساتھ ذہنی آسودگی بھی حاصل کرتے ہیں۔

شاہ حسین نہری زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جب شاعری کرتے ہیں تو شاعرانہ حسن کے ساتھ ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال اور برتاؤ کی وجہ سے بھی قاری کو مبہوت کردیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ قاضی سلیم اور بشر نواز کے بعد وہ اورنگ آباد کے سب سے اہم شاعر ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور اس اعتماد اور خود آگاہی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ ادھر انھوں نے کثرت سے رباعیاں کہہ کر اور رباعیوں کا دیوان پیش کرکے رباعی گوئی کی روایت کو بڑی تقویت پہنچائی ہے۔

پروفیسر محمد علی اثر نے دکنیات کے مطالعے میں تقریباً مکتبہ فکر کی سی اہمیت حاصل کرلی ہے، وہ اس وقت اردو دنیا کے معدودے چند ماہرین دکنیات میں شمار ہوتے ہیں اور عام طور پر دکنی ادب پر ہونے والی ہر گفتگو میں یاد کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر م۔ن سعید نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسائل پر اپنی تحقیقی کتاب پیش کرکے قدیم سرمایہ ادب کے محققین میں اپنا نام درج کرالیا ہے۔

مختار بدری، علیم صبا نویدی اور پروفیسر سید سجاد حسین اس وقت تمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کے اہم ستون کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ علیم صبا نویدی ایسے ہمہ جہت قلمکار ہیں جن کے تمام پہلوؤں پر بہ یک وقت نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مختار بدری کبرسنی کے باوجود نت نئے موضوعات پر علمی اور تحقیقی نوعیت کی کتابیں تسلسل کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔ پروفیسر سید سجاد حسین بنیادی طور پر تحقیق و تنقید سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اپنی فعالیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے نام پر ہونے والے ہر پروگرام میں شریک ہوتے ہیں۔

عارف خورشید ہمہ جہت قلمکار ہیں۔ افسانہ نگاری ہو کہ تنقید نگاری یا پھر رسالے کی ادارت وہ ہر جگہ اپنی موجودگی درج کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سحر سعیدی تحقیق و تنقید سے یکساں شغف رکھتے ہیں۔ اور عام طور پر تحقیقی نوعیت کی تنقید لکھ کر اپنے مطالعے کی وسعت کا احساس دلاتے ہیں، اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے تحقیق کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑنے میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ راہی فدائی جدیدیت کے ہمنوا ایک تجربہ پسند شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے مشکل زمینیں نکالنے

اور عربی النسل لفظوں کی جدّت خیز شعری ترکیب سازی کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری مذاق عام سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔ علی ظہیر جدیدیت کی تخلیقی روش کو استحکام بخشنے والے شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جمالیاتی کیف کا احساس اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ اس سے صرف نظر کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ ان کا لہجہ دھیما مگر روشن ہے وہ عام طور پر وقت کو اپنی نثری نظموں کے بیانیہ میں اس طرح گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں، گویا یہ بھی کوئی گرفت میں آنے والی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں اختر الایمان کی طرح وقت ہر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے، مگر وہ شاعر کی فنکارانہ گرفت میں بھی نہیں آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کا مشاہدہ اور ان کی حسیت زندگی کے معمولی واقعات سے مابعد الطبیعیاتی مسائل تک کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔ اور نظم کو ایک ماوراء گرفت کیفیت سے معمور کر دیتی ہے۔

خالد سعید جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھے ناقد ہیں۔ ان کی منصفانہ تنقید کا ہر کوئی قائل ہے۔ عام طور پر وہ جس عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام ابعاد کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے تمام سیاق سے واقفیت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے تنقیدی مطالعے کی خوبیوں کو مخدوم کی شاعری اور عزیز احمد کے ناول پر لکھے گئے ان کے مضامین میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ حمید سہروردی اور اکرام باگ جدید افسانوی دنیا کے اہم نام ہیں۔ اکرام باگ اپنے تجریدی افسانوں کی وجہ سے آپ ہی اپنی مثال ہیں۔ کیوں کہ ان کی روایت کو آگے بڑھانا آسان کام نہیں ہے۔ البتہ ان کے افسانوں کی زبان کے حسن کے بارے میں دعوے سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے، ابھی ابھی ان کے افسانوں کا مجموعہ 'اندوختہ' کے نام سے شائع ہوا ہے یہ جنوب کے وہ تازہ وپیش رو قلمکار ہیں جو ادب میں اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ جب کہ دوسری نسل کے قلمکاروں میں سے بھی کئی لوگ اپنی موجودگی درج کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ایسے قلمکاروں میں ساجد حمید، انور مینائی، شائستہ یوسف، حلیمہ فردوس، سلیمان خمار، مرحوم یوسف عارفی، مرحوم ناظم خلیلی، محسن جلگانوی، اور رؤف خیر وغیرہ کے نام کافی نمایاں ہیں۔ ساجد حمید نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور شعوری طور پر رائج غزلیہ لہجہ سے انحراف کرتے ہیں یہی انحرافی رویہ ان کی غزلوں کو قابل توجہ بناتا ہے۔ حلیمہ فردوس ہمہ جہت

خالد سعید جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھے ناقد ہیں۔ ان کی منصفانہ تنقید کا ہر کوئی قائل ہے۔ عام طور پر وہ جس عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام ابعاد کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کے تمام سیاق سے واقفیت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے تنقیدی مطالعے کی خوبیوں کو مخدوم کی شاعری اور عزیز احمد کے ناول پر لکھے گئے ان کے مضامین میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ حمید سہروردی اور اکرام باگ جدید افسانوی دنیا کے اہم نام ہیں۔

شخصیت کی مالک ہیں۔ مگر اب وہ ایک مطالعہ پسند ناقد کی حیثیت سے زیادہ پہچانی جاتی ہیں۔ شائستہ یوسف کی نظمیں ہوں کہ غزلیں وہ حسیاتی لمس سے اس قدر آسودہ ہوتی ہیں کہ بسا اوقات قاری واضح طور پر ان کی تھرتھراہٹ محسوس کرنے لگتا ہے اور ایک خاص طرح کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور جب اس کیفیت سے باہر آتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس نے تخلیقی کرب کی لذت کا ادراک کر لیا ہے۔ کسی بھی فنکار کا اپنے قاری کو اپنے تجربے میں شامل کر لینا اس کے فنکارانہ کمال کی دلیل ہے۔

سلیمان خمار اور رؤف خیر غزل کے مشہور شاعر ہیں۔ رؤف خیر کو شعر و سخن کے علاوہ تحقیق و تنقید سے بھی دلچسپی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر اس طرح کے مضامین لکھتے رہتے ہیں جو کافی معلوماتی ہوتے ہیں اور نئے موضوعات سے ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات وہ پرانے موضوعات اور پرانے فنکاروں کی زندگی کے کچھ ایسے پہلوؤں کو بھی آئینہ کر دیتے ہیں جنھیں بعض لوگ پسند نہیں کرتے ہیں۔ مگر ادب اور علم کی دنیا میں ایمانداری اور غیر جانبداری کا تقاضا یہ ہے کہ علم و ادب اور ادبا و شعرا کی زندگی اور فن کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے، تا کہ فنکار اپنی زندگی اور اپنے فن کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پہچانا جاسکے۔

سلیمان خمار غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی خوب کہتے ہیں۔ ایک عرصے تک وہ اپنے اہم ہمعصروں اور بزرگ شعرا سے کافی متاثر رہے۔ اتنے متاثر کہ اپنی شاعری کو بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مگر ان دنوں تخلیقی انفرادیت کے احساس کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں اور خوب شائع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے اہم قلمکاروں کی تخلیق کردہ فضا میں جو بالکل تازہ نسل افق ادب پر نمودار ہوئی ہے اور جس کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اسے نظر انداز کرنا کسی بھی طرح ممکن نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس نسل کے پاس جہاں ایک طرف حافظ کرناٹکی جیسی ہمہ جہت شخصیت ہے وہیں عمر کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ کوثر پروین، فاطمہ زہرہ، امجد جاوید، سمیرا حیدر، اکرم نقاش، اقبال خسرو قادری، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، ڈاکٹر فرزانہ محتشم، غفران امجد، انیس صدیقی، سلمیٰ صنم، مسرور تمنا، غضنفر اقبال اور منظور احمد دکنی جیسے فعال قلمکار بھی ہیں جو اپنی تخلیقی ثروت مندی اور ناقدانہ بصیرت کا لگاتار ثبوت پیش کر رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض قلمکاروں کے یہاں ابھی تک صحت زبان کا مرحلہ طے نہیں ہوا ہے۔ مگر ان کے جوش و جذبے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ایک دن وہ زبان و بیان پر قابو پالیں گے اور اپنی انفرادی شناخت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بیگ احساس بنیادی طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی پختہ کاری کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے افسانوں کی فنکارانہ بنت اور اس کی طلسماتی کیفیت کے ساتھ اسے انجام تک پہنچانے کی ہنر مندی اور زندگی کے واقعات و حادثات کو افسانے میں بدل کر ابدیت بخشنے کی وجہ سے بھی امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

امجد جاوید زندگی کے زائیدہ تجربوں کو افسانے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر کامیاب بھی رہتے ہیں۔ مگر زبان کے ساحرانہ استعمال اور بیان کی جادوئی کیفیت کو پوری طرح نہیں سنبھال پاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے افسانے نظر انداز نہیں کیے جاتے ہیں۔ جبکہ کوثر پروین بھی اپنے افسانوں کی بنت اور زندگی کے رنگوں سے کہانی کشید کرنے کی ہنر مندی کی وجہ سے قابل توجہ نظر آتی ہیں۔ فاطمہ زہرہ جب شاعری کرتی ہیں تو وہ صرف شاعرہ ہی نظر آتی ہیں، اور جب تنقید لکھتی ہیں تو اپنی شعریت کو بالکل بھی پاس نہیں پھٹکنے دیتی ہیں جو ایک بڑی خوبی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعرہ ہی کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی شاعری نسائی جذبات و احساسات کی آئینہ دار ایسی شاعری ہے جس میں ایک

معصوم گھریلو عورت کے تجربات اس خوبی سے ابلاغ پاتے ہیں کہ قاری اس سے ایک خاص طرح کی قربت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اکرم نقاش، اقبال خسرو قادری، اور مقبول احمد مقبول کے علاوہ فرزانہ محتشم اور غفران امجد آج کے نہایت فعال اور قابل توجہ فنکار ہیں۔ اکرم نقاش کے یہاں کلاسیکی روایت کا احترام اور اس روایت سے عطر کشید کرنے کی کاوش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہی چیز ان کی شاعری کے رگ و ریشے کو معطر کرتی ہے۔ اقبال خسرو قادری کے یہاں جدیدیت سے قربت کا شدید ترین احساس پایا جاتا ہے۔ مگر وہ جدیدیت کے رنگ و آہنگ کو اپنے تخلیقی جوہر کا لہو بنانے کی صلاحیت کی وجہ سے اپنے تخلیقی ذہن کا احساس دلانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مقبول احمد مقبول غزلوں کے علاوہ رباعیوں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'احساس وادراک' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں رباعی کے فن کی باریکیوں اور اس کے موضوعات کی خصوصیات کا بھی علم ہے۔ ویسے انھیں تحقیق وتنقید سے بھی شغف ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے ہمعصروں کی بہ نسبت عمدہ نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ فرزانہ محتشم کو شاعری اور مزاح نگاری دونوں سے دلچسپی ہے۔ ان کی مزاح نگاری ان کی ذہانت کے ساتھ ساتھ چیزوں کو گہرائی سے دیکھنے کی ان کی خوبی اور ان کے مضحک پہلوؤں کو دریافت کرلینے کی ان کی طباعی کا بھرپور احساس دلاتی ہے۔ جبکہ وہ رومانی انداز کی مختصر نظمیں بھی بڑی عمدگی سے تخلیق کرلیتی ہیں۔

غفران امجد غزل کے عمدہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری کی زبان کی نزاکت اور اس کے حسن سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں عام طور پر قاری کا دامن دل تھامنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ انیس صدیقی، غضنفر اقبال، اور منظور احمد دکنی کے یہاں ادبی مرحلوں اور تنقیدی گھاٹیوں کو خیر وخوبی سے پار کرجانے کا امکان روشن ہے۔ مگر بہت سے ایسے قلمکار بھی سرگرم عمل ہیں جو محض اپنے ہم چشموں کی واہ واہی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ایسے قلمکار اب تک ادب وتنقید کے بنیادی قواعد اور لوازمات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر وہ جس انہماک سے قلمکاری میں لگے ہوئے ہیں اس سے امید بندھتی ہے کہ ایک دن وہ خواب غفلت سے جاگیں گے اور ادب کی بلند تقدیر پر ایمان لاکر اپنے قلم اور قرطاس دونوں کی

جنوبی ہند کے موجودہ ادبی منظر نامہ کے اس سرسری جائزے سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح جنوبی ہندنے ولی دکنی کی شکل میں اردو غزل کو ایک آئیڈیل دیا تھا وہ روایت کم و بیش آج بھی قائم ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی شکل میں جہاں اردو والوں کو پہلی بار لسانیاتی اور صوتیاتی مطالعے کی اہمیت کا اندازہ ہوا وہیں ادبی جمود کو توڑ کر ایک نئے طرز اور احساس کے حامل ادب کی تخلیق کی راہ محمود ایاز کی ذہانت اور ان کے رسالے سوغات نے دکھائی۔ اپنے وقت کی معتوب صنف شاعری نثری نظم کو مستحکم کرنے کی کامیاب ترین کوشش کے طور پر خلیل مامون، اورشائستہ یوسف وغیرہ سامنے آئے اور نثری نظم کے لیے فضا کو سازگار بنایا۔

لاج رکھ لیں گے۔ مسرور تمنا تازہ کار افسانہ نگار ہیں، اور زندگی کے سچے سلگتے واقعات کو افسانوی رنگ دینے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ مگر موثر ہوتی ہے۔ وہ عام طور پر اختصار سے کام لیتی ہیں اس لیے ان کے یہاں کردار نگاری، اور منظر نگاری وغیرہ سے زیادہ صورت واقعہ کی سنگینی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال بالخصوص افسانوں کی تنقید سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ عام طور پر اس کے بعد کے افسانوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور حتی المقدور ان افسانوں کے معیار ومنہاج کو بھی واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیس صدیقی کی تحقیقی کتاب 'کرناٹک میں اردو صحافت' ان کے تحقیقی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ وہ عام طور پر مختصر اور سادہ جملے لکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات کم سے کم لفظوں میں کہہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے میں جھجک سے کام لیتی ہے مگر قدم بہ قدم ساتھ چلنے کی خواہش میں اضافہ کردیتی ہے۔

سلمیٰ صنم اور سمیرا حیدر کی فکر میں توانائی تو پائی جاتی ہے مگر ان کے افسانوں کی بنت اور فضا سازی کبھی کبھار ہی قاری کو مبہوت کرپاتی ہے۔ نئے اور تازہ ترین قلمکاروں میں جاویدہ حبیب، مہرافروز، اسرار الحق سبیلی اور عبداللہ ریاض سلمان قاسمی وغیرہ نے کافی پیش رفت کی ہے۔

جنوبی ہند کے موجودہ ادبی منظر نامہ کے اس سرسری جائزے سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح جنوبی ہندنے ولی دکنی کی شکل میں اردو غزل کو ایک آئیڈیل دیا تھا وہ روایت کم وبیش آج بھی قائم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی شکل میں جہاں اردو والوں کو پہلی بار لسانیاتی اور صوتیاتی مطالعے کی اہمیت کا اندازہ ہوا وہیں ادبی جمود کو توڑ کر ایک نئے طرز اور احساس کے حامل ادب کی تخلیق کی راہ محمود ایاز کی ذہانت اور ان کے رسالے سوغات نے دکھائی۔ اپنے وقت کی معتوب صنف شاعری نثری نظم کو مستحکم کرنے کی کامیاب ترین کوشش کے طور پر خلیل مامون، اور شائستہ یوسف وغیرہ سامنے آئے اور نثری نظم کے لیے فضا کو سازگار بنایا۔ جب کہ ممتاز شیریں نے اس کلیہ کو ہی رد کردیا کہ کوئی بھی خاتون قلمکار عمدہ تنقید نگار نہیں بن سکتی ہے۔ علیم صبا نویدی جدید اصناف ادب کی ترویج اور نت نئے شعری تجربوں کے لیے دور تک پہچانے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاست تمل ناڈو کی حد تک وہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے ماڈل کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ تو غلط نہ ہوگا۔

ممتاز شیریں کی روایت کو آگے بڑھانے میں حلیمہ فردوس نے خاطر خواہ پیش رفت کی ہے، اردو ادب اطفال جو اردو ادب کے مرکزی دھارے سے کٹ چکا تھا اسے مرکزی دھارے میں شامل کرانے اور اسے ہر پہلو سے زرخیز اور ثروت مند بنانے میں حافظ کرناٹکی نے بنیادی رول ادا کیا۔ مجتبیٰ حسین نے پوری اردو دنیا میں مزاحیہ ادب کی گرتی ہوئی ساکھ کو نہ صرف یہ کہ سہارا دیا بلکہ اسے مقبول عام بنانے میں نمایاں ترین کردار ادا کیا۔ وحید واجد اور انور مینائی نے عروضی مہارت کے حوالے سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو ساغر کرناٹکی اور شاد باگل کوٹی نے دوہا نگاری کے حوالے سے جنوبی ہند کی نمائندگی کی۔ تو سید خالد قادری نے آج کے عہد میں تنقید کی گرتی ہوئی ساکھ کو نہ صرف یہ کہ سنبھالا ہے بلکہ مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے تناظر میں نئی نسل کی تنقید نگاری کو وقار بھی بخشا ہے۔ سو اس تناظر میں ہم بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ جنوبی ہند کا موجودہ ادبی منظر نامہ اردو دنیا کے کسی بھی مخصوص خطے یا علاقے کے ادبی منظر نامے سے کم تر نہیں ہے۔ مگر اسے مزید فعال اور لائق اعتبار بنانے کی ضرورت ہے۔

■

Dr. Afaq Alam Siddiqui Zubaida Digree College, jai Nagar, Post Box No.:6, Shikaripur, Shemoga- 577427 (Karnataka)

کمپیوٹر کیا ہے؟

(What Is a Computer)

ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ جدید ٹکنالوجی کا دور ہے۔ آج دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا، جس نے کمپیوٹر کا نام نہ سنا ہو۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے اکثر افراد کمپیوٹر کے بارے میں جانتے ہیں، لیکن جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں، وہ کمپیوٹر کو ایک ایسی مشین سمجھتے ہیں، جو سارے کام کرسکتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کمپیوٹر کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ اس سے سارے کام کیے جاسکتے ہیں، صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کمپیوٹر بہت کچھ کرسکتا ہے اور وہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ اور کوئی غلطی کیے بغیر۔ کمپیوٹر کی اس تیزی اور بغیر کسی غلطی کے کام کو انجام دینے کی صلاحیت کی وجہ سے، پوری دنیا میں اسے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہورہا ہے۔

آیئے، سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کمپیوٹر آخر ہے کیا۔ آپ نے کیلکولیٹر کا نام سنا ہوگا۔ کیلکولیٹر سے ہم حساب لگانے کا کام کرتے ہیں، جیسے جوڑنا، گھٹانا وغیرہ۔ کمپیوٹر بھی اسی طرح کی ایک الیکٹرانک مشین ہے لیکن کمپیوٹر سے ہم جوڑنے، گھٹانے جیسے حساب کا کام لینے کے علاوہ بھی اور بہت سے کام کراتے یا کرتے ہیں۔ کمپیوٹر کی زبان میں اسے ڈاٹا پروسیسنگ کہتے ہیں۔ ڈاٹا پروسیسنگ کو سمجھنے کے لیے، ڈاٹا کو سمجھنا ضروری ہے۔

ڈاٹا (Data)

کسی چیز کے بارے میں کسی تفصیل یا جانکاری کو 'ڈاٹا' کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جس قلم سے ہم لکھتے ہیں، اس کے بارے میں کئی معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں، جیسے قلم کا وزن، اس کا رنگ، اس کی لمبائی، اس کی قیمت، قلم کو بنانے والی کمپنی کا نام وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح، کسی طالب علم کے بارے میں یہ تفصیلات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ نام، رول نمبر، یوم پیدائش، والد کا نام، کلاس یا درجہ، اس کے ذریعے منتخب کیے گئے مضامین، گھر کا پتہ، فون نمبر وغیرہ۔ انھیں معلومات یا تفصیلات کو 'ڈاٹا' کہتے ہیں۔

ڈاٹا عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔ نمبری (Numeric) اور حرفی نمبری (Alpha-numeric)۔ ہندسوں (Digits) سے بنے ہوئے ڈاٹا کو نمبری ڈاٹا کہا جاتا ہے، جیسے رول نمبر، لمبائی، حاصل کیے گئے نمبرات، بنیادی تنخواہ وغیرہ۔ نمبری ڈاٹا میں ہم صرف 0، 1، 2، 3، 4، 5، 6، 7، 8 اور 9 ان دس نمبروں کا استعمال کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اعشاریہ نقطہ (.)، جمع (+) اور تفریق (-) کے نشانات کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ جوڑنا، گھٹانا، ضرب کرنا، تقسیم کرنا وغیرہ حسابیاتی کاموں کو صرف نمبری ڈاٹا پر ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔ حرفی نمبری ڈاٹا اُس ڈاٹا کو کہا جاتا ہے، جس میں حروف اور اعداد سمیت کسی بھی نشان کا استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسے گھر کا پتہ، کسی کتاب کا عنوان، کوئی خط یا مضمون، کسی کمپنی کا نام وغیرہ۔ حرفی نمبری ڈاٹا پر جوڑنا، گھٹانا وغیرہ حسابیاتی کاموں کو نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہم ان کی جانچ یا موازنہ (Comparison) کرسکتے ہیں۔

استعمال کے مطابق ڈاٹا دوسری قسم کے بھی ہوتے ہیں، جن کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔ کمپیوٹر میں ہر قسم کے ڈاٹا کو پڑھا جاسکتا ہے، اسے جمع (اسٹور) کیا جاسکتا ہے اور چھاپا (شائع) بھی کیا جاسکتا ہے۔

معلومات (Information)

یوں تو ہمارے پاس کئی قسم کے ڈاٹا کا ذخیرہ ہوتا ہے، لیکن وہ سارا ہمارے لیے ہمیشہ کارآمد نہیں ہوتا، کیونکہ ڈاٹا الگ الگ بکھرے ہوئے غیر منظم ہوتے ہیں، جن کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں لیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر، کسی کلاس میں پڑھنے والے لڑکوں کی الگ الگ عمر ہمارے لیے ڈاٹا ہے، لیکن ہمیں اس کلاس کی اوسط عمر (Average Age) کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے لیے کارآمد ہے۔ کارآمد ڈاٹا کو کمپیوٹر کی زبان میں 'معلومات' (انفارمیشن) کہا جاتا ہے۔ ہم ڈاٹا جمع ہی اس لیے کرتے ہیں کہ اس میں سے معلومات حاصل کرسکیں۔ اس کے لیے ہمیں ڈاٹا پر کچھ خاص کام کرنے پڑتے ہیں، جیسے طالب علموں کی الگ الگ عمر میں سے اوسط عمر حاصل کرنے کے لیے پہلے ہم ان سب کی عمر کو جوڑیں گے، پھر سبھی طالب علموں کو شمار کریں گے اور اخیر میں عمر کے کل جمع میں طالب علموں کی تعداد (یا گنتی) سے تقسیم کریں گے۔ اس سے ان کی اوسط عمر نکل آئے گی۔ الگ الگ طالب علموں کی عمر ہمارے لیے صرف ڈاٹا ہے۔ اس کے مقابلے اوسط عمر ہمارے لیے زیادہ کارآمد ہے، اس لیے یہ معلومات ہے۔

ڈاٹا پروسیسنگ (Data Processing)

الگ الگ عمر سے اوسط عمر نکالنے کے لیے ہمیں جوڑنا، شمار کرنا، تقسیم کرنا وغیرہ جو کام کرنے پڑے، انھیں 'پروسیسنگ' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈاٹا سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان سب کاموں کو 'ڈاٹا پروسیسنگ' کہا جاتا ہے۔ ڈاٹا پروسیسنگ ہم کاغذ، قلم لے کر ہاتھ سے بھی کرسکتے ہیں، لیکن آج کل ہم یہ کام کمپیوٹر کی مدد سے کرتے ہیں۔ کمپیوٹر چونکہ ایک الیکٹرانک مشین ہے، اس لیے اس سارے عمل کو 'الیکٹرانک ڈاٹا پروسیسنگ' (Electronic Data Processing) یا مختصراً ای ڈی پی (EDP) کہا جاتا ہے۔

کمپیوٹر کی اہمیت (ImportanceofComuters)

کمپیوٹر کی اہمیت کے بارے میں آج کل ہر وہ شخص جانتا ہے، جس نے اس کا نام سن رکھا ہے۔ بڑی بڑی کمپنی اور سرکاری دفاتر میں ڈاٹا کو اسٹور کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے میں تو کمپیوٹر کا استعمال ہوتا ہی ہے، بجلی اور ٹیلی فون کے بل بنانے، ریل گاڑیوں میں برتھ یا سیٹ کا ریزرویشن (Reservation) کرنے جیسے عام لوگوں کے کاموں میں بھی کمپیوٹر کا بہت استعمال ہونے لگا ہے۔ تعلیم اور تفریح کے میدانوں میں بھی کمپیوٹر کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا جارہا ہے۔ آج کی بھاگ دوڑ والی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں کمپیوٹر کا استعمال ایک طرح سے ضروری ہوگیا ہے، کیونکہ کمپیوٹر سے ہمارے بیش قیمتی وقت کی بچت ہوتی ہے۔ دوسری جانب، اعداد و شمار میں لگاتار ہورہے اضافے کے سبب انسانی ذہن میں اسے محفوظ کرپانا بہت مشکل ہوگیا ہے، ایسے میں کمپیوٹر ہی وہ واحد آلہ (مشین) ہے، جو ہمارے ضروری اعداد و شمار کو ایک جگہ پر اور زیادہ دنوں تک کے لیے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

کمپیوٹر بنام انسان

(Computer Vs. Human Being)

کمپیوٹر کے اتنے سارے کاموں کو دیکھ کر آپ

سوچتے ہوں گے کہ اس میں دماغ ہوتا ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک چھوٹے کیڑے کے برابر بھی دماغ نہیں ہوتا، بلکہ کمپیوٹر صرف انہی کاموں کو انجام دیتا ہے، جن کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ گویا کہ کمپیوٹر ہمارے حکم کا غلام ہے۔ ہمیں اسے چھوٹے سے چھوٹا کام کرانے کے لیے بھی پوری ہدایت دینی پڑتی ہے۔ ہدایتوں کے بغیر کمپیوٹر ایک بھی کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہماری طرف سے دی گئی ہدایت صحیح ہوگی، تو کام بھی صحیح ہوگا، لیکن اگر ہدایت غلط ہوئی، تو کام بھی غلط ہوجائے گا۔ کمپیوٹر کو صحیح ہدایت دینا اور اس سے بڑے بڑے کام کرالینا بھی ایک فن ہے۔

کمپیوٹر کے کام کرنے کے طریقے کا موازنہ ہم خود اپنے کام کرنے کے طریقے سے کرسکتے ہیں۔ ہم اپنے کانوں سے سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر کوئی بات سمجھتے ہیں، اپنے دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں اور اسے یاد رکھتے ہیں اور اپنے ہاتھ پیر یا منھ سے اس کا جواب دیتے ہیں، یعنی ایکشن (Action) لیتے ہیں۔ کمپیوٹر بھی تقریباً اسی طرح کا کام کرتا ہے۔ اپنی ان پُٹ یونٹ (Input Unit) سے وہ ڈاٹا اور ہدایت لیتا ہے، میموری (Memory) میں انھیں اسٹور (جمع) کرتا ہے، پروسیسر (Processor) پر اس پر عمل کرتا ہے اور آؤٹ پٹ یونٹ (Output Unit) پر نتیجہ دیتا ہے۔ لیکن انسان اور کمپیوٹر میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ہمارے کام کرنے کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے، جبکہ کمپیوٹر کے کام کرنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ اسی لیے حساب کتاب کا جو کام ہم گھنٹوں میں کرپاتے ہیں، کمپیوٹر اسے سیکنڈ میں کر ڈالتا ہے۔ دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ پوری طرح ایک مشین ہونے کے سبب کمپیوٹر نہ تو انسان کی طرح تھکان محسوس کرتا ہے اور نہ ہی کسی کام سے گھبراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمپیوٹر ایک جیسے کام کو متعدد بار اسی رفتار اور درستگی سے، بغیر یکسوئی کھوئے انجام دے سکتا ہے۔

کمپیوٹر بنام کیلکولیٹر

(Computer Vs. Calculator)

بعض لوگ کمپیوٹر کو ایک معیاری قسم کا کیلکولیٹر ہی سمجھتے ہیں۔ ایسا سوچنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ کیلکولیٹر میں ہم صرف حسابیات سے متعلق کاموں کو ہی انجام دے سکتے ہیں، جیسے جوڑنا، گھٹانا، ضرب کرنا یا تقسیم کرنا وغیرہ، جبکہ کمپیوٹر میں ہم اس سے کہیں زیادہ کاموں کو انجام دے سکتے ہیں۔ کیلکولیٹر اور کمپیوٹر میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ کیلکولیٹر ہمارے ڈاٹا کو اسٹور کرکے نہیں رکھ سکتا، جبکہ کمپیوٹر میں ڈاٹا کا ذخیرہ جمع کرکے رکھا جاسکتا ہے۔

تصویر C-1.1: کمپیوٹر کے کام کرنے کا طریقہ

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیلکولیٹر ہماری ہدایت کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ ہمیں اس سے جتنی بھی بار جوڑنے کا کام لینا ہوتا ہے، اتنی ہی بار ہمیں '+' بٹن دبانا پڑتا ہے لیکن کمپیوٹر میں ہم اپنی بہت ساری ہدایات (یعنی پروگرام) بھر سکتے ہیں اور آٹومیٹک (خودکار) طریقے سے ان پر عمل کراسکتے ہیں۔

کمپیوٹر بنام ٹائپ رائٹر

(Computer Vs. Typewriter)

بہت سے لوگ کمپیوٹر کو ٹائپ رائٹر کا بڑا بھائی یا کوئی چھوٹی موٹی پرنٹنگ مشین ہی مانتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ٹائپ رائٹر میں ہم ایک بار ٹائپ کرکے زیادہ سے زیادہ صفحات چھپوا سکتے ہیں، جس کی چار یا پانچ کاربن کاپی بھی نکل سکتی ہیں، لیکن کمپیوٹر میں ہم ایک بار میں سیکڑوں صفحات کی رپورٹ پرنٹ کرسکتے ہیں اور اسے دوبارہ ٹائپ کیے بغیر جتنی بار چاہیں، اتنی بار پرنٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ کمپیوٹر میں ہم کسی رپورٹ میں اپنی مرضی کے مطابق ترمیم واضافہ کرکے اسے دوبارہ پرنٹ کرسکتے ہیں۔ یہ کام ٹائپ رائٹر میں کبھی بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کمپیوٹر کی خصوصیات

(Characteristics of Computer)

اب تک آپ کو کمپیوٹر کی بہت سی خصوصیات کا علم ہوگیا ہوگا۔ اپنی انھیں خصوصیات (خوبیوں) کے سبب کمپیوٹر آج کل انسان کا سب سے بڑا اور قابل اعتماد دوست بن چکا ہے۔ کمپیوٹر کی چند خصوصیات یہ ہیں۔ کسی بھی کام کو بہت تیز رفتار سے کرنا، جو اور جتنا کام بتایا جائے وہ اور اتنا ہی کام کرنا، ہر کام کو پوری درستگی کے ساتھ انجام دینا، اپنی طرف سے کوئی بھی غلطی یا کوتاہی نہ کرنا، بغیر کسی مدد کے اپنے کام کو لگاتار کرتے رہنا، اعداد وشمار کے ذخیرے کو کم جگہ میں جمع کرکے رکھنا اور ضرورت پڑنے پر انھیں آسانی سے فوراً مہیا کرانا وغیرہ۔

کمپیوٹر کیسے کام کرتا ہے؟

(How does Computer Work?)

کمپیوٹر کسی بھی کام کو خود سے انجام نہیں دیتا، بلکہ ہماری ہدایت پر کسی پروگرام کے مطابق ہی کام کرتا ہے۔ ہر ایک پروگرام کو کوئی کام کرنے کے لیے اِن پٹ (Input) ڈاٹا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اِن پٹ آلات جیسے کی بورڈ، ماؤس، اسکینر وغیرہ کے ذریعے اپنا ان پٹ ڈاٹا اور پروگرام کمپیوٹر کو دیتے ہیں یا بھیجتے ہیں۔

کمپیوٹر کا سی پی یو، یعنی پروسیسر (Processor) ہمارے ذریعے دی گئی ہدایات، یعنی پروگرام پر عمل کرتا ہے۔ یہ پروگرام اس طرح لکھا ہوتا ہے کہ اس پر ٹھیک طریقے سے عمل کرنے سے کوئی کام پورا ہوجاتا ہے۔

پروگرام پر پوری طرح عمل ہوجانے کے بعد یا پھر درمیان میں ہی پروگرام کا نتیجہ یعنی آؤٹ پٹ (Output) کسی آؤٹ پٹ آلہ، جیسے اسکرین یا پرنٹر پر بھیج دیا جاتا ہے، جسے ہم دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

اگر آپ پروگرام یا آؤٹ پٹ یا دونوں کو ہی مستقبل میں استعمال کرنے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو انھیں ڈاٹا کو محفوظ کرنے والے آلات، جیسے ہارڈ ڈسک، سی ڈی یا پین ڈرائیو پر بھیج کر محفوظ کرسکتے ہیں

اس پورے عمل کو تصویر C-1.1 میں تفصیل کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریاگنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

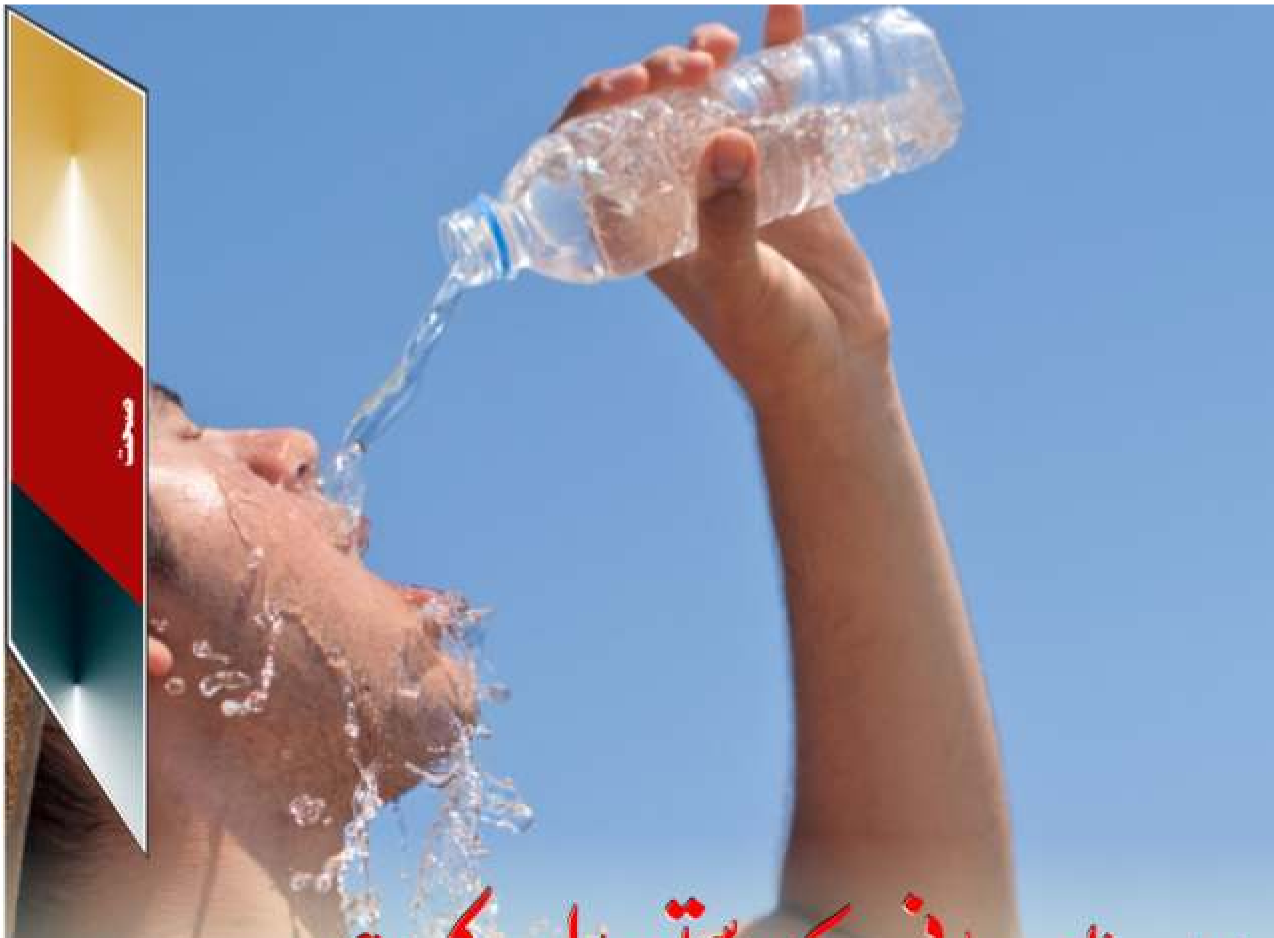

صبا خانم

سردیوں میں پانی کے استعمال کی اہمیت

جھلسا دینے والی شدید گرمیوں کے بعد سردیوں کی آمد قدرت کی طرف سے دیے گئے قیمتی تحفے سے کم نہیں۔ گرمی سے نجات ملتی ہے تو ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ سردیاں اپنے ساتھ مختلف قسم کے پھل اور میوے لاتی ہیں، جس کے سبب لوگوں کی صحت کا معیار اس موسم میں گرمی کے مقابلے اچھا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں سے ہمیشہ یہ سنتے آئے ہیں کہ اس موسم میں جسم پورے سال کی انرجی یعنی قوت کو اپنے اندر اکٹھا کر لیتا ہے اور یہ طاقت پورے سال جسم کو چلانے میں پٹرول کا کام کرتی ہے۔

ایشیائی ممالک میں سردیوں کا مرغوب ترین مشروب چائے ہے۔ بھاپ اڑاتی ہوئی ایک پیالی گرم چائے کو دیکھ کر ہی سردی کا احساس خود بہ خود کم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ سردیوں میں چائے کی اس پیالی کے پیچھے پانی کا گلاس کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ پانی ایک حیات بخش مشروب ہے، لیکن موسم میں تبدیلی ہونے کے سبب فضا میں نمی اور ٹھنڈک پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے موسم سرما میں پانی کی ضرورت اس قدر محسوس نہیں ہوتی جس قدر گرمیوں میں ہوتی ہے۔

سردیوں میں پیاس کی شدت اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ ہم چند گلاس سے زائد پانی کی خواہش محسوس ہی نہیں کر پاتے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے گرمیوں کے مقابلے سردیوں میں ہمارے جسم کو پانی کی ضرورت کم ضرور ہوتی ہے لیکن ختم نہیں ہو جاتی۔ سردیوں میں بھی ہمارے جسم کو پانی کی ضرورت بدستور رہتی ہے۔

پانی قدرت کی طرف سے دیا گیا ایک انمول تحفہ ہے۔ اس کے بغیر ہم چند دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ پانی سرچشمہ حیات ہے۔ آکسیجن کے بعد انسان کو زندہ رہنے کے لیے پانی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح گندی ہوا میں سانس لینے سے ہم بیمار ہو جاتے ہیں اسی طرح گندہ پانی بھی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ اس لیے صاف شفاف پانی پینا صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ہمارے جسم کو کام کرنے کے لیے پانی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ یہ گویا ہمارے جسم کا ایندھن ہے۔ جس طرح سے ہمارا موبائل فون بغیر چارج ہوئے نہیں چل سکتا گاڑی بغیر پیٹرول کے نہیں چل سکتی، اسی طرح سے ہمارا جسم بھی پانی کے بغیر نہیں چل سکتا۔ جس طرح ایک مکمل غذا ہمارے جسم کے لیے ضروری ہے اسی طرح پانی کا استعمال بھی جسم کو چست اور تندرست رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ہمارے جسم میں 65 سے 70 فیصد تک پانی پایا جاتا ہے اور یہ پانی جسم کے مختلف کاموں میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جسم میں خون کے بہاؤ، جسم کے درجہ حرارت کو برقرار رکھنے کے لیے، نظام ہضم کے لیے اور جسم سے زہریلے مادوں کے اخراج کے لیے پانی کا جسم میں ہونا بے حد ضروری ہے۔ جسم میں موجود پانی دماغ اور گردوں کو بہتر طریقے سے کام کرنے میں مدد کرتا ہے۔ پانی جسم میں موجود خون کو گاڑھا ہونے سے بچاتا ہے جس سے خون رگوں میں آسانی سے دوڑ سکے۔

جسم میں موجود پانی کی مقدار میں جب ایک دو فیصد کی کمی واقع ہوتی ہے اس وقت جسم کے اندر سے سگنل آتا ہے اور ہمیں پیاس محسوس ہوتی ہے اور پانی کی خواہش ہمارے اندر جاگ جاتی ہے۔

ہمارے جسم سے مختلف طریقے سے پانی کا اخراج

> سردیوں کے آتے ہی ہماری جلد میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جلد خشک ہو کر پھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ جلد کی یہ حالت ہمارے جسم میں پانی کی ہونے والی کمی کی طرف واضح اشارہ ہے۔ سردیوں کے باعث جب ہم پانی کم پیتے ہیں اور جسم کو مناسب مقدار میں پانی نہیں مل پاتا تو اس وقت جلد کے خشک ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور خشکی کا یہ عمل جلد میں سلوٹوں اور جھریوں کا باعث بنتا ہے جس کے سبب عمر سے پہلے آپ بڑھاپے کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین خوب صورت اور جوان جلد کے حصول کے لیے خواتین کو زیادہ سے زیادہ پانی پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ہوتا ہے۔ جب ہم بہت زیادہ محنت کرتے ہیں، جیسے ایکسرسائز یا کوئی اور جسمانی محنت تو ہمارے جسم سے زیادہ مقدار میں پانی کا اخراج پسینے کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح الٹی یا دست ہونے کی صورت میں بھی جسم سے اچانک ہی پانی بہت زیادہ مقدار میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں پانی پینے کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

سردیوں کے آتے ہی ہماری جلد میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جلد خشک ہو کر پھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ جلد کی یہ حالت ہمارے جسم میں پانی کی ہونے والی کمی کی طرف واضح اشارہ ہے۔ سردیوں کے باعث جب ہم پانی کم پیتے ہیں اور جسم کو مناسب مقدار میں پانی نہیں مل پاتا تو اس وقت جلد کے خشک ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور خشکی کا یہ عمل جلد میں سلوٹوں اور جھریوں کا باعث بنتا ہے۔ جس کے سبب عمر سے پہلے آپ بڑھاپے کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین خوب صورت اور جوان جلد کے حصول کے لیے خواتین کو زیادہ سے زیادہ پانی پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پانی کے مناسب استعمال سے چہرے کی جلد نرم اور اس کی رنگت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے صحت مند اور جوان جلد کے لیے پانی کا استعمال کرنا بے حد ضروری ہے۔ جلد کی خوبصورتی کے ضمن میں پانی کو بیوٹی ٹانک بھی کہا جاسکتا ہے۔

پانی کی کمی کے باعث اور بھی بہت سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جسم میں پانی کی کمی کے سبب تھکان پیدا ہو جاتی ہے اور جسم میں چستی پھرتی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس تھکان کے سبب کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا اور تھوڑا سا کام کرنے کے بعد ہی بہت زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس حالت کو انگریزی زبان میں (Fatigue) کہتے ہیں۔

پانی کی کمی کے باعث قبض کی شکایت بھی عام ہے۔ پانی نہ پینے کے سبب آنتوں میں خشکی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ پیٹ سے فاضل مادے کو نکلنے کے لیے رطوبت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ رطوبت جہاں اور بہت سارے اندرونی عمل سے پیدا ہوتی ہے وہیں پر اس کو پیدا کرنے میں پانی بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ پانی کم پینے کی صورت میں یہ رطوبت کم بنتی ہے جس کے سبب پیٹ سے فاضل مادے کو نکلنے میں دشواری پیش آتی ہے جس کے سبب قبض کی شکایت ہوجاتی ہے۔

اس لیے صحت مند نظام ہاضمہ کے لیے مناسب مقدار میں پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ جن لوگوں کو قبض کی شکایت رہتی ہو ان لوگوں کو پانی کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے۔

پانی زیادہ پینے کی صورت میں پیشاب کھل کر آتا ہے۔ پیشاب زیادہ آنے کے سبب جسم میں موجود فاسد مادوں کا اخراج آسانی سے ہو جاتا ہے گردے اچھی طرح کام کرتے ہیں اور ان کی دھلائی زیادہ پانی پینے کے سبب بہتر طریقے سے ہو جاتی ہے۔ پانی کم پینے کی صورت میں انفیکشن کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ کبھی کبھی ہمیں گہرے پیلے رنگ کا پیشاب آتا ہے اور ساتھ ہی جلن بھی محسوس ہوتی ہے یہ تمام باتیں ہمارے جسم میں پانی کی کمی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اگر ہم اس کمی کو پورا کرنے کی طرف جلد ہی دھیان نہ دیں تو یہ حالت انفیکشن کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اور آگے چل کر یہ انفیکشن کسی بڑی پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔

سر میں درد کی شکایت عام ہے، اور اس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ ان بہت ساری وجوہات میں ایک وجہ جسم میں پانی کا کم مقدار میں جانا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگلی بار اگر آپ کے سر میں درد ہو تو اس بات پر بھی غور کریں کہ کہیں آپ کے جسم میں پانی کی کمی تو نہیں ہوگئی ہے۔

سردیوں میں پانی کا کم مقدار میں استعمال کرنے کے نتیجے میں وزن بھی بڑھ جاتا ہے۔ پانی وزن کو کم کرنے میں بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ پانی میں بذات خود تو کوئی ایسے اجزا نہیں ہوتے جس سے کہ وزن نہ بڑھے یا کم ہو لیکن اس کے استعمال سے وزن کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ زیادہ پانی پینے کی صورت میں ہمارے جسم سے پانی کی شکل میں وہ مادے خارج ہو جاتے ہیں جن کے جسم میں ٹھہر جانے کے سبب موٹاپا بڑھنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی زیادہ پینے سے بھوک کے احساس میں کمی آجاتی ہے اور کھانے کی خواہش ہمارے اندر کم ہو جاتی ہے۔ ناشتے سے قبل یا کھانے سے پہلے اگر ایک دو گلاس پانی پی لیا جائے تو بھوک میں کمی واقع ہو جائے گی اور اس طرح ہم کم کھانا کھائیں گے، جس سے وزن کو کم کرنے یا بڑھنے سے روکنے میں مدد ملے گی۔ موٹاپا نہ بڑھنے کی صورت میں بلڈ پریشر اور کولیسٹرول جیسی بیماریاں بھی آپ سے دور رہیں گی۔

یہ اور اسی قسم کے مختلف مسائل کا سامنا آپ کو پانی کی کمی کے سبب درپیش آسکتا ہے۔ اس لیے سردیوں میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ پانی کا بھی خیال رکھیں اور اس کو مناسب مقدار میں استعمال کرتے رہیں۔ یاد رکھیں کسی بھی چیز کی کمی اور زیادتی دونوں ہی نقصان دہ ہوتی ہے لہٰذا اپنے جسم، کام اور رہنے سہنے کے طریقے کے مطابق پانی کا استعمال کریں۔

■

Dr. Saba Khanam, F-19/8, Nafees Road, Jogabai, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

محمد علیم

گیتا دت

وقت نے کیا کیا حسیں ستم

ہندوستانی فلم انڈسٹری ہالی ووڈ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری سمجھی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں بننے والی فلموں کا مقابلہ موضوع و اسلوب کے اعتبار سے کبھی بھی ہالی ووڈ کی فلموں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر پھر بھی ہندوستانی فلموں نے پوری دنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے اور آج اس کے چاہنے والے کروڑوں واربوں میں ہیں۔

آج کی موجودہ فلم انڈسٹری ان عظیم فن کاروں کی مرہون منت ہے جنھوں نے اپنے کمال فن سے اسے سنوارا اور سجایا اور آنے والی نسلوں کے لیے عمدہ راہ ہموار کی۔

گیتا دت ان چند عظیم فنکاروں میں تھیں جنھوں نے ہندوستانی فلموں کو اپنی عظیم خدمات سے نہ صرف ایک با وقار مقام بخشا بلکہ فن کی بلندی پر پہنچ کر وہ معرکہ سر کیا جو بہت کم ہی فن کاروں کے حصے میں آتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک کمال کی اداکارہ بھی تھیں اور ایک اعلی درجے کی گلوکارہ بھی۔ ایک ایسی آواز جس کی اپنی ایک منفرد شناخت تھی۔

انھوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز 1946 میں بننے والی ایک دیومالائی فلم 'بھنکا پر ہلاد' سے کیا۔ اس فلم میں انھیں پہلی بار اپنی مخصوص آواز میں ایک گانا ریکارڈ کرانے کا موقع ملا جسے لوگوں نے خوب پسند کیا۔ اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر تھے کے ہنومان پرساد۔ جس وقت گیتا دت نے یہ گانا گایا اس وقت ان کی عمر تھی محض 16 سال۔ انھیں اس گانے کی صرف دو لائنیں ہی گانے کا موقع ملا مگر انھوں نے ریکارڈنگ روم میں اپنی آواز کا ایسا جادو جگایا کہ لوگ دم بخود رہ گئے۔

گیتا دت کے بچپن کا نام گیتا گھوش رائے چودھری تھا۔ انھوں نے ایک بنگالی خاندان میں آنکھیں کھولیں اور فلم اور موسیقی کا شوق انھیں وراثت میں ملا۔ ان کے والد دیویندر ناتھ گھوش رائے چودھری ایک بڑے رسوخ دار زمیندار تھے۔ ان کی والدہ کا نام امیا دیوی تھا۔

ان کا خاندان غیر منقسم بنگال کے ضلع فرید پور سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر 40 کی دہائی میں یہ خاندان مشرقی بنگال سے ہجرت کر کے مغربی بنگال آ گیا اور کلکتہ کو اپنے نئے مسکن کے طور پر منتخب کیا۔ لیکن گیتا دت کو زیادہ دنوں تک اس خوبصورت شہر میں رہنے کا موقع نہیں ملا اور وہ اپنے والدین کے ساتھ ممبئی آ گئیں جہاں ایک بالکل الگ وانوکھی دنیا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اور وہ دنیا تھی ہر طرح کی چمک دمک سے لبریز فلمی دنیا۔

وہ یہاں دادر کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگیں۔ اس وقت ان کی عمر محض 12 سال تھی اور انھیں تعلیم کے حصول کے لیے وہاں کے مشہور اسکول بنگالی ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا لیکن ان کا دل و دماغ اعلی تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے فنکاری کی طرف زیادہ مائل تھا لہٰذا ان کے والد نے انھیں اپنے زمانے کے مشہور میوزک ڈائریکٹر کے ہنومان پرساد کی سرپرستی میں دے دیا جنھوں نے پہلی نظر میں ہی اس ننھی فن کارہ کے فن کو کچھ اس انداز سے پرکھ لیا کہ دنیا کو آگے چل کر ان کی پرکھ کی داد دینی پڑی۔ انھوں نے ان کی مخصوص طریقے سے موسیقی کی میدان میں تربیت شروع کر دی۔

جس سال ملک عزیز آزاد ہوا، یعنی 1947 میں، انھیں اپنے کیریر کا پہلا بڑا بریک ملا فلم 'دو بھائی' سے، جس میں ان کا گایا ہوا نغمہ بے حد پسند کیا گیا۔

گیتا دت کی آواز میں غضب کا سوز و درد تھا۔ مگر ساتھ ہی ان کے اندر یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ مختلف موضوعات کے اعتبار سے اپنے گانے کا انداز بدل لیتی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ کیا یہ وہی فن کارہ ہے جس کے گانے درد و احساسات کی شدت سے لبریز ہوتے ہیں۔

گیتا دت کے لیے گلوکاری کے میدان میں قدم جمانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان کے سامنے لتا منگیشکر جیسی ایک بڑی گلوکارہ موجود تھیں جن کی صلاحیت کے آگے کسی

دوسری گلوکارہ کے ٹکنے کی صلاحیت بہت کم تھی۔ مگر پھر بھی گیتادت نے یہ ثابت کردیا کہ ان کا فن منفرد و انوکھا ہے اور ان کا مقابلہ کسی سے نہیں ہے۔ اگر ان کا مقابلہ کسی سے ہے بھی تو وہ اپنے آپ سے ہے۔

1949 میں بننے والی فلم 'محل' نے اس مفروضے کو سو فیصد ثابت کردیا۔

مشہور و لیجنڈری فلم ساز و اداکار گرو دت سے ملاقات ان کی زندگی کو پوری طرح بدل کر رکھ دینے والی تھی جس کا شاید آغاز میں انھیں اتنا احساس بھی نہیں تھا۔ انھیں اپنے زمانے کی مشہور ہیروئین گیتا بالی کے ساتھ فلم 'بازی' میں اپنی انوکھی اداکاری دکھانے کا خاص موقع ملا۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی مخصوص و خوبصورت اور چلبلی آواز میں ایک گیت بھی گایا جو ان کے سوز و گداز سے لبریز لب و لہجے سے پوری طرح مختلف تھا۔ 1951 میں بننے والی اس فلم کے نغمے مشہور نغمہ نگار ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے جسے ایک کلب کے پس منظر میں فلمایا گیا تھا۔ اس گانے نے گیتادت کی امیج کو بطور گلوکارہ ایک نئے انداز سے پیش کیا۔

گیتادت کے لیے اپنی آواز کو اپنی ہر نئی فلم میں ایک الگ انداز سے پیش کرنے کا چیلنج ہوتا تھا۔ جب انھوں نے عظیم موسیقار ایس ڈی برمن کے لیے گانا گانے کی شروعات کی تو ان کی گلوکاری کا ایک نیا انداز دیکھنے کو ملا جو پہلے سے بالکل جدا و منفرد تھا۔

ایس ڈی برمن بہترین دھنوں کے ساتھ ساتھ اچھے بامعنی نغموں کی موسیقی کے قالب میں ڈھالنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور ان کا یہ ہنر شائقین کو بھی خوب بھاتا تھا۔

1955 میں بننے والی فلم 'دیوداس' میں انھوں نے ایک خوبصورت گانا گایا۔ لیکن 1959 میں بنی فلم 'سجاتا' نے انھیں ایک ایسا گانا گانے کا موقع دیا جو فلم شائقین کے دل و دماغ پر لمبے دنوں تک اپنا اثر چھوڑ گیا۔

فلم 'بازی' کے دوران گیتادت کی ملاقات گرودت کے ساتھ نہ صرف کیریر کے اعتبار سے ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا بلکہ ان کی زندگی کی گاڑی بھی ایک نیا رخ لینے کے لیے تیار و آمادہ تھی۔

کاروباری سلسلے میں ہونے والی یہ ملاقاتیں کب ان دونوں کے درمیان محبت کی لے میں تبدیل ہو گئیں اس کا احساس انھیں تب ہوا جب انھیں لگنے لگا کہ اب ان کا ایک دوسرے سے الگ رہنا ناممکن ہوگا۔ لہٰذا دونوں نے ایک ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور 26 مئی 1953 کو دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

لیکن خانگی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ گیتادت نے اپنے پروفیشنل کیریر کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ آگے بڑھایا اور ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور سدابہار گانے ریکارڈ کرائے۔

گیتادت اور گرودت کی شادی شدہ زندگی بے حد خوشگوار ثابت ہوئی اور ان کے تین بچے ہوئے، جن کا نام تھا ترون، ارون اور نینا۔ بہت ہی مصروف رہنے والی گیتادت کے لیے ایک پروفیشنل فن کارہ اور ایک محبت کرنے والی ماں کے ساتھ تال میل بٹھا کر زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان کے پاس نہ صرف ہندی فلموں میں گانا گانے اور اداکاری کرنے کے آفرز آتے تھے بلکہ ان کی اپنی مادری زبان بنگالی میں بننے والی فلموں کے لیے بھی ان کے پاس گانا گانے کے آفرز کم نہ تھے۔ انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہندی فلموں کی اتنی بڑی کامیاب گلوکارہ و اداکارہ ہونے کے باوجود وہ بنگالی فلموں کے لیے گانے کیوں گائیں جس کی پہنچ ظاہر طور پر ہندی فلموں کے مقابلے بہت محدود تھی۔

1950 کی دہائی میں سوچترا سین بنگالی فلموں کی سب سے چہیتی اداکارہ تھیں جن کے لیے بنگالی گلوکارہ سندھیا مکھرجی کی آواز لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب ہیمنت کمار نے گیتادت کی آواز کو ان کے لیے پہلی بار پیش کیا تو بالکل ایک نیا جوش و ولولہ شائقین میں پیدا ہو گیا جو کافی دنوں تک باقی رہا۔

'کاغذ کے پھول' گیتادت کی سب سے بڑی اور اہم فلم ایک گلوکارہ کے طور پر مانی جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے دل کے چھالوں و درد کو کچھ اس انداز سے اپنی مخصوص سوز بھری آواز میں پیش کیا کہ لوگوں کے دلوں کو درد و آہ سے بھر دیا ہے۔ اس فلم کو ان کے شوہر گرودت نے بڑی لگن، جتن و ہنرمندی کے ساتھ پردۂ سیمیں پر پیش کیا تھا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ یہ ایک طرح کی سوانحی فلم تھی جس میں گرودت نے اپنی زندگی کی کہانی کو ہی بڑے ڈرامائی انداز سے پیش کیا تھا۔ دنیا کی کامیابی اور دولت کے حصول کو لے کر ان کی اپنی فلسفیانہ سوچ کیا تھی، یہ اس فلم کا خاص موضوع تھا۔

> گیتادت کو بچپن سے ہی گانے کا بے حد شوق تھا۔ جب ان کی عمر محض پانچ چھ سال کے قریب تھی تبھی سے انھوں نے گنگنانا اور گانا شروع کردیا تھا۔ اس کے لیے ان کا گاؤں، ایدل پور جوکہ ضلع فرید پور، مشرقی بنگال میں واقع تھا، ایک طرح سے قدرتی ماحول و فضا مہیا کراتا تھا۔ ان کا گھر ایک ندی کے قریب تھا اور اپنے فرصت کے لمحات انھیں اس کے کناروں پر بیٹھ کر وقت گزارنا بے حد پسند تھا۔

وحیدہ رحمان کے ساتھ ان کی جوڑی تب تک ہندی فلموں میں ایک نئی کہانی گڑھ چکی تھی۔ نہ صرف اداکاری کے اعتبار سے بلکہ ذاتی زندگی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب آچکے تھے۔

ظاہری بات ہے کہ اپنے عزیز شوہر گرودت کا وحیدہ رحمان کے ساتھ عشق کی ایک نئی داستان قلم کرنا بھلا ایک وفا شعار بیوی کے طور پر گیتادت کو کیسے گوارا ہوتا۔ لہٰذا دونوں کے درمیان تنگی و دوری بڑھنے لگی۔ اور شاید ان کی ذاتی زندگی کا یہی درد اس نغمے میں کچھ اس طرح ابھر کر آیا کہ آج بھی گوشۂ تنہائی میں اس نغمے کو سن کر انسان ایک خاص قسم کے درد کی شدت سے دوچار ہوئے بنا نہیں رہتا۔ اس گانے کی موسیقی کی ذمے داری جس عظیم موسیقار کے کندھوں پر تھی اس کا نام تھا ایس ڈی برمن اور اس گانے کو لفظوں کا جامہ پہنایا تھا اپنے وقت کے بے حد مقبول عوامی شاعر کیفی اعظمی نے۔

گیتادت کو بچپن سے ہی گانے کا بے حد شوق تھا۔ جب ان کی عمر محض پانچ چھ سال کے قریب تھی تبھی سے انھوں نے گنگنانا اور گانا شروع کردیا تھا۔ اس کے لیے ان کا گاؤں، ایدل پور جوکہ ضلع فرید پور، مشرقی بنگال میں واقع تھا، ایک طرح سے قدرتی ماحول و فضا مہیا کراتا تھا۔ ان کا گھر ایک ندی کے قریب تھا اور اپنے فرصت کے لمحات انھیں اس کے کناروں پر بیٹھ کر وقت گزارنا بے حد پسند تھا۔ ندی میں آنے جانے والی کشتیاں اور چھوٹی چھوٹی مچھلی مارنے والی ناؤ انھیں اپنی طرف بے حد راغب کرتی تھیں۔ کیونکہ اس میں سوار ہونے والے ملاح و مسافر کچھ اس انداز سے اپنے کام و سفر کے دوران بنگالی زبان میں نغمے چھیڑتے تھے کہ ننھی گیتادت اس کے سحر

میں کھوئے بغیر نہیں رہ پاتی تھیں۔ ان کی زبان پر اپنے آپ ہی وہ گانے جاری ہو جاتے اور پھر گھنٹوں تنہائی میں اسے گایا کرتیں۔ ان کی دیوانگی کچھ ایسی بڑھی کہ نہ کھانے پینے کی سدھ نہ سونے جاگنے کی فکر رہی۔ نہ پڑھائی پر توجہ، جو ان کی ماں کے لیے ایک نئی پریشانی کا سبب بننے لگی کیونکہ انھیں اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی ننھی پری ایک دن ہندوستانی فلموں کی عظیم گلوکارہ بننے والی ہے۔

گیتا دت کو ابتدائی تعلیم کے لیے گاؤں میں ہی واقع ایک مقامی پاٹھ شالا میں داخل کرا دیا گیا مگر بھلا ان کا پڑھائی میں جی کہاں لگنے والا تھا۔ ان کا سارا ذہن تو گانے اور گنگنانے میں لگا رہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انھیں اپنے گانوں اور اس کی دھنوں پر جو انھوں نے دریا میں ملاحوں اور مسافروں کی نقل کر کے سیکھی تھی، اس پر رقص کرنا بھی انھیں خوب بھاتا تھا۔ ایک طرح سے ان کے اندر کی چھپی اداکارہ باہر آنے کے لیے انگڑائیاں لے رہی تھی اور اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کب انھیں موقع ملے اور کھل کر اپنی اداکاری کے جوہر دنیا کو دکھا سکیں۔

انھوں نے کئی اہم اور بڑی فلموں میں آگے چل کر کام کیا اور اپنے اس ہنر کو ہر اعتبار سے ثابت کر دکھایا۔

بہت جلد گیتا دت کے اس ہنر سے ان کا پورا گاؤں واقف ہو گیا۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، سب ہی ان کے فن کے قائل ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان سے ثقافتی تقریبات کے موقع سے گانے کی فرمائشیں کی جانے لگیں جسے پورا کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ اس میں ان کے اپنے خاندان کا اثر و رسوخ آڑے آتا تھا۔ وہ ایک امیر زمیندار کی بیٹی تھیں اور بھلا عام گاؤں والوں کی فرمائشوں کو پورا کرنا ان کے والدین کو کیسے اچھا لگتا۔

لیکن ایک اہم بات یہ ہوئی کہ ان کے والدین نے ان کے اس ہنر کو نہ صرف پہچانا اور سراہا بلکہ اسے نکھارنے اور سنوارنے کی کوششوں میں لگ گئے جو کہ ایک انقلابی قدم تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی اس طرح آزادانہ ماحول میں تعلیم و تربیت کے بہت کم ہی مواقع نصیب تھے۔

انھیں موسیقی کی باضابطہ طور پر تعلیم کے لیے ایک موسیقار معلم کے سپرد کر دیا گیا جن کا نام تھا، شری ہریندر ناتھ نندی۔ انھوں نے ہی گیتا دت کو موسیقی کے ابتدائی اسرار رموز سے آگاہ کیا جو آگے چل کر ان کی پروفیشنل زندگی میں بہت کام آیا۔

ممبئی میں اپنے والدین کے ساتھ قیام ان کے لیے زندگی کی دوسری کئی انوکھی سوغات لے کر بھی آیا۔ وہاں انھیں ہندوستان کی وہ تہذیب و رنگارنگی دیکھنے کو ملی جو انھیں اپنے وطن بنگال میں کم ہی دیکھنے کو ملی تھی۔ ممبئی ایک میٹروپولیٹن شہر کے طور پر تب تک اپنی ایک الگ شناخت بنا چکا تھا۔ اس لیے گیتا دت کو نہ صرف اپنی مادری زبان بنگالی سننے، سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہندی، اردو، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، سندھی بلکہ نیپالی زبان بھی سیکھنے کا موقع ملا جس سے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا۔

قسمت انسان کو کچھ اپنے مخصوص انداز سے لے کر چلتی ہے۔ گیتا دت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ان کے والدین حالانکہ ان کے فن کی قدر کرتے تھے اور اسے نہ صرف سراہتے تھے بلکہ اس میدان میں ان کی تعلیم و تربیت میں بھی کوئی کور کسر نہ چھوڑی تھی، لیکن جب ہندی فلموں میں باضابطہ طور پر گانے کا آفر آیا تو ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا ایک مشکل امر ثابت ہوا کہ آیا وہ اپنی کم سن بچی کو ایسا کرنے کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ایک باوقار اور عزت دار گھرانے سے تھا اور ان دنوں ہندی فلموں میں کام کرنا شرفا کے یہاں زیادہ تحسین و تعریف کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

کے ہنومان پرساد، جو ان دنوں ایک مشہور موسیقار تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک دن گیتا دت کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ان کو گھر کے اندر سے انھیں ایک لڑکی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ وہ بلا جھجک گھر کے اندر داخل ہو گئے اور دریافت کیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ تو ان کے والد نے کہا کہ یہ میری نو عمر بیٹی گیتا دت ہے جسے گانا بہت پسند ہے۔

بس کیا تھا، کے ہنومان پرساد ان سے اصرار کرنے لگے کہ ایک فلم میں جس کی وہ موسیقی ترتیب دے رہے تھے، اسے گانے کا موقع دیا جائے۔ جسے بڑی مشکل سے ان کے والدین نے یہ سوچ کر قبول کیا کہ ان کو وہی کرنا چاہیے جہاں ان کی بیٹی کا دل بستا ہے۔

گیتا دت بہت جلد ہندوستانی فلم موسیقاروں کی ایک اہم پسند بن گئیں۔ ان سے چھوٹے بڑے سارے موسیقاروں نے گانا گوایا جو ان کی صلاحیت کو اس میدان میں ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔ ایس ڈی برمن کے ساتھ جن عظیم موسیقاروں کے ساتھ انھوں نے کام کیا اس میں وسنت دیسائی، غلام حیدر، انل بسواس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

گرو دت کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ وحیدہ رحمن سے ان کی قربت ان کی خانگی زندگی پر بہت گہرائی کے ساتھ اثر انداز ہو رہی ہے، مگر ان کے لیے گھر اور عشق میں تال میل بٹھانا بے حد مشکل ثابت ہو

گیتا دت کے لیے اپنے شوہر کی جدائی اور موت کا غم برداشت کرنا مشکل تھا اور اس کا اثر ان کی صحت و کام پر پڑنے لگا۔ اس سے نہ صرف ان کا اپنی زندگی سے جی اچاٹ ہو گیا بلکہ کام سے بھی ان کی توجہ ہٹنے لگی جس سے نہ صرف آگے چل کر انھیں مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ساتھ ہی فلم انڈسٹری کے بے حد مقابلے بھرے ماحول میں ان کی حیثیت بھی کم ہونے لگی۔

رہا تھا اور گیتا دت کے لیے بھی اس بات کو بھولنا مشکل تھا کہ ان کا شوہر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کے ساتھ محبت کرے۔ لہٰذا تلخیاں و دوریاں کچھ اس قدر بڑھیں کہ دونوں کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر عشق کا ایک انجام ہوتا ہے۔ چاہے وہ خوشیوں بھرا ہوا یا دکھ بھرا۔ گیتا دت اور گرو دت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک دن گیتا دت کو یہ تکلیف دہ خبر ملی کہ ان کا شوہر اس دنیا میں نہیں رہا۔ گرو دت نے اس رات جب داعی اجل کو لبیک کہا تھا، کچھ اس قدر پریشان تھے کہ انھوں نے نہ صرف خوب شراب نوشی کی بلکہ بہت ساری نیند آور دوائیاں بھی کھا لیں جو اس قدر مہلک ثابت ہوئی کہ ان کی جان لے بیٹھی۔

گیتا دت کے لیے اپنے شوہر کی جدائی اور موت کا غم برداشت کرنا مشکل تھا اور اس کا اثر ان کی صحت و کام پر پڑنے لگا۔ اس سے نہ صرف ان کا اپنی زندگی سے جی اچاٹ ہو گیا بلکہ کام سے بھی ان کی توجہ ہٹنے لگی جس سے نہ صرف آگے چل کر انھیں مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ساتھ ہی فلم انڈسٹری کے بے حد مقابلے بھرے ماحول میں ان کی حیثیت بھی کم ہونے لگی۔

بالآخر 20 جولائی 1972 کو جگر کی بیماری سے ان کا انتقال ہو گیا۔

50 و 60 کی دہائی میں ہندوستانی فلم انڈسٹری پر راج کرنے والی یہ مقبول اداکارہ و گلوکارہ آج بھی ہمارے درمیان کچھ اس طرح اپنے نغموں کے ساتھ موجود ہیں جیسے کبھی وہ اس دنیا سے رخصت ہوئی ہی نہ ہوں۔

■

Mohd Aleem F-31, 1st Floor, Abul Fazal Enclave, Part II, Shaheen Bagh
New Delhi - 110025
Mob. 9910111463

معالجات (جلد اول تا چہارم)

مصنف: حکیم وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2233 (مکمل چار جلدیں)
قیمت: -/613 (مکمل سیٹ)، اشاعت سوم: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی-110025
مبصر: ڈاکٹر سیّد احمد خاں (ریسرچ آفیسر یونانی، سائنٹسٹ (IV))
سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل حکیم وسیم احمد اعظمی کا گراں قدر کارنامہ ہے۔ جلد اول (امراض نظام اعصاب و دوران خون و تنفس)، جلد دوم (امراض نظام ہضم و تولید و تناسل)، جلد سوم (حمیات، حمیات خلطیہ و امراض متعدی)، جلد چہارم (امراض جلد و متعلقات جلد) کا بھرپور انداز میں احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے مذکورہ کتاب کو شائع کرکے یقینی طور پر طبی برادری پر احسان کیا ہے۔

معالجات کی پہلی اشاعت 1992 میں منظر عام پر آئی اور اب یہ اس کی تیسری طباعت (2015) ہے۔ جلد اول کا ابتدائیہ خود حکیم وسیم احمد اعظمی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہیئت مرض، اسباب اور علامات کے لیے جدید طریقے کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن علاج کے ذیل میں صرف یونانی طریقہ علاج ہی تحریر کیا گیا ہے اور لکھنؤ طبیہ کالج کی پیروی کرتے ہوئے علاج بالمفردات کو ترجیح دی گئی ہے۔" یہ جملہ یقیناً طب یونانی کے علاج و معالجہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل اس پروفیشنل دور میں اور بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں مرکبات پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا نامناسب سا لگتا ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ نفع خوری کے دور میں مرکب ادویہ کے اصلی اور لازمی اجزا شامل ہوں اس کی گارنٹی ممکن نہیں ہے۔ آئے دن لوگ ملاوٹ خوروں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے میں علاج بالمفردات ہی بہتر طریقہ علاج ہے۔ اس بھاگ دوڑ کے زمانے میں اگرچہ عام آدمی کے لیے یہ آسان نہیں ہے لیکن Chronic Diseases میں آج بھی علاج بالمفردات سے ہی شفا نصیب ہوتی ہے۔

جلد دوم امراض نظام ہضم و تولید و تناسل پر مشتمل ہے۔ طب یونانی میں آج یہ باب انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ ایلوپیتھی طریقہ علاج سے عاجز لوگ گیس کی بیماری کے لیے یونانی طریقہ علاج اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور آج کل عوام کی اکثریت گیس کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ محنت کم کرنے کی عادت ہے تو دوسری جانب ثقیل اور ملاوٹی غذاؤں کی بھرمار ہے۔ بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ Inorganic foods یعنی انگریزی کھاد کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھا کر خوردنی اشیا کا استعمال کیا جانا بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس کے علاوہ اسباب ستہ ضروریہ کے اصول سے انحراف بھی نظام ہضم کی خرابی کا سبب ہے۔ اس لحاظ سے اس باب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے اور اس پر عمل کرنے سے بڑی راحت کا احساس کر سکتے ہیں۔

معالجات جلد دوم میں امراض نظام ہضم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقریباً پانچ دہائی قبل علامہ کبیرالدین کی تالیف کردہ کتاب 'شرح اسباب' بھی چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن آج کے حالات میں Oriental Side سے بنیادی تعلیم حاصل کرکے BUMS میں داخلہ لینے والے طلبا کے لیے آسان سے آسان تر زبان کی ضرورت ہے جس میں اردو کے ساتھ انگریزی اصطلاحات کی بھی سخت ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو حکیم وسیم احمد اعظمی کی تالیف معالجات کافی حد تک پورا کرتی ہے البتہ آئندہ طباعت میں مزید آسانیاں پیدا کرنے کی سعی درکار ہے مثلاً لفظ متوحش، حجرہ، حدقہ چشم وغیرہ۔

معالجات جلد سوم میں شامل حمیات کے باب پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ دور حاضر میں ہونے والے مختلف نوعیت کے بخاروں کے علاج میں یہ Chapter عوام کے لیے بڑی نعمت ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جلد چہارم امراض جلد (Skin Diseases) پر مشتمل ہے۔ ایلوپیتھی طریقہ علاج میں Skin Diseases پر کارگر ادویات کی بے حد کمی ہے۔

بہرحال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے طب یونانی پر مشتمل یہ کتاب شائع کرکے اردو سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

تاریخ شاہجہاں

مصنف: بناری پرشاد سکینہ
صفحات: 466، قیمت: 197 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: معصوم عزیز کاظمی، آئی پی ایس (ریٹائرڈ)

تاریخ عظمت ورفعت کا دفینہ ہے۔ یہ صرف اشخاص کے عروج وزوال کی داستان نہیں بلکہ یہ اپنے عہد کا آئینہ بھی ہے۔ شاہجہاں کا عہد حکومت سلطنت مغلیہ کا وہ باب ہے جس میں متفقہ طور پر مغلیہ سلطنت کی عمل داری، اقتدار اور دولت نقطۂ عروج تک پہنچ گئی

تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس دور میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔ اپنے دور میں تمام نشیب و فراز سے ہمکنار ہونے کے باوجود شاہجہاں نے تعمیرات کا جو سلسلہ شروع کیا وہ آج بھی مغلوں کا امتیاز ہے۔ دہلی کے محل اور دیگر شاندار تعمیرات کے علاوہ محبت کی یادگار تاج محل کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ یہ دنیا کے سات عجوبوں میں ایک ہے۔

سلطنت مغلیہ کے شہنشاہوں کے بارے میں تاریخ دانوں، بالخصوص انگریز تاریخ دانوں، نے کافی کچھ لکھا ہے، لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ شاہجہاں اور اس کا عہد ان کی خصوصی توجہ سے محروم رہا۔ زیر تبصرہ کتاب 'تاریخ شاہجہاں' ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کی اشاعت 1932 میں انگریزی زبان میں ہوئی۔ اس کا رواں دواں اردو ترجمہ اعجاز حسین نے کیا ہے۔ مصنف نے کتاب کی ابتدا میں ان ماخذات کا مختصر ذکر کیا ہے جو عہد شاہجہانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ باب معلوماتی ہے اور مزید مطالعے کے لیے قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔ شاہجہاں کا بچپن اور اس کی شخصیت کی تعمیر کس انداز اور ماحول میں ہوئی اس کا تفصیلی ذکر کتاب میں موجود ہے۔ اکبر کی سرپرستی اور نگرانی میں شاہجہاں کی تعلیم و تربیت کس نہج پہ کی گئی اس کا مطالعہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پہ مجبور کرتا ہے کہ وسیع المشربی اسے وراثت میں ملی تھی۔

دکن فتح کرنے کے بعد شاہجہاں کو تخت نشیں ہونے میں کن مشکلات اور سازش کا شکار ہونا پڑا اور اس نے کن حالات میں جہانگیر سے بغاوت کی اس کا تفصیلی ذکر کتاب میں موجود ہے۔ نور جہاں کی تمام سازشوں کے باوجود شاہجہاں کن دشوار گزار مرحلوں کو سر کر کے جہانگیر کی وفات (1627) کے بعد 28 جنوری 1628 کو تخت نشیں ہوا اس کی روداد دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے اپنے جاں نثاروں کو کس انداز میں نوازا اور سلطنت کے نظم و نسق میں کیا تبدیلیاں کیں اس کی تفصیل بھی کتاب میں درج ہے۔ تخت نشینی کے بعد شاہجہاں کو بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے شب و روز معرکہ آرائی میں گزرے۔ شاہجہاں کو دیسی ریاستوں کے علاوہ پرتگالی سوداگروں کے خلاف محاذ آرائی کرنا پڑا تھا جس کا ذکر مصنف نے تفصیل سے کیا ہے۔ ماوراء النہر کو زیر تسلط کرنے کے دیرینہ مغلیہ خواب کو تعبیر عطا کرنے کی شاہجہاں اور اورنگ زیب کی مشترکہ ناکام کوشش کا جائزہ بھی مصنف نے لیا ہے، لیکن جہانگیری عدل کو شاہجہاں نے کس طرح پروان چڑھایا اس کا ذکر کتاب میں موجود نہیں ہے۔

شاہجہانی عہد شان و شوکت کا نمونہ تھا اس کا اعتراف مصنف نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس عہد میں سلطنت مغلیہ کی دولت اور خوش اقبالی نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

اس کتاب کی وسعت 1952 سے 1657 تک محدود ہے۔ شاہجہاں کے آخری ایام اور اس کی شدید علالت کے بعد وراثت کی جنگ کا جو سلسلہ شروع ہوا اسے اس کتاب میں موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امتحان کی اہم ضروریات نے اسے مجبور کیا کہ مقالے کی ضخامت کو کم کر کے اسے اس کی موجودہ صورت حال میں پیش کیا جائے۔ مصنف کی یہ مجبوری قاری کو تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ انگریزی میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد شاہجہاں پہ کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں

(1)Shahjahan By Munni Lal-(1986) (2) Tragedy of Shahjahan by J.M. Shelat-1960

(3) Shahjahan by Fergus Nicoll (2009) اہم ہیں۔ ان تمام کتابوں کی اشاعت کے باوجود 'تاریخ شاہجہاں' از بنارسی پرشاد سکسینہ کو ہندوستان میں تیموریہ تاریخ پہ ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

کلیات سلیم واحد سلیم

مرتب: مسلم سلیم

صفحات: 432، قیمت: 150 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: مغیث احمد علیگ

معرفت ڈاکٹر عبدالحلیم، D-58، مجیب باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

یوں تو ترقی پسند شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے، لیکن وہ شعرا جو اپنی سرگرمی اور فعالیت کی وجہ سے نہ صرف مشہور ہوئے بلکہ اہل اقتدار کی آمریت کے سامنے آہنی چٹان بن کر کھڑے ہونے کی جرأت کی اور ان کے عتاب کا شکار بھی ہوئے ان ہی عظیم شخصیات میں سے ایک نام ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا ہے، افسوس ہے کہ ہم عام آدمی تو دور، ادب نواز حلقہ بھی اپنے پیش روؤں سے بے اعتنائی کا شکار ہے۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا نام اگرچہ نیا نہیں مگر ادبی حلقوں نے انھیں اس طرح فراموش کر دیا جیسے ہمارے لیے کوئی نیا نام ہو۔

'کلیات سلیم واحد' ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی آزاد و پابند نظموں اور موضوعاتی غزلوں، قطعات، متفرقات، فارسی کلام اور رباعیات خیام کا 'خیام نو' کے نام سے منظوم اردو ترجمے کا مجموعہ ہے جس میں عمر خیام کی رباعیوں کو بڑی مہارت سے اردو کی منظوم لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔

یہ کتاب جہاں شاعر مرحوم کے انقلابی ذہن کی عکاس ہے، وہیں ان کے تخلیقی و علمی کمالات کی ترجمان بھی ہے، جسے شاعر مرحوم کے صاحبزادے اور عہد حاضر کے معروف شاعر مسلم سلیم نے ترتیب دیکر ایک فرزند ارجمند اور لائق سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

اس کلیات کا آغاز 'مدح سرور کونین' سے ہوتا ہے:

بزم امکاں میں ہے ہر سمت اجالا تجھ سے
رونق محفل ہستی ہے دوبالا تجھ سے

کتاب کے ہر مصرعے سے ادبیت چھلکتی ہے، حتی کہ نظموں اور موضوعاتی غزلوں کے عنوان میں بھی ادبیت کی چاشنی نظر آتی ہے جیسے دختران چمن، دیوانے کی بڑ، اندھا سفر، نافرستادہ جواب، بے وفا کی وفا، تار نفس، بولتی ہوئی آنکھیں، لاشعور، یاد لا حاصل، فتح سحر ہونے تک، الہام سے خود تک، شکست یاس، نوائے فراق، خدایان جمہور کا فرمان، آہنی عزم، خود فراموشی، حرف ہای گفتنی، تیر و نشتر، روداد غم، جلوہ زار، عرفان حال، طوفان درد، کوشش پیہم، صبح شام الم، احساسات کیف و سرور وغیرہ

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں عمر خیام کی تقریباً 176 رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ موجود ہے جو اپنے آپ میں ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ خیام کی رباعیات پر بہت کام ہوا ہے، دنیا بھر میں اس کے بہت سے تراجم ہوئے، اردو میں بھی اس کے کئی منظوم و منثور تراجم ہوئے ہیں، لیکن ڈاکٹر مرحوم کے ترجمے میں جو بات ہے وہ اردو کے بہت کم ہی تراجم میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ بحر طویل میں لکھے گئے اس منظوم ترجمہ میں معانی کی مفصل ادائیگی، لفظیات کی روح تک رسائی اور نغمگی پائی جاتی ہے جو انھیں دیگر مترجمین سے ممتاز کرتا ہے۔

رباعیات کے اس ترجمہ کے بارے میں پروفیسر افتخار احمد لکھتے ہیں:

''تجزیاتی نقطہ نظر سے اسلوب کی شگفتہ کاری اپنے موضوع کو سربلندی اور ارتقائی پرواز بخشتی چلی جاتی ہے جس میں ایک قسم کی کشش اور جاذبیت پنہاں ہے۔ الفاظ کا

مناسب چناؤ موضوع کو واضح کرتا چلا تا ہے اور اس کی گرہیں خود بخود یکے بعد دیگرے کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ہم کسی الجھن یا مبہم استادیت کے شکار نہیں ہو پاتے کہ خود شاعر کی پختہ کاری اور فنی چابکدستی نے موضوع کو بڑی عمدگی سے نبھایا ہے جو اس کی شاعرانہ عظمت اور فنی شعور کا غماز ہے۔''

آپ بھی ملاحظہ کریں ان کے تراجم کے چند نمونے:

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما — کہ اے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز و پرکنید پیمانہ ز می — زان پیش کہ پرکنند پیمانۂ ما

یعنی ایک صبح ہمارے میخانے سے آواز آئی کہ اے رند خراباتی اور میرے مستانے اٹھ اور اپنے پیمانے کو جام سے بھر لے قبل اس کے کہ ہمارا پیمانہ بھر دیا جائے۔ اب ذرا اس کا منظوم ترجمہ ملاحظہ کریں:

جب رات گئی تو وقت سحر، گونجی یہ صدا میخانے میں
کیا رند میں کوئی جان نہیں، کیا ہوش نہیں دیوانے میں
اٹھ جام کو بھر اور جھوم کے پی، ہے سر پہ وہ وقت نازک بھی
جب موت کی مے چپکے سے بھرے، بے رحم قضا پیمانے میں

اسی طرح خیام کی دوسری رباعی ملاحظہ کریں:

گرمی نہ خوری طعنہ مزن مستان را — گردست دھد توبہ کنم یزدان را
تو فخر بدین کنی کہ من می نخورم — صد کار کنی کہ می غلام است آن را

اس شعر کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ اگر تم شراب نوشی نہیں کرتے تو مستوں کو طعن و تشنیع کا شکار نہ بناؤ، اگر موقع مل جائے تو میں بھی توبہ کرنے کو تیار ہوں، تمھیں اس بات پر فخر ہے کہ میں شراب نہیں پیتا، جب کہ سیکڑوں ایسے کام ہیں جس کا شراب غلام ہے (یعنی جو شراب نوشی سے بھی بدتر ہیں)۔ اب ذرا ڈاکٹر موصوف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

تقویٰ کے تفاخر رہنے دے اور زعم نہ بادہ پینے کا
اپنا بھی ارادہ رہتا ہے توبہ کے جہاں میں جینے کا
اے خون بشر کے متوالے، بے رحم غلام حرص و ہوس
یہ بادہ کشی تو رستہ ہے معصوم خوشی کے دفینے کا

کتاب کا سرورق سادہ ہونے کے باوجود پرکشش ہے، پروف ریڈنگ کی خامیاں تقریباً 'نا' کے برابر ہیں، بجملہ خصوصیات اور محتویات کو دیکھ کر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب بشمول اردو و فارسی کے طلبا و اساتذہ کے لیے علم بخش ہے۔ 432 صفحات پر مشتمل اس کلیات کی قیمت 150 روپے ہے جو مناسب ہے۔

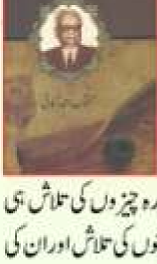

قاضی عبدالودود (مونوگراف)

مرتب: آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 130، قیمت: 80/روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی -110025

مبصر: ڈاکٹر سید اختیار جعفری، مرزا غالب ریسرچ اکادمی، تاج گنج

محققین کے نزدیک تحقیق ایک ایسا عمل ہے، جس میں پوشیدہ چیزوں کی تلاش ہی نہیں ہوتی، بلکہ محقق اسے تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ پوشیدہ ادبی خزینوں کی تلاش اور ان کی حفاظت کو فرض اور عبادت تصور کرنے والوں میں قاضی عبدالودود کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے اردو نثر و نظم ہی نہیں دیگر موضوعات پر بھی داد تحقیق دی ہے۔ عام طور پر اردو میں ان کی تحقیقات کو سندِ اعتبار حاصل ہے۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب پر تحقیق کرنے کے ساتھ ہی اہم شخصیات کے کارناموں کی بھی جانچ پڑتال کی اور متعدد روایات و مسلمات پر سوالیہ نشان لگائے۔ وہ انتہا درجے کا تحقیقی و تنقیدی مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اردو تنقید و تحقیق کی اس عالمی شخصیت پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے مونوگراف تیار کرا کر نہ صرف مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، بلکہ ایک اہم ادبی ضرورت کو بھی پورا کیا ہے۔ اس کے لیے مرتب کتاب آفتاب احمد آفاقی اور ادارہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مونوگراف سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی عبدالودود نے میر تقی میر، مرزا غالب، مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق کو اپنے لیے بہ طور خاص میدان تحقیق قرار دیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ان حضرات کی شخصی عظمت کا انکار کیے بغیر ان کی تخلیقات کا تعاقب کیا۔ ان کے دعوؤں کی چھان پھٹک، متن کی اصلاح، معلومات کے دائرے، غلطیوں، تسامحات، غلط بیانیوں، تعلی اور کلام کا بے باک جائزہ لیا۔ اس جائزے میں انھوں نے کسی کی بلند قامتی کا لحاظ نہ کیا۔ ہمیشہ غلط کو غلط ہی لکھا اور اس غلطی کو بہ دلیل و شواہد غلط ہی ثابت کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے تمام مسلمات کو تہ تیغ کر دیا۔ وہ 'خطائے بزرگاں گرفتن خطاست' کے قائل نہیں۔ انھوں نے تحقیق و تدوین کے نئے اصول مرتب کیے اور قدیم اصولوں میں بھی اصلاحی عمل انجام دیا۔

قاضی عبدالودود سے قبل سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، میر و غالب، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق جیسے علما بے لاگ تحقیق کی روایت شروع کر چکے تھے۔ لیکن قاضی عبدالودود کے نزدیک ان ادبا و محققین میں روایت سے بغاوت کرنے کی جرأت کم تھی۔ اس روایت کو قاضی عبدالودود اور محمود شیرانی نے توڑا۔ انھوں نے ادب کے تمام نثری و شعری سرمائے کو تحقیقی خراد پر چڑھا کر کھرا و کھوٹا الگ کرنے پر زور دیا اور ہر فن پارے کی از سر نو قدر کا تعین کرنے کی کوشش کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قاضی عبدالودود کے علمی کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں کسی ایک مونوگراف میں سمیٹ لینا ممکن نہیں۔ اس کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہیں۔ ضرورت تو اس موضوع پر تفصیلی کام کرنے کی ہے۔ تاہم آفتاب احمد آفاقی نے ان کی شخصیت اور خدمت کا جس طرح تعارف کرایا ہے، وہ بھی قابل مشاہدہ ہے۔

یہ کتاب 4 ابواب میں تقسیم ہے۔ ابتدائیہ میں آفاقی صاحب نے یہ بات پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ یہ مونوگراف قاضی صاحب کی شخصیت اور خدمات کا ایک اجمالی تعارف ہے اور بس! لہٰذا اہل علم بھی اسے اگر باقاعدہ تحقیقی جائزے یا تنقیدی محاکمے کے چشمے سے نہ دیکھیں تو بہتر ہے۔ پہلے باب میں قاضی عبدالودود کی پیدائش، ان کے والدین، خاندان، تعلیم و تربیت، سیاسی افکار، شادی اور گھریلو زندگی، شخصی خصوصیات، مذہب و مسلک سے لے کر ان کی پسندیدہ غذاؤں و لباس، حلقۂ احباب، انتقال اور اردو تحریک سے ان کی عملی وابستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب قاضی صاحب کے ادبی سفر کے آغاز، ان کی شاعری، رسائل و جرائد سے وابستگی پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اس بحث کو تشنہ چھوڑ دیا ہے کہ قاضی صاحب کی پہلی تحریر 1912 میں 'جذبات حسرت' تھی جو آگرہ اخبار میں شائع ہوئی تھی یا المصباح پٹنہ کا وہ مضمون ہے جو اپریل 1923 میں شائع ہوا تھا۔

تیسرے باب میں قاضی عبدالودود کو بہ حیثیت محقق پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کا سب سے محنت سے مرتب کیا گیا حصہ ہے۔ اس میں قاضی صاحب کے تصورات تحقیق

اوراصول تدوین کی جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کی تحقیقی وتنقیدی نگارشات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس باب میں قاضی صاحب کی نگارشات عیارستان، مرقع شعراء، میرتقی میر حیات وشاعری، اُشتر وسوزن، عمدہ، منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور، شاد کی کہانی شاد کی زبانی، تنقیدی تبصروں کی جلد اوّل (مرتبہ کلیم الدین احمد)، تدوین متن دیوان جوشش، ابن امین اللہ طوفان کا تذکرہ شعراء، دیوان رضا عظیم آبادی، تذکرۂ مسرت افزا، قطعات ولدار، سفر آشوب ازخلق، آزاد بہ حیثیت محقق، عبدالحق بہ حیثیت محقق، غالبیات کی تحقیق، ہرمزدم عبدالصمد وغیرہ کتابوں اور مجموعۂ مضامین کا تنقیدی تعارف کرایا گیا ہے۔ آخر میں قاضی صاحب کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مونوگراف کا سلسلہ شروع کرکے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ آزادی کے بعد کے محققین، ناقدین، مورخین اور اساتذہ کے سلسلے میں یہ مختصر کتابی سلسلہ مقبول ہونے کی پوری توقع ہے۔ کم وقت، کم صفحات، کم قیمت کے باوجود زیادہ محنت اور زیادہ سلیقے سے مرتب یہ مونوگراف قارئین کو یقیناً پسند آئے گا۔

ایسی علمی وتحقیقی کتابوں میں پروف کی غلطیوں کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ کل ملا کر یہ ایک کامیاب اور مفید کوشش ہے جسے قارئین واہل علم یقیناً پسند کریں گے۔

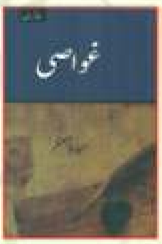

غواصی (مونوگراف)

مصنفہ: سیدہ جعفر

صفحات: 140، قیمت: 82 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ارشاد قمر، اے پی 452 فرسٹ فلور امرپوری، رام نگر، نبی کریم، پہاڑ گنج، نئی دہلی 55

غواصی کا شمار گولکنڈہ کے سربرآوردہ اور ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرکے اپنی شعری صلاحیتوں اور ادبی توانائیوں کا مظاہرہ کرکے شعراء دکن میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔ غواصی کی شہرت ان کی معروف ومشہور مثنویوں، سیف الملوک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ وغیرہ کے سبب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو بھی تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے چند قصائد ومراثی اور رباعیاں بھی تحریر کیں۔ غواصی کی غزلوں میں ہندوستانی معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔ عورت کے زیورات وملبوسات اور مجموعی طور پر اس کی زندگی کے احوال کو غواصی نے عمدگی سے پیش کیا ہے۔ غواصی نے اپنی تشبیہات اور استعارات کو اپنے کلام میں برتا جس سے ان کے کلام میں چاشنی پیدا ہوگئی۔

قومی کونسل کے زیر اہتمام بہت ہی اہم اور نادر علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کے مونوگراف شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے غواصی کا مونوگراف شائع کیا گیا ہے جسے محترمہ سیدہ جعفر نے تیار کیا ہے۔ مصنفہ نے اسے کئی عناوین میں تقسیم کرکے غواصی کے تمام حالات کو قلم بند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے تحت شخصیت اور سوانح، غواصی کی شعری کاوشیں، تنقیدی جائزہ اور انتخاب کلام اہم ہیں۔

اس مونوگراف کے پہلے باب میں غواصی کی شخصیت اور سوانح سے متعلق ان تمام گوشوں کو اجاگر کیا گیا جن کی وجہ سے غواصی اردو ادب، خاص طور سے دکنی ادب میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی غواصی کے ہم عصروں کی مختصر مگر کارآمد معلومات بھی شامل ہے۔

دوسرے باب میں غواصی کی شعری کاوشوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اوران کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر ایک محققانہ اور ناقدانہ تجزیہ پیش کیا گیا۔

تیسرے باب میں مجموعی طور سے ان کے کلام پر ایک عمومی جائزہ لیا گیا ہے جس میں ان کی مثنویاں مینوستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ اور غواصی کی غزلوں، قصائد، رباعی وغیرہ پر بڑی عالمانہ اور بصیرت افروز باتیں کی گئی ہیں۔

اس مختصر سے مونوگراف میں غواصی کی تمام خدمات کا مفصل جائزہ ممکن نہیں تھا لیکن اس کے باوجود مصنفہ تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں کامیاب رہی ہیں اور انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو اچھوتا نہ رہ جائے۔

آخر میں غواصی کی مثنویوں، قصائد، غزل اور رباعی وغیرہ کے اشعار بطور نمونہ پیش کیے۔ ان اشعار کا اگر تجزیہ وتعارف پیش کیا جاتا تو معلومات میں مزید اضافہ ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود مونوگراف کی معنویت اپنی جگہ مسلم ہے جسے اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

محترمہ نے بڑی محنت ولگن سے غواصی کا سوانحی خاکہ اور ان کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انھوں نے گیان چند جین کے اشتراک سے 'تاریخ ادب اردو ابتدا سے 1700 تک' بھی لکھی ہے جسے قومی کونسل نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ من سمجھاون، یوسف زلیخا، تنقید اور انداز نظر اور فراق گورکھپوری وغیرہ پر ان کی ترتیب وتصنیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ سیدہ جعفر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پروفیسر اور صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دے چکی ہیں۔ وہ ایک وسیع المطالعہ اور صاحب اسلوب ادیبہ تھیں۔

اس طرح غواصی (مونوگراف) ہر اعتبار سے ایک کامیاب مونوگراف ہے۔ امید ہے کہ قومی اردو کونسل کی دیگر کتابوں کی طرح اس کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی– 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

منٹو میرا دوست

مرتب: ڈاکٹر کیول دھیر
صفحات: 296، قیمت: 300 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: سلمان فیصل، ذاکر نگر اوکھلا نئی دہلی

'منٹو میرا دوست' ڈاکٹر کیول دھیر کے ذریعے مرتب کردہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں منٹو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کیول دھیر صاحب کے پیش لفظ کے علاوہ ان کے تین مضامین شامل ہیں۔ نیز اردو ادب کی متعدد اہم شخصیات کے 27 مضامین، منٹو کی جانب سے احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے چند خطوط اور منٹو کے سوانحی خاکے اور کتابیات کا احاطہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ کیول دھیر نے اپنے پیش لفظ میں اطلاع دی ہے کہ یہ کتاب پچاس سال قبل پاکٹ سائز میں شائع ہوئی تھی اور اُس وقت اس کی اشاعت کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''تب اس کتاب کی اشاعت کی ایک وجہ تھی۔ اوپیندر ناتھ نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا 'منٹو میرا دشمن'۔ یہ ایک طویل مضمون کا نام تھا جو اس کتاب میں شامل تھا اور اس مضمون کے ذریعے اشک نے منٹو کی شخصیت کو نہایت غیر مہذب ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔'' اس کتاب کا موجودہ ایڈیشن اضافہ شدہ ہے۔ بقول کیول دھیر ''اس میں جہاں پہلے ایڈیشن کو حرف بہ حرف شامل کیا گیا ہے وہاں چند اہم مضامین جو تاخیر سے موصول ہونے کے باعث اس وقت شامل کتاب نہیں ہو سکے تھے، نئے ایڈیشن میں شامل کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔ اس کتاب میں حصہ دوم قائم کیا گیا ہے جس میں اشک صاحب کا مضمون 'میرا دشمن' کے علاوہ ہندی کتابچے میں شامل راجا مہدی علی خاں کا مضمون اور اپنی اس تحریر کو بھی شامل کیا ہے جو 1960 میں ہندی زبان میں شائع ہو کر چرچا کا باعث بنی تھی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا مرتب کیا ہوا منٹو کا مکمل سوانحی خاکہ جو 'کتابیات' کے عنوان سے اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا ہے اس کتاب میں شامل اشاعت ہے۔''

'منٹو میرا دوست' کے حصہ اول میں خود منٹو کے دو مضمون شامل کیے گئے ہیں۔ ڈیڑھ صفحے کے مضمون 'مجھے مقام کی تلاش ہے' میں منٹو نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے کہا کہ ''میں ایک بڑا ادیب ہوں۔۔۔ میں ایک بڑا انسان ہوں۔۔۔ لیکن آج تک میں نہیں سمجھ سکا کہ میرا مقام کیا ہے؟؟'' منٹو کی شخصیت پر مضامین لکھنے والوں میں کرشن چندر، راجا مہدی علی خاں، احمد ندیم قاسمی اور دیویندر اسر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے منٹو کی تحریروں کو قریب سے دیکھا ہے۔

زیر نظر کتاب میں تمام مضامین زیادہ تر منٹو کی شخصیت سے متعلق ہیں۔ ان تمام تحریروں سے اس کی شخصیت بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ 'شمولیت' کے عنوان سے ہے۔ اس میں وہ مضامین شامل ہیں جو پچاس سال قبل شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔ ان میں عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس اور علی سردار جعفری وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ عصمت نے 'مرا دوست مرا دشمن' کے عنوان سے ایک خاکہ نما طویل مضمون لکھا ہے جس کے آخر میں وہ لکھتی ہیں کہ ''اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا ہے اور میں زندہ ہوں؟ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرض بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔'' عصمت چغتائی کے یہ الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ منٹو اور عصمت کے درمیان کس قسم کے گہرے تعلقات تھے اور منٹو کی وفات پر عصمت کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ 'بدزبان' کے عنوان سے اپنے مضمون میں علی سردار جعفری نے منٹو کی بے باکی کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کے حصہ دوم میں کتابیات کے علاوہ چار مضامین شامل ہیں۔ یہ حصہ ایک طرح سے اشک اور منٹو سے متعلق ہے۔ فاضل مرتب ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کے دو مضمون 'منٹو، اشک اور میں' اور 'منٹو کے تئیں اشک کی غداری' بھی ہے۔ اسی حصے میں اوپیندر ناتھ اشک کا مضمون 'منٹو میرا دشمن' بھی شامل ہے اور ایک مضمون راجا مہدی علی خاں کا 'میرا دوست اشک'۔ گویا کہ یہ پورا حصہ اشک اور منٹو کا ہے۔ مجموعی طور پر منٹو شناسی اور منٹو تنقید سے متعلق یہ کتاب ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس کتاب میں منٹو کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب منٹو فہمی بالخصوص منٹو کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

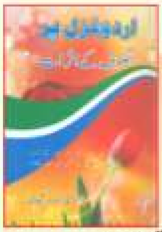

اردو غزل پر تصوف کے اثرات

مصنف/ناشر: ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی
صفحات: 320، قیمت: 175 روپے
مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

'اردو غزل پر تصوف کے اثرات' ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی کی تحقیقی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو غزل کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تصوف کی تعریف اور لفظ صوفی پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں ہندوستان میں تصوف کی مختصر تاریخ پیش کرتے ہوئے صنف غزل پر اس کے اثرات بیان کیے ہیں۔

ہندوستان میں تصوف کی خشت اوّل بلاشبہ خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھوں رکھی گئی جن کی زبان فارسی تھی لیکن وہ نظم و نثر نگاری میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ جہاں تک فارسی زبان و ادب کو اس ملک میں بام کمال تک پہنچانے کی بات آتی ہے اس کے لیے قدرت نے حضرت امیر خسرو کو منتخب کیا تھا جن کی زباندانی آج تک مسلم ہے۔ امیر خسرو کی یہ امتیازی شان ہے کہ وہ بیک وقت سلاطین اور اولیاء کرام کے دربار سے منسلک رہے جس کے اشتراک سے ان کے کلام میں تصوف کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا کہ کوئی دوسرا شاعر ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ کتاب میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، مرزا مظہر جان جاناں کے کلام میں تصوف کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان شعرا کے بعد اردو شعر و ادب کا عہد زریں آتا ہے جسے عہد میر و سودا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عہد میں غزل کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میر اور خواجہ میر درد ہیں۔ میر کا آبائی وطن اکبرآباد آگرہ تھا لیکن ان کی ذہنی نشو و نما و تربیت دہلی میں خان آرزو کی صحبت میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کندۂ ناتراش ہیرے کو یوں تراشا کہ میر اردو شاعری کی پوری دنیا پر چھا گئے اور انھوں نے علی الاعلان کہا:

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں متصوفانہ اشعار بکثرت ملتے ہیں جو ان کے صوفی شاعر ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔

دبستان دہلی کے خاتمہ کے بعد دبستان لکھنؤ میں امیر احمد امیر مینائی کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ لکھنؤ میں شاہ نصیر الدین کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ اگرچہ انھیں مختلف اصناف پر دسترس حاصل تھی لیکن اصل میدان غزل گوئی کا تھا۔ ان کے کلام میں بھی تصوف والے اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دورِ آخر میں غدر سے قبل دہلی میں کئی شعرا گزرے۔ ان میں مرزا غالب اس عہد کے نمائندہ شاعر تھے۔ خاک دہلی سے نسبت ہوجانے کی وجہ سے ان کے کلام میں بھی تصوف کے چھینٹے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اہم شعرا میں علامہ اقبال کا نام سرفہرست ہے۔ وہ بطور فلسفی شاعر مشہور ہیں۔ پہلے ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ نہیں تھا مگر جیوں جیوں وہ اسلامی مطالعے سے قریب تر ہوتے گئے تو ان کا ربط عشق الٰہی اور عشق رسول کے ساتھ پختہ تر ہوتا گیا۔ آج ان کے کلام میں تصوف کے متعدد اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

علامہ اقبال کے بعد تصوف کے اشعار کہنے والے شعرا میں علی سکندر جگر مرادآبادی کا نام آتا ہے۔ یہاں ان کا ایک شعر دیکھیے:

قسمتوں سے ملا ہے درد ہمیں
کہیں آرام جاں نہ ہوجائے

بیسویں صدی میں اردو کے سب سے بڑے غزل گو شعرا میں فضل الحسن حسرت موہانی کا نام آتا ہے جنھوں نے اردو غزل کو منجدھار سے باہر لانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

تصوف کی دنیا میں احمد رضا خاں بریلوی کا نام بھی احتراماً لیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا اسلوب دیگر شعرا سے خاصا الگ رہا ہے۔ مصنف کا قول ہے کہ:

''حضرت رضا نے اپنے کلام سے اردو شاعری کو ایک نیا وقار عطا کیا ہے۔ حسن طلب میں حضرت رضا نے وہ حسن پیدا کیا جس کی وجہ سے اردو فن ادب کا حسن بھی دوبالا ہوگیا ہے۔'' (ص 228)

ان کے علاوہ بھی بے شمار شعرا کے کلام میں تصوف کی رنگ آمیزیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی مسلک وعقائد سے کیوں نہ ہو۔ اختتامیہ حصے میں راجستھان میں اردو غزل کے ارتقائی مرحلے کا بھی ذکر ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے بہ کثرت حوالے پیش کیے ہیں تاکہ اسے قبولیت سند کا درجہ مل سکے۔ جبکہ انھیں اعتدال کی راہ اپنانی چاہیے تھی۔ دوم پروف ریڈنگ کی خامیوں کی جانب بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ کل ملا کر ان کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔

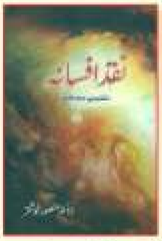

نقد افسانہ

مرتب: منصور خوشتر
صفحات: 136، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: بک کارپوریشن دہلی
مبصر: ڈاکٹر احسان عالم الحرا پبلک اسکول، محلہ: رحم خاں، دربھنگہ

'نقد افسانہ' کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے کئی پرانے اور نئے لکھنے والوں کے تنقیدی مضامین کو جمع کرکے ایک کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کرشن چندر کی افسانوی کائنات (دیپک بدکی)، راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے فکری سروکار (ڈاکٹر پرویز شہریار)، ترقی پسند افسانے کی پہلی نقیب: رشید جہاں (ڈاکٹر ابوبکر عباد)، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین (ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی)، کہانی مشک سے پھوٹتی خوشبو (خورشید حیات)، نعیمہ ضیاء الدین اور موہن و مارک کا کرداری تصادم (حقانی القاسمی)، ہم عصر نسائی بیانیہ اور اس کے متعلقات (یاسمین رشیدی)، متھلا میں اردو افسانہ نگاری: ایک جائزہ (ڈاکٹر قیام نیر)، احمد ندیم قاسمی کا فکری وفنی کینوس (ڈاکٹر زرنگار یاسمین)، غزال ضیغم کا تخلیقی وظیفہ (شاہد الرحمٰن) ہیں۔

'نقد افسانہ' میں شامل تنقیدی مضامین کم وبیش تین دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کا اعتراف مرتب نے اپنے پیش لفظ 'جوکاسہ' کے عنوان سے ہے، میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس میں شامل ہونے والے تنقیدی مضامین افسانہ نگاری کے کم وبیش تین دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ بیدی، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی وغیرہ کے فن پر یہ مضامین کھلی بحث کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ جدید افسانوں کے رجحانات پر لکھے گئے مضامین وسعت آشنا ہیں۔ کل ملا کر یہ تمام مضامین اردو فکشن کی صحیح صورت حال کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔''

دیپک بدکی نے اپنے مضمون 'کرشن چندر کی افسانوی کائنات' میں کرشن چندر کی شخصیت اور ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ نہایت سادہ، سلیس اور دلکش انداز میں لیا ہے۔ ان کے اس مضمون سے کرشن چندر کے زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے 'ترقی پسند افسانے کی پہلی نقیب- رشید جہاں' کے عنوان سے اپنا مضمون قلم بند کیا ہے۔ رشید جہاں ایک معروف افسانہ نگار خاتون ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ انگریزی میں 'سلمیٰ' کے عنوان سے لکھا۔ بعد میں انھوں نے اردو میں افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں کے کردار ان کے آس پاس کی دنیا کے فرد ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے مضمون 'تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین' میں کئی خواتین افسانہ نگاروں سے مختصر طور پر متعارف کرایا ہے۔

حقانی القاسمی نے 'نعیمہ ضیاء الدین اور موہن و مارک کا کرداری تصادم' کے عنوان سے لکھے مضمون کے ذریعے مغربی اور مشرقی تہذیب کے پروردہ موہن اور مارک کے کردار کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک سوال بھی قائم کردیا ہے کہ ایک مغربی تہذیب کا پروردہ مارک ہے جو بہترین صفات کا لڑکا ہے جبکہ دوسرا مشرقی تہذیب میں پرورش پایا ہوا موہن ہے جو نہایت ذلیل فرد ہے۔ سماج کے لیے کون سا کردار قابل قبول ہے۔

'مناظر عاشق ہرگانوی کی کہانی' کے عنوان سے ڈاکٹر فہیم اعظمی نے مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانہ نگاری پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے متھلا میں اردو افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ بڑے ہی خوب صورت انداز میں لیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں متھلا کے نامور افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے چند اہم مضامین کو یکجا کرکے قارئین کے سامنے ایک بڑی سوغات پیش کی ہے۔ امید ہے قارئین حضرات اسے پسند کریں گے۔

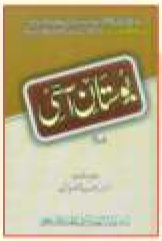

بوستان آسی (جلد دوم)

ترتیب وتدوین: ابرار رضا مصباحی
صفحات: 367، قیمت: 200 روپے
ناشر: شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی
مبصر: ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان، ڈاکٹر عبدالعلی طبیہ کالج، کنولی، ملیح آباد، لکھنؤ

زبان وبیان اور ادب وتہذیب کے فروغ میں جہاں علما فضلا ودانشوروں کی خدمات ہیں وہیں صوفیائے کرام وبزرگان دین کی بھی خدمات نمایاں ہیں۔ اس سلسلے میں پورے عالم میں خانقاہی نظام سرگرم عمل ہے اور جہاں سے علوم وفنون اور رشد وہدایت کے چشمے جاری ہوکر عالم اسلام ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کو سیراب کررہے ہیں۔

چودھویں صدی ہجری کی عظیم علمی وادبی وروحانی شخصیت حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری علیہ الرحمہ کی علمی وادبی خدمات پر گرانقدر مقالات کا مجموعہ بنام 'بوستان آسی' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کی دوسری جلد زیر تبصرہ ہے۔ پہلی جلد اس سے قبل اسی طرح کی تحریروں سے مزین ہوکر داد وتحسین حاصل کرچکی ہے جسے حضرت مولانا ابرار رضا مصباحی نے بڑی ہی محنت، لگن اور خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے اور ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند کے

بھی صاحبانِ قلم وفکر ونظر کی گرانقدر آرا، ومقالوں کو اس مجموعہ مضامین میں شامل کیا ہے۔

کتاب کا انتساب حضرت شیخ غلام رشید رشیدی عثانی جونپوری قدس سرہ متوفی 1753 (سوم سجادہ نشین خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور) کے نام ہے۔ جنھوں نے سلسلۂ رشیدیہ جونپور کی توسیع واشاعت میں تاریخی وتجدیدی کارنامے انجام دیے۔

کتاب بوستانِ آسی مشمولات کے مطابق ابتدائیہ اور تاثرات و پیغامات کے علاوہ باب 6 سے شروع ہوکر باب 11 تک مختلف عنوانات کے تحت علمی، تحقیقی، تاریخی، تنقیدی اور ادبی مباحث پر مشتمل ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی پہلی جلد میں سلسلے کے 5 باب قائم ہوچکے ہیں جن میں حضرت آسی غازی پوری کی عظمت، سلسلے کا تعارف، عہد و پس منظر اور احوال وکمالات کے عنوانات کے تحت مشاہیر کی گرانقدر تحریریں شامل ہیں۔

ابرار رضا مصباحی نوجوان ہیں مگر عالم ہیں اور جدید وعصری علوم پر بھی آپ کی نظر ہے۔ تحقیق وتصنیف میں خصوصی دلچسپی ہے لہٰذا اس حسن ترتیب پر مبارکباد کے مستحق ہیں جو کتاب بذاتِ خود اپنی تہذیب کے اعتبار سے دعوتِ تحسین حاصل کررہی ہے۔ ابتدائیہ میں آپ نے جو ذیلی عنوان لگائے ہیں ان میں علمی وروحانی آثار، عقائد ونظریات، عشق رسول، تعلقات وروابط، اصناف شاعری اور حضرت کے مجموعہ کلام 'عین المعارف' پر نقد وتبصرہ بطور خاص ہیں۔ یہ مضامین اور مقالے زیادہ تر آسی غازی پوری پر منعقدہ قومی سیمینار میں پڑھے گئے ہیں جنھیں کئی جلدوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ کتاب میں مقدمے کے طور پر شامل حرف معتبر کے عنوان سے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر اس کی قدر وقیمت میں اضافے کا باعث ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے حافظے کا سہارا لے کر اپنے بچپن میں سنے گئے آپ کے اشعار و واقعات سے اپنے تاثرات کو سجایا و سنوارا ہے۔

بقول فاروقی، آسی کے استاد حضرت افضل الہ آبادی کو ناسخ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، علامہ آسی کے شاگرد مولوی شمشاد لکھنوی تھے جن کے بارے میں حضرت آسی کا ارشاد تھا کہ شمشاد کو ناسخ سے برتر نہ جانو تو کمتر بھی نہ سمجھو۔

اسی طرح تقدیم کے طور پر پروفیسر اختر الواسع رقمطراز ہیں، آسی کی شاعری اخلاقیات اور فلسفہ تصوف کی شاعری ہے۔ آج مجھے کوئی قابل قدر تاریخ شعرا اردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسی کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو مولانا عبدالسلام ندوی بھی شعرالہند میں کسی جگہ آسی کا نام لے کر چپ ہوجاتے ہیں مگر بقول آئی اے رچرڈ، کوئی بھی فن پارہ اپنی تخلیق کے سو سال بعد تک زندہ ہے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

دیگر ابواب کے اعتبار سے حضرت آسی کا طریقہ دعوت وارشاد از ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقشبندی، جانشین آسی از پروفیسر جمال نصرت، حضرت آسی کی شاعری میں اعتقادی و اصلاحی رنگ از مولانا محمد احمد مصباحی، کلام آسی میں عقائد ونظریات اہلسنت از مفتی محمد نظام الدین رضوی، کلام آسی میں قیامت کا تصور: ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد، حضرت آسی کا مقام عشق: مولانا سعد رکن الدین اصدق، کلام آسی میں عشق رسول کے جلوے، مولانا اختر حسین فیضی، سلسلہ رشیدیہ اور سلسلۂ منعمیہ: ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد منعمی، حضرت آسی اور دائرۂ شاہ اجمل: ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی، حضرت آسی اور اصناف شاعری: ڈاکٹر کاظم ہاشمی، حضرت آسی کی نعتیہ شاعری: پروفیسر فاروق احمد صدیقی، عین المعارف ایک تجزیاتی مطالعہ: پروفیسر نظیر صدیقی، عین المعارف: عارف کامل کا نشہ عرفانی: ڈاکٹر محمد حسین شاہد رضوی کے علاوہ بطور تذکرہ مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کی بھی آرا شامل ہیں جو آسی کے فن کی قدر وقیمت کا پتہ دیتی ہیں۔ قارئین کو پہلی جلد کے مطالعے کا بھی اشتیاق ہوگا۔

اردو شاعری کا منظر نامہ

مصنف:۔ ڈاکٹر افضال عاقل

صفحات: 188، قیمت: 200/روپے

ناشر: سنجیدہ خاتون

مبصر: ڈاکٹر مقبول سلیم، صدر شعبۂ اردو، پرمیلا دیوی پاٹل آرٹس اینڈ سائنس کالج، نیکنور، ضلع بیڑ، مہاراشٹر

زیرِ تبصرہ کتاب 'اردو شاعری کا منظر نامہ' ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر افضال عاقل کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا عکاس ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے تقریباً اُنیس مضامین مختلف مکتبۂ فکر کے شعرا پر تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے غالب، مظفر حنفی، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، مظفر عظیم آبادی، عین رشید، ابراہیم اشک اور احمد کمال حشمی کی ادبی خصوصیات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ تین ابواب پر مبنی اس کتاب میں علاقہ بنگال کے اردو زبان وادب میں علمی وادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جو ڈاکٹر افضال عاقل کے اسلوب تحقیقی وتنقیدی روش کو پیش کرتا ہے۔ انھوں نے اصناف شعروادب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے جو بغیر کسی مبالغہ کے کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں موجود جدت پسندی اور ندرتِ خیال کی رنگینی اپنی پہچان بنانے میں دیر نہیں کرتی۔ ان کا شمار اُن نئے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو زمانے کے جارحانہ رویے سے نڈر ہوکر بے باک انداز میں لکھتے رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں موجود مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر افضال کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے تحقیقی وتنقیدی تصورات کے پیشِ نظر شعری ونثری دونوں اصناف سخن میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کی تحریروں میں اعتراض کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حقیقت سے وابستگی نظر آتی ہے۔ یہ مضامین مغربی بنگال کے اردو ادبی سرمایہ میں اضافہ ہیں۔ ان کی تحریریں بولتی ہیں اور انھیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نے نثر نگاری میں محض عیب جوئی سے کام نہیں لیا بلکہ فن پارے اور فنکار کے محاسن واوصاف کو بہت سلیقے سے ظاہر کیا ہے نیز ان کے معائب واغلاط کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ افضال کی نوک قلم سے نکلے ہوئے الفاظ یہ گواہی دیتے ہیں کہ ان کے یہاں ناقدانہ شعور تیز ہے، احتجاج کا پہلو بھی ہے اور الفاظ کو مسخر کر لینے کا ہنر بھی۔

مغربی بنگال اپنی عظمت، شہرت اور مہمان نوازی کی وجہ سے جہاں صوفیائے کرام، سیاحوں، تاجروں، سیاست دانوں، مذہبی رہنماؤں کی توجہ کا مرکز رہا ہے، وہیں اس نے شاعروں، ادیبوں اور دیگر فن کاروں کو باہیں پھیلا کر خندہ پیشانی سے خوش آمدید ہی نہیں کیا بلکہ ان کے خیالات واحساسات کو متاثر بھی کیا ہے۔ مختلف زبان وادب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔ کچھ یہیں کے ہورہے، کچھ روزی روٹی کما کر اپنے آبائی وطن واپس ہوگئے لیکن اپنے فکر ونظر کا رشتہ بنگال سے ہمیشہ قائم بنائے رکھا۔ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ بنگال کا مزاج بھی بدلتا رہا۔ نئی نسل کے ذہین شعرا نے بنگال کی تہذیب واقدار کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا اور حیاتی اور جذباتی طور پر متاثر بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنے محسوسات، مشاہدات، تجربات اور خیالات کا اظہار خواہ تلخ ہوں یا شیریں، بے کم وکاست اپنی غزلوں میں کیا۔ اردو نثر کے تاریخی سفر کے ادوار کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو نثر کی تاریخ بنگال کی نثر نگاری کے بغیر ادھوری ہے۔ اردو کی جدید نثر کی ترویج واشاعت میں بنگال ابتدائی دور سے ہی اہمیت رکھتا ہے۔

توضیحات و ترسیلات

مصنف: ڈاکٹر محبوب راہی

صفحات: 224، قیمت: 250 روپے

ناشر: رضیہ بانو

مبصر: قرۃ العین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'توضیحات و ترسیلات' ڈاکٹر محبوب راہی کے پینتیس (35) تحقیقی، تنقیدی و تجزیاتی اور تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی مضمون میں زندگی اور ادب کی مثبت قدروں کو کسی نہ کسی پہلو سے زیر بحث لاتے رہتے ہیں اور ادب کے اہم گوشوں اور پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مضمون 'لاگ لپیٹ کے بغیر' دراصل تبصراتی مضمون ہے جس میں مظفر حنفی کے مختلف ادبی موضوعات پر تنقیدی مقالے اور چند شخصیات پر کچھ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ زیر نظر کتاب میں شامل مضمون، اردو شاعری میں استادی شاگردی کی روایت میں ذکا صدیقی کی خوبیوں اور اچھائیوں کو ہمدرد استاد کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'ایک منزل کئی قافلے' بھی تبصراتی مضمون ہے۔ دراصل یعقوب سروش کا سفر نامہ ہے جو انھوں نے سفر حج کے دوران مقامات مقدسہ کی زیارت اور فریضہ حج کے بعد لکھا۔ اس کتاب کی بے پناہ مقبولیت اور غیر معمولی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے اس کے یکے بعد دیگرے تین اڈیشن شائع ہوئے۔ 'منظر، موسم، خواب' سیما فریدی کے شعری مجموعہ پر ایک تبصراتی مضمون ہے۔ سیما فریدی کا نام ادبی دنیا کے لیے غیر معروف نہیں ہے۔ ان کا کلام معیاری ادبی رسائل میں ہمیشہ شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے کلام میں شعور کی پختگی، تخیل کی بلند پروازی، بیان کی شستگی، زبان کی سلاست، سادگی اور پاکیزگی ملتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ایک مضمون 'اثر انصاری کی شاعری' ہے ان کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صدیوں سے انسانی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی وثقافتی زندگی کا جزو لاینفک بن جانے والی لازوال صالح روایت جسے بیشتر فیشن زدہ جدیدیوں نے ایک مکروہ یا فحش گالی سمجھ کر اپنی شاعری سے شعوری طور پر بے دخل کر رکھا تھا اثر انصاری نے ان تمام صالح اقدار کے جاندار اور لازوال عناصر سے مکمل طور پر انحراف نہ کرتے ہوئے انھیں گرم لہو کی طرح اپنی شاعری کی رگ و پے میں رواں دواں رکھا۔

زیر نظر کتاب میں ایک دیگر مضمون بعنوان 'حبیب راحت حباب کے تخلیقی خد وخال کی شناخت' ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اس مضمون میں حبیب راحت کی تخلیقی اور شعر و ادب کی خوبیوں کا مختلف پہلوؤں سے ذکر کیا ہے۔ کتاب میں شامل ایک اور تبصراتی مضمون 'تعلیمی تجزیے' ہے جو کہ ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی کے مختلف مضامین کا انتخاب ہے جس میں تعلیم و تدریس جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح کتاب میں شامل ایک دیگر موضوع 'شاہد جمیل کی غزل، نو بہ نو تجربات کی آماجگاہ' ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ شاہد جمیل کی غزل ان معنوں میں جدید ہرگز نہیں ہے جسے فیشن زدہ لا یعنیت، ژولیدگی اور ابہام و اہمال زدہ شب خونی جدیدیت سے موسوم کیا گیا ہے بلکہ ان کی تخلیقی رجحان کی جدیدیت کا اندازہ اُن کی غزلوں میں نئی زمینوں کے علاوہ ردیفوں کی اختراع اور موضوعات کے تنوع سے بھی ہوتا ہے۔ ایک دیگر مضمون 'نسیم جاں سید بشیر احمد بشیر سولار پوری' ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ہم بشیر احمد کی شخصیت کو ریزہ ریزہ قسطوں میں منقسم دیکھنے کے بجائے مکمل تخلیقی شکل میں سامنے دیکھ سکتے ہیں۔ کتاب میں شامل ایک اور مضمون 'اقبال اشہر کا مثنوی' ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں کہ اقبال اشہر نے زندگی کی طرح اپنی شاعری کے تئیں بھی جا بہ جا بے یقینی، تشکیک اور بے اعتباری کا اظہار کیا ہے۔ اور ان کے اشعار میں طنز کے مبہم پہلو بھی نظر آتے ہیں جسے قاری پڑھتے ہوئے محسوس کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں کچھ اور مضامین بھی ہیں جن پر گفتگو نہیں کی گئی ہے مثال کے طور پر

پرویز باغی کا 'دھوپ کا سایہ: ایک سرسری جائزہ'، شمیم انجم وارثی 'دشت بیکراں اور مشہود عالم آفاقی 'سفر رفعت پرواز کا'، 'بہتا لہو، جلتے جسم'، 'آسماں پر آسماں' وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

خیال اپنا اپنا

مصنف: محمد متین ندوی

صفحات: 192، قیمت: 150 روپے

ناشر: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

مبصر: سفینہ بیگم، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب 'خیال اپنا اپنا' مختلف النوع 28 مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں افسانوی ادب، غیر افسانوی ادب، شاعری، صحافت، تنقید اور متفرق شخصیات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر نصرت مہدی (سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال) کا پیش لفظ ہے اس کے بعد عنوان کی فہرست اس طرح ہے۔ نئی نسل بیساکھیوں پر کھڑی ہے، اردو غزل میں اسلامی تہذیب وثقافت، سرونج کی دینی علمی اور ادبی خدمات کا ایک جائزہ، شمس الرحمٰن فاروقی اور اردو غزل کے اہم موڑ، گوپی چند نارنگ ایک عظیم مجاہد اردو، نعیم کوثر کی افسانہ نگاری، رشید انجم اور سنگریزہ ہوائیں، ایوب واقف شعور و ادراک کی روشنی میں، پروفیسر خالد محمود تنقیدی تاثراتی مضامین اور سیفی سرونجی، یسین احمد کے افسانے جواز پر ایک نظر، پروفیسر مختار شمیم سواد حرف کے حوالے سے، نئی غزل کا معتبر شاعر ظفر صہبائی، نئی غزل کا نمائندہ شاعر شاہد میر، بے باک اور بے مثال صحافی عزیز برنی، نارنگ ساقی اور خوش کلامیاں قلم کاروں کی، عالمی شہرت یافتہ شاعرہ مصورہ پروین شیر، صوفیہ انجم تاج اور یادوں کی دستک، زر نقد شاہد پٹھان کا ایک قابل قدر کارنامہ، اصغر ویلوری کی رباعیات پر ایک نظر، دو پیک بدکی اور ادھورے چہرے، شکیلہ رفیق کا افسانہ آموختہ ایک مطالعہ، سیفی سرونجی کا نیا کارنامہ ایک بحر سو غزلیں، ابراہیم اشک بحیثیت گیت کار، گلشن کھنہ کی شاعری، نرمل سنگھ رائے پوری کی نظم نگاری، چراغ غزل اور شیو بہادر سنگھ دلبر، شیو بہادر سنگھ کا اپنے مالک حقیقی کے تئیں اظہار تشکر۔

محمد متین ندوی نے نئی نسل کے ادیبوں پر طنز کیا ہے جو اپنی تحریروں میں پختگی اور حسن پیدا کرنے کے بجائے نقادوں پر اعتماد کرتی ہے اور ان کی خوشنودی کو ادبی ترقی کا زینہ اور اپنی فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مطالعے کی کمی اور قبل از وقت اپنی تحریر کو حرف آخر سمجھ لینا ہے۔ جبکہ ادب عمیق نظری اور ذہنی بالیدگی کا تقاضا کرتا ہے۔ اردو غزل موضوعات کی سطح پر متعدد پہلوؤں سے ہمکنار رہی ہے۔ شاعر اپنے طرز فکر اور طرز احساس کی بنیاد پر شعر خلق کرتا ہے۔ محمد متین ندوی نے اپنے نقد و نظر کے مطابق اردو غزل میں اسلامی تہذیب وثقافت کی نشاندہی کی ہے اور اس ضمن میں میر تقی میر، میر درد، اقبال، فانی، جگر، ندا فاضلی، منور رانا وغیرہ کو مطالعے کا مرکز و محور بنایا ہے۔ مقام سرونج کی دینی، علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں سے تعلق رکھنے والے علما، ادبا اور شعرا کا ذکر ان کے کارناموں کے ساتھ کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی علمیت کا جائزہ ان کے ایک خطبہ 'اردو غزل کے اہم موڑ' کے حوالے سے لیا گیا ہے جس میں صنعتوں سے متعلق مباحث کو نہایت اہم قرار دیا ہے۔ لیکن مصنف نے اس تعلق سے سیر حاصل گفتگو نہیں کی اور بعض مقامات پر تاثراتی تنقید کا گمان ہونے لگتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ کتاب 'خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام' سے متعلق گفتگو کی گئی ہے جو تنقید کم قصیدہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نعیم کوثر کے مجموعہ 'اگنی پرکشا' کے جائزہ میں روایتی طریقہ کار اختیار کیا ہے اور افسانہ کی شعریات سے گریز کرتے ہوئے محض موضوعاتی گفتگو پر اکتفا کیا ہے اور یہی بات شکیلہ رفیق کے افسانہ 'آموختہ'، رشید انجم کے ڈرامہ 'سنگریزہ ہوائیں'، یسین احمد کا افسانہ

'جواز' اور 'وہیک بدکی اور ادھورے چہرے' کے تجزیے سے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ایوب واقف کے مضامین کے مجموعہ 'شعور وادراک' کو تبصراتی طور پر بیان کیا ہے اور یہی روش پروفیسر مختار شمیم کے مضمون میں اختیار کی ہے۔ پروفیسر خالد محمود کے عادات وخصائص اور علمی کارناموں کو تاثراتی انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ سیفی سرونجی کے تنقیدی وتاثراتی مضامین کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے ان کے اسلوب بیان پر بھی گفتگو کی ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ انھوں نے مختلف شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کی کتب پر تبصرہ کیا ہے اور 'نئی غزل نئے امکانات' کے نام سے ایک کتاب ان کے اداریوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سیفی سرونجی کے شعری مجموعہ 'ایک بحر سو غزلیں' میں موجود غزلوں کی معنویت اور لفظی حسن کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ظفر صہبائی کو نئی غزل کا معتبر شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے اشعار سے مختلف معنی اخذ کیے ہیں اور زبان وبیان پر ان کی قدرت کو تسلیم کیا ہے۔ غزل گو شاعر شاہد میر کی شاعری میں معنی آفرینی اور تہداری کی نشاندہی کے ساتھ ہی مثالوں کے ذریعہ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی غزلوں میں اردو ہندی دونوں الفاظ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مشہور ومعروف اور قابل قدر صحافی عزیز برنی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے صحافت کے حوالے سے ان کے بے باک قلم کی روانی کو مظلوم کے حق میں کارگر بتایا ہے۔ پروین شیر اور نرمل سنگھ رائے پوری کی نظم نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان میں نفسیاتی پیچیدگی، انسانیت کا درد، جذبے کی صداقت، احساس محرومی اور وطن سے محبت جیسے موضوعات کو اہم قرار دیا ہے اور اسلوب کی سطح پر سادگی اور معنوی حسن نے ان کی نظموں کو انفرادیت بخشی ہے۔ اس کے علاوہ گلشن کھنہ کی شاعری کا بھی جائزہ لیا ہے۔

محمد متین ندوی نے صوفیہ انجم تاج کی ہمہ جہت شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آپ بیتی 'یادوں کی دستک' کے متعلق گفتگو کی ہے اور اس کے اہم پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ مصنف نے محمد شاہد پٹھان کا ذکر ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق نقاد کے طور پر بھی کیا ہے اور اس حوالے سے ان کی کتاب 'زر نقد' کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اصغر ویلوری کی رباعیات کے متعلق لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں اسلامی تعلیمات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں گیتوں کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور اس ضمن میں بہت سے ادیبوں نے اپنے قلم کا جادو بھی دکھایا ہے انھیں میں سے ایک نام ابراہیم اشک کا بھی ہے۔ متین ندوی نے ابراہیم اشک کی گیت نگاری پر بحث کرتے ہوئے ان کے گیتوں کو تجربے اور مشاہدے پر مبنی بتایا ہے۔ شیو بہادر سنگھ دلبر کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے والا ایسا شاعر قرار دیا ہے جس کی شاعری میں متعدد وصف موجود ہیں۔ اور آخری مضمون میں مصنف نے اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ان کی شاعری کو جانچا اور پرکھا ہے۔

صحافت وابلاغیات

اکیسویں صدی میں اردو صحافت

مرتب: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 296، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 4

مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی 25

اردو صحافت پر اٹھائیس مختلف مضامین پر مشتمل یہ اہم کتاب ڈاکٹر امام اعظم کی مرتب کردہ ہے۔ اس کتاب کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بائیس مضامین اردو صحافت کے تعلق سے ہیں اور چھ مضامین انٹرنیٹ اور اردو صحافت کے حوالے سے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اردو صحافت اپنی تاریخ کی دوسری صدی پوری کرنے جارہی ہے اور ملک بھر میں ہر مکتب فکر کی تنظیموں، اداروں نے صحافت کی دوسری صدی کے حوالے سے سیمنار، سمپوزیم اور تقریبات کا انعقاد کرنا شروع کردیا ہے۔ اس لیے زیر تبصرہ کتاب کی اشاعت بھی نہایت موزوں وقت پر ہوئی ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین اردو صحافت کی تعریف، تشریح اور اشاعت کے حوالے سے بہت اہم ہیں جن کے مطالعے سے اردو صحافت کی پوری تاریخ ذہن میں مرتب ہوجاتی ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے مضمون 'اکیسویں صدی میں اردو صحافت' میں بڑی خوبصورتی سے صحافت کی تعریف اور مختلف ریاستوں میں اس کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کے مسائل سے بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بنگلہ دیش، امریکہ، ترکی، جرمنی، اوسلو، دوحہ، اسپین، ڈنمارک، برطانیہ اور پاکستان کی بھی اردو صحافت کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ مضمون نہایت معلوماتی اور تفصیلی ہے۔ اس کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ حقانی القاسمی نے اپنے مضمون 'ادبی صحافت کا عصری منظر نامہ' میں ہندوستان کی تمام ریاستوں میں اردو صحافت کی صورت حال کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور وہاں سے شائع ہونے والے رسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر فاضل حسین پرویز نے اپنے مضمون 'اردو صحافت، اندیشے اور نئے امکانات' میں اردو صحافت کی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ صاحب مضمون بذات خود ایک نہایت تجربہ کار صحافی ہیں اس لیے انھوں نے صحافتی زندگی کی تمام تر باریکیوں کو خود محسوس کیا ہے اور اس کی صعوبتوں کو جھیلا بھی ہے اس لیے نہایت دیانتداری کے ساتھ اخبارات ورسائل سے منسلک اشخاص اور ان کے مسائل کو بیان فرمایا ہے جو واقعی دعوت فکر دیتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد الاسلام نے اپنے مضمون 'اردو صحافت کا منظر نامہ' میں اردو صحافت کی ابتدا یعنی 1822 تا حال نشیب وفراز کی کہانی بیان کی ہے۔ مشمولہ دیگر مضامین یعنی 'اکیسویں صدی میں اردو صحافت' (ڈاکٹر سید احمد قادری)، 'اکیسویں صدی کی ادبی صحافت' (ڈاکٹر عبدالحی)، 'ادبی صحافت: آنچلک ڈسکورس اور اداریہ نویسی' (ڈاکٹر فیاض احمد وجیہہ)، 'اردو صحافت کا بدلتا رنگ: اکیسویں صدی میں' (ڈاکٹر احسان عالم)، 'اکیسویں صدی میں صحافت کو درپیش چیلنجز' (احمد جاوید)، 'اردو صحافت: چند بکھری بکھری دلچسپ باتیں' (سلمان عبدالصمد)، 'اردو میں زرد صحافت' (سید ایاز احمد روہوی)، 'ہندوستان کے دینی مجلات کی صحافت' (سہیل انجم)، 'اکیسویں صدی میں اردو صحافت بہار کے ادبی مراکز میں' (شمس جلیلی)، 'بہار میں اردو صحافت اور قاری کا مسئلہ' (ڈاکٹر حیدر علی)، 'اردو صحافت کے مسائل، مشکلات اور حل (مغربی بنگال کے حوالے سے)' (جہانگیر کاظمی)، 'مغربی بنگال کی اردو صحافت میری نظر میں' (ڈاکٹر نصرت جہاں)، 'اردو صحافت اور روزگار (مغربی بنگال کے حوالے سے)' (نورالصباح)، 'جھارکھنڈ میں اردو صحافت' (احسان احمد)، 'کولکاتا میں اردو صحافت' (ڈاکٹر امام اعظم)، 'دربھنگہ میں ادبی صحافت (تمثیل نو کے حوالے سے)' (ڈاکٹر مجیر احمد آزاد)، 'متھلا میں اردو صحافت' (ڈاکٹر امام اعظم)، 'وہاب اشرفی کی صحافتی خدمات ('مباحثہ' کی اداریہ نویسی کے تناظر میں)' (ڈاکٹر شاہد الرحمن) بھی کارآمد اور معلوماتی ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ اردو صحافت اور انٹرنیٹ سے متعلق ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی، سید فاضل حسین پرویز اور ڈاکٹر امام اعظم کے مضامین انٹرنیٹ کا اردو صحافت میں کردار سے متعلق ہے۔ انٹرنٹ آج کی ضرورت بن چکا ہے اس لیے اس کی اہمیت ہماری زندگیوں میں بڑھ گئی ہے۔ سارے مضامین معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اردو وکی پیڈیا کا نہایت عالمانہ جائزہ لیا ہے۔ علاوہ ازیں احمد جاوید کے مضمون 'ادب وثقافت کے فروغ میں انٹرنیٹ کا کردار اور اردو' اور شاہد اقبال کا مضمون 'سوشل میڈیا: صحافت کی نئی

معراج' ان تمام مضامین کا مطالعہ ضرور فائدہ مند ثابت ہوگا۔ آخر میں کتابیات کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر حیدر علی نے 'اس کتاب میں کتابیات کیوں؟' اردو میں صحافت پر شائع کتب کی ایک جامع فہرست شامل کی ہے۔

اردو صحافت کی دو سوسالہ تاریخ پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ اظہار خیال کتاب میں شریک مضامین میں کیا گیا ہے جس کے لیے صاحبان مضامین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر امام اعظم اس لیے قابل توصیف و تحسین ہیں کہ انھوں نے نہایت موزوں وقت پر صحافت کا موضوع منتخب کیا اور 'تمثیل نو' میں گوشہ اور پھر یہ کتاب ترتیب دے ڈالی ورنہ بے شمار تجربہ کار صحافی موجود ہیں جنھوں نے اس نہج پر کوئی پہل نہیں کی۔ مرتب موصوف نے تقریباً 22 صفحات پر 'صحافت کی ضیا' کے عنوان سے لکھے گئے مقدمہ کے تحت اردو میں صحافت کی تاریخ اور شامل کتب مضامین کا جائزہ لیا ہے۔

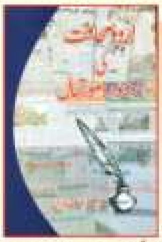

اردو صحافت کی موجودہ صورت حال

مصنف: فلاح الدین فلاحی
صفحات: 291، قیمت: 99 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی 92
مبصر: صبیحہ اطہر، 275/6، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی

اردو صحافت کے حوالے سے ان دنوں کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان میں مختلف ادوار کی صحافت کے علاوہ موجودہ دور کی صورت حال پر بھی گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ اردو صحافت کے لیے خوش آئند بات ہے کہ اس کے متنوع پہلوؤں کے حوالے سے مکالمے کا آغاز ہو چکا ہے۔ فلاح الدین فلاحی کی کتاب 'اردو صحافت کی موجودہ صورت حال' بھی ایک ایسی کتاب ہے جس میں صحافت کے ماضی، حال کے علاوہ صحافت کے بہت سے مسائل اور متعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں اردو صحافت کی تاریخ 1947 تک، تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ، 1857 کے بعد اردو اخبارات، اردو کے چند معروف صحافیوں کا ضمنی تذکرہ جیسے عنوانات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے ان تمام اخبارات کا اجمالی جائزہ لیا ہے جس سے اردو صحافت کو عروج نصیب ہوا اور جن اخبارات نے سامراجی طاقتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا پہلے باب کے موضوعات تقریباً وہی ہیں جن پر اکثر لوگ گفتگو کرتے رہے ہیں۔

دوسرے باب میں انھوں نے 1947 کے بعد سے 1980 تک کی صحافت کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اردو اخبارات کے سرکولیشن کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ اسی باب میں انھوں نے چھوٹے اخبارات کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اخبارات کا چھوٹا ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ایک چھوٹا اخبار چھوٹے ماحول میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اردو اخبارات کی پسماندگی کے وجوہات پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔

تیسرے باب میں انھوں نے 1980 سے 2000 تک کے اخبارات کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں اعداد و شمار کے حوالے سے انھوں نے کچھ حقائق درج کیے ہیں۔

چوتھے باب میں انھوں نے اکیسویں صدی میں اردو صحافت کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور دہلی سے شائع ہونے والے اردو روزناموں پر نظر ڈالی ہے۔ جن اخبارات پر انھوں نے خاص طور پر گفتگو کی ہے اس میں 'قومی آواز' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس کے امتیازات واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں طنز و مزاح، کتابوں پر کیے گئے تبصرے، تنقید و تنقیدی مضامین، شعر و شاعری، ادبی خبروں اور مراسلات کو جو بھی جگہ ملی وہ قابل ذکر ہے۔ اس میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی زبان کا معیار آخر تک برقرار رکھا۔ انھوں نے ایس ایم عثمان کے اخبار 'فیصل' اور 'ہندوستان ایکسپریس'، 'راشٹریہ سہارا'، 'روزنامہ صحافت'، 'ہمارا سماج' جیسے اخبارات کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ اردو صحافت اپنے محدود وسائل اور مالی بحران کے باوجود خدمات انجام دے رہی ہے۔ اردو اخبارات کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کچھ سیاست دانوں کے اقوال بھی درج کیے ہیں اور اردو اخبارات کے تعلق سے یہ واضح کیا ہے کہ اردو اخبارات کو اشتہارات بہت کم ملتے ہیں۔ یہ تمام باتیں قابل توجہ ہیں۔ اردو صحافیوں کی تربیت پر بھی انھوں نے اپنی معروضات پیش کی ہیں۔ ان کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ یو این آئی اردو سروس سے اردو اخباروں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ کم از کم چھوٹے اخباروں کی بقا کی راہ نکل آئی ہے۔ انھیں اب زیادہ سب ایڈیٹر (Sub Editor) اور مترجم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقصانات بھی گنائے ہیں کہ اس کی وجہ سے جن اخباروں میں کارکنوں کی کمی ہے ان میں یو این آئی کی خبر بغیر پڑھے دے دی جاتی ہے اور جن اخباروں میں کارکن تو ہیں مگر ایڈیٹنگ کے دوران بعض اوقات جملے بے ترتیب ہو جاتے ہیں اور اگر کسی خبر میں زبان و بیان میں کوئی غلطی ہے تو جوں کی توں رہ جاتی ہے۔ کتاب کے مصنف نے دینی مدارس اور ذرائع ابلاغ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اب دینی مدارس کو پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی طرف توجہ دینی چاہیے اور انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدارس میں جرنلزم کی بنیادی تعلیم دی جائے۔ اس سے مدارس کے طلبا کو فائدہ پہنچے گا۔

کتاب کے مصنف فلاح الدین فلاحی نے اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر اپنے مطالعات، مشاہدات اور خیالات کو پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے اردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کو کچھ روشنی ملے گی۔

فکشن

گرداب (ناول)

مصنف: شموئل احمد
صفحات: 186، قیمت: 220، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد آصف، شعبۂ اردو، گوتم بدھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا، یوپی

نئی صدی کے پہلے دہے میں خواتین اور ان کی نفسیات سے متعلق موضوعات پر اس طرح کی کئی نسائی تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ جن میں کہانی کوئی سناؤ متاشا، مورتی، برف آشنا پرندے، اوزم لین، دھند میں کھوئی ہوئی روشنی قابل ذکر ہیں۔

زیر نظر ناول 'گرداب' عورت اور مرد کی ہم رشتگی کا ایسا بھنور ہے بقول کبیر 'جو ابھرا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار' شموئل احمد ہمارے عہد کے فکشن کا وہ نام ہے جنھوں اپنی تخلیقات میں عصری حسیت کے ساتھ جیوتش ودیا کو بھی موضوع بحث بنایا اور اردو ادب کے تخلیقی منطقے کو منفرد طرز بیان عطا کیا اور اردو فکشن کی دنیا میں ایک نئے ڈائمنشن کی تلاش کی۔ ان کے افسانے ہمیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کی آگہی کے ساتھ علم نجوم کی مادی اور روحانی دنیا سے بھی واقف کراتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی قرأت سے مصنف کے جیوتش شاستر سے دلچسپی اور علم کا اندازہ ہوتا ہے وہ اپنے افسانوں میں علم نجوم کی ٹیکنیکل اصطلاحات کو لفظوں کے سلیس بیانیے سے مزید خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ مصری کی ڈلی، جھنگ مانس، القمبوس کی گردن جس کی عمدہ مثال ہیں۔ علم نجوم ایک ایسا علم ہے جس میں علامتوں سے انسانی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور کائنات کے رازوں کو فاش کیا جاتا ہے۔ شموئل احمد کے ناول 'گرداب' کے کردار بھی ستاروں اور سیاروں کے

راشیوں کے چکر ویو میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہندو مائیتھولوجی میں جیوتش شاستر کا رشتہ روحانیت اور مادیت دونوں سے ہے روحانیت کی صورت میں برہمہ کا حصول ہے۔ برہمہ کو حاصل کرنے کا مطلب علم وآگہی کا حصول اور دیدار ہے۔ مادیت کی صورت میں سامان عیش وعشرت کا بہم ہونا اور سیاروں کے ذریعے دھن، دولت اور دلی آرزوؤں کا پورا ہونا۔ مائیتھولوجی کے مطابق علم نجوم آغاز میں ظاہری یا مادی خوشی کا راستہ دکھاتا ہے اور انجام تک آتے آتے روحانیت کی راہ پر گامزن کردیتا ہے۔

گرداب میں شموئل احمد نے علم نجوم کے راشی کے ذریعے اپنے کردار ساجی کا تعارف کرایا ہے۔ ساجی کے تعارف سے پہلے ہی اس کے ستارے ڈھونڈ کر یہ بتادیا کہ اس پر راہو کا اثر ہے۔ کیونکہ وہ برج سرطان آبی میں پیدا ہوئی تھی زہرہ اور راہو ساتویں خانے میں تھے۔ ستارہ زہرہ محبت اور تخلیقیت اور امن وآشتی کا ستارہ ہے۔ مزید یہ کہ زہرہ والی عورتیں رومانیت پسند، ہنس مکھ اور ان کی زندگی جنسی کشش سے بھرپور ہوتی ہے۔ ان میں خود سپردگی اور زیادہ سے زیادہ جسمانی لذت کشید کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل ساجی کا شوہر نامدار ورجات ایک سادہ لوح اور شریف النفس انسان ہے اس کی مندمند آنکھیں اس کی روح کی چغلی کھاتی تھیں ان آنکھوں میں اضطراب وانبساط کا کوئی تلاطم نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ مکروہ قسم کی آسودگی کے ساتھ تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کا سکوت ہے۔ اس طرح کے مرد کی راشی برج زحل ہے جن کی جبلت میں خرگوش اور میمنا کی خصلت پائی جاتی ہے۔ ساجی کی جبلی خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پارہی تھی جس کی وجہ سے اس کی روح میں ایک جنسی خلا اور سناٹا تھا جس کی تکمیلیت کے لیے وہ سرگرداں رہتی، چالیس کی دہلیز سے وہ اپنی داخلیت میں مری ہوئی نہیں تھی بلکہ وہ محسوسات کے کنوارے پن کی تصوراتی دنیا میں جی رہی تھی۔ اور اپنے لیے جنسی راحت کا سامان ڈھونڈ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی ناآسودہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ایک تخیلی کمار وضع کرلیا تھا۔ ساجی اپنے کمار سے روحانی محبت کرتی تھی اس کو احساس ہے کہ روح تک پہنچنے کے لیے جسم ایک وسیلہ ہے، جس کے لیے وہ اپنے جسم کا بھرپور استعمال کررہی ہے۔

شموئل احمد کا ناول گرداب ان کے ناول ندی کی طرح عورت کے روحانی کرب کا المیاتی کلامیہ ہے۔ اردو فکشن میں شموئل احمد نے بڑی خوب صورتی سے علم نجوم کی تمثیل اور آسمانی اصطلاحات کو روزمرہ کی زبان میں بڑی عمدگی سے قاری تک پہونچایا ہے، جس کی مثالیں ان کے افسانے اور زیر تبصرہ ناول ہے۔ اس ناول کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جیوتش شاستر، علم نفسیات اور اسطور کے حوالوں سے کرداروں کا تحلیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ شموئل احمد نے ناول میں کہیں کہیں منٹو کا لب ولہجہ اور اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں وہ پوری طرح سے ناکام ثابت ہوئے ہیں کیونکہ منٹو کے جنسی موضوعات سنسنی خیزی پیدا کرنے یا حصول لذت کے لیے نہیں ہیں بلکہ عبرت کی شے ہیں۔ جبکہ فاضل تخلیق کار کے یہاں جنسی جبلت روحانیت کے ساتھ ہیجانیت اور لذتیت لیے ہوئے ہے۔ زبان وبیان اور موضوع کے اعتبار سے یہ ناول بہت عمدہ ہے۔ اردو کے قاری کو یہ ناول ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے۔

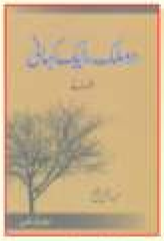

دو ملک، ایک کہانی

تخلیق کار: عبدالغنی شیخ

صفحات: 341، قیمت: 250 روپے

طباعت: اپلائڈ بکس، دہلی

مبصر: محمد مقیم، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عبدالغنی شیخ اردو کی آبادی سے دور لداخ میں رہتے ہوئے اردو زبان وادب پر نہ صرف نقد وتبصرہ کرتے ہیں بلکہ اس زبان میں تخلیق بھی کرتے ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ زبان اردو کے شیدائی ہیں اور اس زبان سے غیر معمولی شغف بھی رکھتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کی سولہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں میں سے بعض پر انھیں مختلف قسم کے ایوارڈ اور انعامات بھی مل چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ناول 'دل ہی تو ہے'، بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں 'کتابوں کی دنیا'، اور 'لداخ کی سیر' وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی میں موصوف پر پی ایچ ڈی اور اندور یونیورسٹی میں ایم فل کے مقالے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ عبدالغنی شیخ ایک کثیر التصانیف شخص ہیں، ان کی تقریباً ایک درجن کہانیوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

زیر نظر کتاب 'دو ملک، ایک کہانی' عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوکر علمی وادبی دنیا میں پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ زیر تبصرہ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں کل پینتالیس کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں سے ایک کہانی 'ہوا' کا چار زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ہندی زبان میں اس کہانی کا ترجمہ ڈاکٹر روینہ اگروال نے کیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ایک کہانی 'دادی اماں' کا انگریزی ترجمہ جموں وکشمیر اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے میٹرک کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

عبدالغنی شیخ عموماً کہانیوں کو سیدھے سادے اور سپاٹ انداز میں بغیر کسی الجھاؤ کے بیان کردیتے ہیں۔ ان کی اس روش سے کہانیوں کی ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مناسب نہیں ہوگا کہ ان کے افسانے صحافتی طرز کے ہوتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مقصدی اور افادی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور انھی پہلوؤں کو مقدم رکھتے ہوئے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنتے ہیں۔ مقصدی اور افادی نقطۂ نظر رکھنے کی وجہ سے عبدالغنی شیخ کی کہانیوں میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ آج کے پرفتن اور پراگندہ ماحول اور فسادات کو موضوع بنانے کے باوجود، گھٹن اور تاریکی میں امید کی کرن دیکھ لینا انھی کا حوصلہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے علی باقر نے کہا ہے کہ "وہ [عبدالغنی شیخ] حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں۔" اگر امید کی یہ کرنیں کسی حقیقی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں تو کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صورت میں عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری نری حقیقت نگاری ہے۔

عبدالغنی شیخ کی ایک کہانی 'ہوا' ایسا ہی رجائی پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ کہانی نفرتوں کو کم کرتی ہے اور انسان کے اندر بسا اوقات پیدا ہوجانے والی مجبوریوں کا ادراک کراتی ہے۔ یہ کہانی اپنے اختتام پر کشاکش اور وسوسوں کو شکست دیتے ہوئے انسانی اقدار اور بھائی چارے پر اعتقاد کو تقویت بخشتی ہے۔ مقصدی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک عمدہ کہانی ہے۔ یہ کہانی نہ صرف فرقہ واریت کی مخالفت کرتی ہے بلکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارے کے ان پہلوؤں پر بھی نظر رکھتی ہے جو بظاہر پسپا اور شکست خوردہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً اعلی اقدار کے عزائم اور ان کی پختگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو انسانی اقدار پر کس قدر اعتماد ہے۔ وہ محبت والفت، دوستی ورفاقت اور انسانی ہمدردی کے جذبات عالیہ سے کس قدر معمور ہیں۔

عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری میں تخیل سے زیادہ مشاہدے کا دخل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں کے کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری سے بہت مختصر کام لیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری کا اختصار اور لفظی کفایت شعاری کسی کسی مقام پر گراں بھی گذرتی ہے۔ موضوعاتی تنوع اور فکری اور نظری بوقلمونی عبدالغنی شیخ کا اختصاص ہے۔ ان کی فکر فلسفے کے بوجھ سے گراں بار نہیں ہوتی بلکہ زندگی اور انسان کے عام محسوسات اور ادراکات سے سروکار رکھتی ہے۔ اس افسانوی مجموعے

میں شامل بیشتر افسانے اپیل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر' یہ زندگی'، 'راشن کارڈ'، 'اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد'، 'دو ملک'، 'ایک کہانی'، 'یادیں'، 'اپنی موت سے پہلے اولاد کو ورثہ نہ دو' وغیرہ افسانے قاری کی طبیعت پر عمدہ تاثر چھوڑتے ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعے میں افسانوں کے علاوہ آخر میں عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری اور علمی لیاقت کے متعلق اردو کے مشہور قلمکاروں کی آرا بھی شامل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ اردو کے قارئین میں قبول عام کی سند حاصل کرے گا۔ اس خوبصورت مجموعے کی طباعت کے لیے میں عبدالغنی شیخ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر افسانے

مصنف: محمود یٰسین

صفحات: 120، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت 2014

ناشر: مژگان پبلی کیشنز، کلکتہ

مبصر: اسماء، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر افسانے' محمود یٰسین کا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں کل 14 افسانے ہیں۔ یہ تمام ہی افسانے اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ اور اب کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ 'نئی بستی کا رزمیہ' مصنف کا ساتواں افسانہ ہے جس میں انھوں نے علامتی واستعاراتی انداز میں اختیار کرتے ہوئے اپنی بات کو کامیابی کے ساتھ کہا ہے۔ کتاب میں شامل تمام افسانے اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ کتاب کا موضوع بہت سارے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ اور ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

محمود یٰسین کی نئی بستی میں ابہام ہے۔ یہاں نئی بستی سے موجودہ عہد کا نوجوان طبقہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے یا پورا عہد یا پھر اس سے اس دنیا کی تخصیص ہوتی ہے جو روزگار اور اچھے مستقبل کی تلاش میں مختلف ممالک میں آباد ہیں۔ یہ طبقہ اب اس ملک کا حصہ ہے جہاں وہ روزگار سے وابستہ ہے۔ اسے نو آبادیات بھی کیا جاسکتا ہے۔ دراصل نئی بستی کا رزمیہ 1940 کے بعد کے ادبی رجحان و رویے سے متعلق ہے۔ اس رویے یا رجحان کا موضوع تہذیبوں کا ٹکراؤ، تصادم، معاشرے کا انتشار اور فرد کی نفسیاتی وذہنی پیچیدگی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ہم اسی احساس وادراک سے گزرتے ہیں کہ آخر زندگی معنویت، مقصدیت اور عمل سے خالی ظلم وتشدد کا شکار کیوں ہے؟ پیچیدگی اور بے چینی قائم ہونے کی اصل وجہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ روز بروز دیہی زندگی، شہریت میں منتقل ہوتی جارہی ہے اس کا ذمے دار کون ہے؟ اس پورے نقشے کی تصویر کشی محمود یٰسین نے 'نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر افسانے' میں بڑی خوبصورتی وفنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کی ہے۔

کتاب میں شامل پہلا افسانہ ایک نیم سنجیدہ کہانی ہے اس افسانے میں تخلیق کار نے اپنی ذات کے حوالے سے زمانے کے کڑوے کسیلے سچ کو اس پیچیدگی سے بیان کیا ہے کہ کہانی پن پر حرف آتا ہے اور اس کا مفہوم باآسانی واضح نہیں ہو پاتا۔

کتاب میں شامل افسانہ 'رسائی' کا مطالعہ کرنے سے زمانے کے مکر وفریب اور بے وفائی اور نارسائی کی صورت سامنے آتی ہے۔

مجموعے میں شامل تیسرا افسانہ سائکی ہے جس کا مرکزی کردار بدحواسی اور بدخیالی میں عجیب وغریب صورت حال سے دوچار نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ پوری طرح حواس باختہ ہوا ہے اور ان ہی اس کی احساس ندامت آخری منزل میں ہے مگر شکست کے احساس اور کمتری کے غلبے نے اسے ہر طرف سے ناکام کردیا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب میں شامل افسانوں میں ہو سٹیلٹی، شکست خوردہ، حصار، نجات وغیرہ افسانے بھی بے حد اہم ہیں۔ جس میں محمود یٰسین نے جدید عہد کے حالات اور رویے کو تخلیقی زبان میں افسانوی پیکر عطا کیا۔ اس عہد کا پورا منظر نامہ مسائل ومصائب، ذات کا کرب، ذہنی وجسمانی اذیتیں اور سماجی کشمکش وتصادم کی جیتی جاگتی تصویریں اور اس کا فہم نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر 14 فسانوں کی شکل میں ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ قبائل، تہذیبیں، زبانیں اور ثقافتیں سب امتحان کی گھڑی سے گزر رہی ہیں۔ اور سب پر ایک سکوت طاری ہے۔ 1940 کے بعد کی معاشرتی زندگی کچھ اسی قسم کے اور ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ جدیدیت نے ان مسائل وکرب کو خاص زبان میں پیش کرنے کا ہنر پیدا کیا اور وہ زبان پیچیدگی اور غیر سنجیدگی لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ انتشار اور ہنگامی صورتوں کو اسی طرز میں بیان کیا گیا ہے جو آسان اور واضح نہیں ہے بلکہ یہ افسانے بے حد غور وفکر اور سنجیدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ محمود یٰسین کے افسانے جدیدیت کے بہت کامیاب اور مثالی نمونے ہیں۔

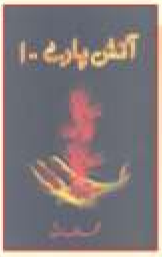

آتش پارے-1

مصنف/ناشر: محمد طارق

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے

مبصر: محمد شاہد اقبال

ڈی 81/9، تیسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی 25

ادب کی دنیا بڑی وسیع وعریض ہے جہاں مختلف فنون کی شکل میں شہ پارے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ انھیں شہ پاروں میں سے، غزلیں، مثنویات، افسانے، مراثی وغیرہ ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اردو ادب میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ انھیں شہ پاروں سے ادب کی بلند وبالا عمارت کی تعمیر ممکن ہے۔ ظاہر ہے ادب میں تمام طرح کے شہ پاروں کا ایک خاص مقام ہے اور ہر شہ پارے کے لیے کافی مشق وریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاری بھی بہت سنجیدگی کی حامل اور کسب وریاضت کی متحمل ہے۔ ماہرین کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ افسانہ نگاری جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ افسانہ نگار کو مرحلہ وار مطالعات، مشاہدات اور مکاشفات سے گزر کر ذہنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جاکر وہ اپنے افکار کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں کسی حد تک کامیاب ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب 'آتش پارے' کا پہلا حصہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں افسانہ اور افسانچوں میں کیا فرق ہے، یہ بتانا مقصود نہیں پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ طوالت کی بنیاد پر افسانوں اور افسانچوں میں تفریق کرنا مناسب نہیں ہے، البتہ افسانچوں کا چھوٹا ہونا اس بات پر دلالت ہے کہ اس کی پلاٹ نگاری میں کردار کو بہت محدود رکھا جاتا ہے۔ بیشتر افسانچے اکلوتے کردار کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا حلقہ اثر بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ آتش پارے کے مصنف محمد طارق نے اپنی اس کتاب میں 100 افسانچوں کو یکجا کرکے کتابی شکل دی ہے جو 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ آتش پارے (1) افسانچوں کے مجموعے کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب میں شامل ان کا پہلا افسانچہ 'فیملی میری پلاننگ ان کی' پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے جس طرح منظر کشی کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ مصنف کی موجودہ حالات پر بھی گہری نظر ہے۔ حالانکہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہے کہ اس میں شامل تمام افسانچے ملک کے موجودہ حالات کی ہی نشان دہی کررہے ہیں۔ ہر طرف شور شرابہ،

قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے، ہر کوئی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں اس کتاب کو دیکھا جائے تو وقت کی صحیح منظر کشی افسانچے کی شکل میں نظر آرہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان موضوعات کو ایک چھوٹے سے فریم میں سمونا کوئی آسان کام نہیں ہے تاہم افسانہ نگار نے بڑے کینوس کو چھوٹے فریم میں فٹ کرنے میں جو مہارت دکھائی ہے اس سے ان کی فنکارانہ استعداد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اجمالی طور پر 'آتش پارے' میں شامل تمام افسانچے نصیحت آموز ہیں۔

شعری مجموعے

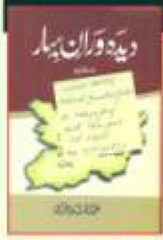

دیدہ وران بہار (اول تا سوم)

شاعر: عبدالمنان طرزی

صفحات: 500، قیمت: 500 روپے،

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سعید اختر اعظمی

عبدالمنان طرزی نے دیگر شعرا کی طرح حمد ونعت اور نظم وغزل کے میدان میں طبع آزمائی کی جس کا اعلامیہ 'طلع البدر علینا' اور 'لکیر' ہیں۔ رسا در بھنگوی اور سید سعادت علی خاں پر تحقیق کرتے ہوئے انھوں نے روایت سے انحرافی روش اپنا کر علم وادب کا پرچم بلند کرنے والے علاقہ جات، کتب اور نفوس کو محور سخن بنایا جو ان کے لیے بجا طور پر فال نیک ثابت ہوا۔ دربھنگہ کا منظوم ادبی وثقافتی جائزہ لینے کے شانہ بہ شانہ انھوں نے مناظر عاشق ہرگانوی (مناظر نامہ)، مظہر امام (دستار طرحدار)، گوپی چند نارنگ (نارنگ زار)، شاہد جمیل (شاہد جمیل)، ڈاکٹر سید تقی عابدی (فنکار حق شعار)، منور رانا (قامت)، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند (ودیا کا منظوم ساگر) کو بھی پیکر سخن میں ڈھالا۔ متھلا منیشی (میتھلا کی ہندی و میتھلی 13 اہم شخصیات) اور سو دیدہ ور (100 اہم شخصیات) شخصیتوں کے تذکرہ وتعارف کی توسیعی صورتیں ہیں۔ تین جلدوں پر مشتمل 'دیدہ وران بہار' شخصی حوالوں کی معتبریت کا آئینہ دار اور عبدالمنان طرزی کی طرز انفرادیت کا اظہاریہ ہے۔ اس میں بہار کے اہل علم وادب، مصنف ونقاد، شاعر ومدیر، عاشق کتب وعالم دین، نظم ونثر نگار (مزاح نگار، ناول نگار، افسانہ نگار وغیرہ) مصور، موسیقار اور دیگر باکمال افراد کی وقائع نویسی کی گئی ہے۔ 536 دیدہ وران کی تفصیلی یکجائی سہل نہ تھی۔ بعض کے احوال وآثار کتابوں میں محفوظ تھے تو بعض سے گفتگو یا بالمشافہ ملاقات سے ہی معلومات کا حصول ہوسکتا تھا۔ اس حوالے سے طرزی کو جو تلخ تجربات ہوئے وہ انھیں یوں قلم بند کرتے ہیں۔

'بڑے عجیب وغریب تجربے اس راہ میں ہوئے ہیں۔ ایک صاحب اپنے بارے میں تین چار اشعار کہہ کر لائے کہ میرے اوپر جو اس کتاب میں نظم ہے ان اشعار کا اضافہ کر لیجیے۔ شاعر موصوف نے میری پریشانیوں کا (جو شعر کہنے میں ہوتی ہے) اندازہ لگاتے ہوئے میری مدد فرمانا چاہی تھی۔ ایک صاحب نے میرے اصرار کے باوجود اپنی کوائف علمیہ دینے سے اس لیے گریز کیا کہ ان کے ایک عزیز بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ ایک صاحب کی دوسری کتابوں کا نام تو معلوم تھا، تازہ ترین کوئی اہم تصنیف یا ترتیب کئی جلدوں میں آئی ہے اس کا صرف نام پوچھنا تھا۔ کلاس کا وقت ہوگیا ہے، میں کلاس کے بعد آپ کو کال بیک کرتا ہوں۔ وہ مبارک گھڑی آج تک نہیں آئی۔ ایک صاحب اپنی شمولیت سے اس لیے خوش نہیں ہیں کہ ان کی بیگم کے ذکر سے یہ کتاب محروم ہے'۔ یہ ہے وہ المیہ جو کسی بھی مولف، مرتب یا مصنف کی تلاش وجستجو کے دوران اس کی حوصلہ شکنی کردیتا ہے۔ طرزی نے قلم کاروں کے حوالے سے تحقیق کرنے کے بعد انھیں منظوم پیرائے میں ڈھالا ہے۔ ہر شخصیت کے لیے الگ پیرایہ بیان، الگ انداز تحریر اور الگ ردیف وقوافی اختیار کیا ہے۔ اس میں شخصیت کے کیسے کیسے گوہر آبدار ہیں یہ تو غواص ادب کی تلاش پہ منحصر ہے۔

اسما افراد، اسما کتب اور تواریخ میں طوالت کے سبب 'الٹ پھیر' کی گئی ہے جو شعری مجبوری ہے۔ طرزی نے فن کے دریچوں کو اجالنے کی خاطر دانستہ تنقید سے گریز کرتے ہوئے تاثرات پہ اکتفا کیا ہے جو اس کتاب کا نکتۂ امتیاز اور اختصاص ہے۔ مختلف میدانوں میں کام کرنے والوں کی حیات وخدمات پر مشتمل یہ شعریت آمیز پیشکش خوب ہی نہیں، بہت خوب تر کہلائی جانے کی حق دار ہے۔

آسماں پسار آئے

شاعر: خورشید اکبر

صفحات: 200، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: ڈاکٹر انوار الحق، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

'آسماں پسار آئے' خورشید اکبر کی غزلوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ایسے بہت سے اشعار میری نظروں سے گذرے ہیں جن میں شدت احساس کا اچھوتا اور انوکھا بیان قاری کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً نفس، اور دنیا کی بات کرتے ہیں تو اپنے مشاہدات کو بیان کرنے میں قلت الفاظ کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ یعنی جس شدت سے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں وہ بیان عام لوگوں کے لیے الفاظ کی قید سے فزوں تر ہوتے ہیں۔ خورشید اکبر کا یہ شعر جو اس مجموعے کے انتساب میں درج ہے، شدت احساس کی عمدہ مثال ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

نفس کی آگ میں بھونی ہوئی مچھلی دنیا — جس کو کھاتا بھی ہے کانٹا بھی نگل جاتا ہے

دنیا کو بھونی ہوئی مچھلی سے تشبیہ دینا ایک اچھوتی اور انوکھی شاعری کی غمازی کرتا ہے اور یہ مچھلی نفس کی آگ میں بھونی ہوئی ہے۔ یہ اس دنیا کے مشاہدے کی شدت کو بروئے کار لاتا ہے۔ خورشید اکبر کی یہ خوبی ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یعنی اس ایک مصرع میں نفس، آگ، مچھلی اور دنیا جیسے الفاظ کو لا کر ایک ایسا لفظی نظام قائم کر دیا کہ ہر قاری اپنے احساسات کی شدت کو اس شعر سے جوڑ کر دوسرے مصرع میں نکالے گئے نتیجے کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

خورشید اکبر نے جس تیزی کے ساتھ اردو شاعری میں اپنی شناخت قائم کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افق شاعری پر وہ ایک ایسا ستارہ ہیں جن کی تابندگی کا جادو دیر تک قائم رہنے والا ہے۔

مجموعۂ غزل 'آسماں پسار آئے' میں کل سو غزلیں ہیں، جن میں پانچ غزلیں عرفان صدیقی کی نذر ہیں جبکہ ایک عالم خورشید اور ایک ساحر لدھیانوی کی نذر۔ خورشید اکبر کی غزلوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کے تعلق سے معروف اردو فکشن نگار سید محمد اشرف نے درست ہی لکھا ہے کہ خورشید اکبر کی شاعری میں تخلیقی وفور، زبان کا قدرے مختلف استعمال اور کسی بھی چھاپ کے الزام سے بری ہے۔ جبکہ پروفیسر منصور عالم سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، کا خیال ہے کہ 'میر وغالب کے علاقے کے بیچ سے بہت سے شعراء گذرے ہیں لیکن خورشید اکبر کے قدموں کے نشاں گیلی مٹی پر ثبت ہو گئے ہیں۔ آپ آرزوؤں کے عکس میں ان کی حیرانی کو دیکھ سکتے ہیں... نادر استعارہ، متحرک پیکر، مبہم معنی اور رمزیہ بیان یہ چار صفات خورشید اکبر کی شاعری کے خصوصی جوہر ہیں۔'

اس مجموعے میں شامل کچھ پسندیدہ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے خورشید اکبر کی شاعری کی خصوصیات کو بغیر کسی عینک کے دیکھنے میں اور ان کی امتیازی حیثیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ملاحظہ فرمائیں:

چلے تو دین کے رستے پہ مل گئی دنیا — فقیر بیٹھ گئے شاہ کے گھرانے میں
صبح کی دھند میں سورج کی دہکتی کشتی — برف کی جھیل میں شعلوں کی روانی ہوجائے
اک شاخ سے لٹکا ہوا معصوم گھروندہ — اس پر ہے فدا ایک شرر اپنی طرح کا

مری حسرتوں کا گلاب تھا، ترا باغ تھا مرا خواب تھا
وہ کھلا نہیں تو کھلا نہیں، جو کھلا تو بادِ صبا نہیں

اس طرح کے اور بھی ڈھیروں اشعار خورشید اکبر کے اس شعری مجموعے میں موجود ہیں جو آپ کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ ان چند کتابوں میں ہے جس کو آپ اپنے سرہانے رکھ کر بار بار پڑھنا اور دوسروں کو سنانا پسند کریں گے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ ذوالفقار حیدر کا ڈیزائن کیا ہوا سرورق کتاب کے نام سے مناسبت رکھتا ہے اور جاذب نظر ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی کتابیں عام طور پر اپنی بہترین پرنٹنگ کے لیے پوری اردو دنیا میں شہرت رکھتی ہیں، اس کتاب کو بھی اس ادارے کی اعلیٰ پرنٹنگ کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

رسائل و جرائد

سہ ماہی نوائے ادب

مدیر: پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحات: 96، قیمت: 100 روپے
جلد: 65، شمارہ: 102، اپریل تا ستمبر 2015
ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
مبصر: حقانی القاسمی

ایک عام شکایت ہے کہ عموماً اردو رسائل ان موضوعات و مسائل پر محیط ہوتے ہیں جن میں موجودہ معاشرہ یا نسل کے لیے افادیت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اور معاشرے کی نئی ترجیحات کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس سے بھی واقف ہیں کہ سائنس اور کمپیوٹر کے اس دور میں ہمارے مسائل اور متعلقات بھی تبدیل ہوچکے ہیں۔ نئی نسل کی ذہنی ترجیحات بھی بدل چکی ہیں۔ ان کے لیے ادق، فلسفیانہ مباحث کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بلکہ اس مسابقتی دور میں انھیں ان موضوعات کی ضرورت ہے جن سے انھیں شخصیت کی تعمیر اور مستقبل سازی میں معاونت مل سکے۔ انجمن اسلام کے سہ ماہی تحقیقی مجلّہ 'نوائے ادب' ممبئی کا خصوصی شمارہ اردو ذریعہ تعلیم کی عصری معنویت اور یا د اساتذہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں دورِ جدید کے ایک بہت ہی اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے جس پر طویل عرصے سے ڈسکورس جاری بھی ہے اور مزید ڈسکورس کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس خصوصی شمارے میں شامل خیال افروز مضامین سے ہمارے ذہن میں کچھ نئے دریچے وا ہوسکتے ہیں اور ہمیں کچھ ایسی معلومات مل سکتی ہیں جن کے ذریعے ہم اردو ذریعہ تعلیم کو اور مفید بنا سکتے ہیں۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے عصری معنویت اور اردو کے حوالے سے بڑی اہم بات کہی ہے کہ اس کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی سماج میں ذولسانیت کی اپنی اہمیت ہے۔ مادری زبان کے ساتھ علاقائی زبان، قومی زبان اور پھر بین الاقوامی زبان کے حوالے سے ذولسانیت ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پروفیسر وہاب قیصر نے 'اردو تعلیم کی معنویت اور عصری تقاضے' کے عنوان سے اردو میڈیم اسکول کے منظر نامے پر بہت ہی مربوط گفتگو کی ہے اور مختلف کالجوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہاں اردو میڈیم کے ذریعے معاشیات، بی ایس سی اور بی کام کی تعلیم کا نظم ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں ریاست آندھرا پردیش جو تلنگانہ اور آندھرا پردیش میں تقسیم ہوچکی ہے ملک کی واحد ریاست رہی ہے جہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے قبل چند یونیورسٹیوں کے ملحقہ کالجوں میں اردو میڈیم گریجویشن کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ پروفیسر یونس اگاسکر کا مضمون 'اردو تعلیم کی صورت حال اور مسائل' بھی بہت اہم ہے جس میں انھوں نے مستحقوں کی جگہ نااہلوں کی پذیرائی، تعلیمی لیاقتوں کی جگہ سفارشوں اور رشوتوں کی گرم بازاری کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بہت تلخ انداز میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں طالب علم کی لیاقت کو تولا نہیں جاتا بلکہ اس کے مارکس اور کریڈٹس کو گنا جاتا ہے۔ محمد حسن فاروقی نے 'مہاراشٹر کے تناظر میں اردو ذریعہ تعلیم اور عصری تقاضے' پر مضمون لکھا ہے اور اعداد و شمار کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ مہاراشٹر میں اردو ذریعہ تعلیم کی صورت حال قدرے بہتر ہے۔ انھوں نے ریاست مہاراشٹر میں گریجویشن پوسٹ گریجویشن سطح پر اردو زبان کی تعلیم کے نظم کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے کمپیوٹر آگہی کو عام کرنے، معاون تعلیمی مواد، سافٹ ویئر، ادبی اور مختلف فنون کی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کی مختلف الجہات مہم ملک گیر پیمانے پر جاری ہے۔ کونسل کی ان سرگرمیوں سے ریاست مہاراشٹر بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہماری اولین ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ علوم و فنون کے ذخیرے کو اردو میں منتقل کریں، ترجمے کا کام جیسے جیسے آگے بڑھے گا اردو میں بہت سی اصطلاحات وضع ہوتی جائیں گی۔ بشیر احمد انصاری نے 'معیاری اردو زبان کی تدریس اور عصری تقاضے' کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر بدرالاسلام نے 'اردو ذریعہ تعلیم اور اکیسویں صدی کا تعلیمی منظر نامہ' پر اچھی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اردو اسکول کے منتظمین کے معیار سوچ بصیرت، اساتذہ کے معیار رویہ اور وژن ہے۔ سلمیٰ لوکھنڈ والا نے 'اردو تعلیم کی افادیت اور عصری تقاضے' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے اور بہت سی تلخ حقیقتوں کا اظہار کیا ہے کہ غیر معیاری طلبا کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا معیار بھی اب کم ہوتا جارہا ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کے محاسبے پر زور بھی دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑ دیا جائے اور ہر استاد کو اردو زبان میں کمپیوٹر کی ٹریننگ دی جائے اور بہت ہی اہم بات یہ لکھی ہے کہ عالم گیریت کے اس دور میں اردو سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا ہر طالب علم نہ صرف بہترین اردو داں ہو بلکہ انگریزی زبان پر بھی اسے مساوی عبور حاصل ہو۔ مسز مسرت صاحب علی نے 'مہاراشٹر میں اردو کی تعلیم۔صورت حال، مسائل اور حل' میں یہ اچھی بات لکھی ہے کہ جہاں اردو زبان کی آبیاری یوپی اور بہار کے مدرسے کررہے ہیں وہیں مہاراشٹر میں اسکولی سطح پر اردو کی آبیاری ہورہی ہے۔ ڈاکٹر معزہ قاضی کا مضمون 'اردو کی تعلیمی تاریخ اور عصری تقاضے' بھی اس اعتبار سے اہم ہے کہ انھوں نے مادری زبان یا اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کی طرف توجہ کرنے کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ آرٹس اور کامرس کے طلبا اگر ایک ہاتھ سے اپنی ڈگری پکڑیں اور دوسرے ہاتھ میں سائنسی موضوع یا ٹیکنکل کورس کا کوئی ڈپلومہ تھام لیں تو ادب تہذیب اور ثقافتی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر وا ہوتے جائیں گے۔ انھوں نے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر بھی زور دیا ہے۔ انھوں نے کچھ ایسی شخصیات کے نام لکھے ہیں جن کی بنیاد مادری ذریعہ تعلیم نے مستحکم کی اور انگریزی پر توجہ دیتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے ان میں یہ نام ڈاکٹر عبدالرحیم اندرے (ہندوستان کے مشہور یورولوجسٹ)، ڈاکٹر محمد قاسم دلوی (UNDP advisor to planning commission, govt. of India)، ڈاکٹر نذیر جوالے (مشہور کارڈیالوجسٹ)، ڈاکٹر عبدالقادر لاہے (مشہور ای این ٹی اسپیشلسٹ)، ڈاکٹر شریفہ مشا (مشہور گائناکولوجسٹ)، ڈاکٹر ذکیہ اعجاز خان (پہلی مسلم خاتون کارڈیالوجسٹ) اہم ہیں۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے 'اردو میں اعلیٰ تعلیم' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے طالب علموں کے لیے سماج اور معاشرے میں کامیاب زندگی گزارنے اور مستقبل میں اپنے لیے امکانات پیدا کرنے کے لیے ماہرانہ ذولسانیت پر زور دیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہمیں اس کثیر لسانی ملک میں اردو کے ساتھ قومی اور علاقائی زبانیں حاصل کرنی

چاہئیں۔ اس شمارے کے تمام موضوعات بہت اہمیت کے حامل ہیں اس لیے اردو ذریعہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ شمارہ خاص طور پر پڑھنا چاہیے اور اس کی روشنی میں مستقبل کا ایک لائحہ عمل طے کرنا چاہیے تاکہ اردو تعلیم کا دائرہ بڑھے اور اس طرح اردو زبان کو فروغ حاصل ہو۔ اس کے علاوہ یاد اساتذہ کے عنوان سے ایک گوشہ بھی ہے، جس میں پروفیسر غلام حسین حملانی، فاطمہ انصاری، عبدالاحد ساز، انیسہ انصاری، فیروز احمد شیخ کے مضامین شامل ہیں۔

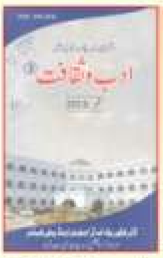

سہ ماہی **ادب و ثقافت** (3) حیدرآباد

سرپرست: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، مدیر: پروفیسر محمد ظفرالدین
صفحات: 247، شمارہ: 3، ستمبر 2016
ناشر: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مبصر: عبدالحی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان 'ادب و ثقافت' کے ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب و ثقافت' کے تازہ شمارے میں اردو ادب کے سینئر اور کہنہ مشق ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں۔ یہ 'ادب و ثقافت' کا تیسرا شمارہ ہے۔ رسالے کے مدیر نے اس کے معیار پر خصوصی توجہ دی ہے۔ موجودہ شمارے میں عبدالستار دلوی، مرزا خلیل احمد بیگ، محمد علی اثر، عارف حسن خاں، ظفر حبیب، محمد شاہد حسین، مظفر علی شہ میری، کوثر مظہری، ابوبکر عباد، آمنہ تحسین، احمد کفیل وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ عبدالستار دلوی نے مولانا آزاد کی تکثیریت کے حوالے سے معلوماتی مضمون لکھا ہے انھوں نے اپنے مضمون میں آزاد کی تقریروں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: مولانا آزاد نے ہندوستان کے تکثیری ماحول میں لسانی اعتبار سے قومی زبان کی حیثیت سے ہندی کو تسلیم کیا تاہم اسی کے ساتھ انھوں نے اردو کو جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور سارے ہندوستان میں عام طور سے ابلاغ و توسیع کی زبان ہے اسے محفوظ کرنے کے مواقع فراہم کیے اور اس کی وکالت بھی کی۔ ہندوستان کے دستور میں آٹھویں شیڈیول میں دو قومی زبانیں شامل کی گئی ہیں اس میں اردو بھی شامل ہوگئی ہے اور اس میں مولانا آزاد کو پہلے وزیراعظم جن کی خود مادری زبان اردو تھی ان کی تائید بھی حاصل رہی۔ ہندوستان کے تکثیری سماج میں مولانا آزاد کا لسانی اعتبار سے یہ ایک اہم کردار رہا ہے۔'' (ص 14)

اردو قواعد نویسی پر تحریر کیے گئے اپنے مضمون میں معروف ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اردو قواعد پر پہلے پہل غیر ملکیوں نے کتابیں تحریر کی ہیں۔

وہ اپنے طویل مضمون کا اختتام ان سطور پر کرتے ہیں:

''اردو قواعد نویسی کے اس مفصل تاریخی و موضوعی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو قواعد نویسی کی روایت برصغیر ہند و پاک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں نہ صرف قدیم ہے، بلکہ جامع بھی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو قواعد نویسی کی روایت کو قائم کرنے اور اسے توسیع دینے میں اہل یورپ نے نہایت اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔'' (ص 45)

نامور محقق محمد علی اثر نے قرآنی تلمیحات پر مبنی دکنی شعرا کے اشعار جمع کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ دکن کے شاعروں نے قرآن کی تلمیحات کو اپنی شاعری میں بہت اچھے انداز میں برتا ہے۔ محمد شاہد حسین نے محمد حسن کے ڈراما 'ضحاک' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جبکہ مظفر شہ میری کا مضمون اردو زبان کی قانونی حیثیت متعین کرتا ہے۔ اس شمارے کے مضامین میں تنوع اور انفرادیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ رسالے کے مدیر پروفیسر محمد ظفرالدین نے رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

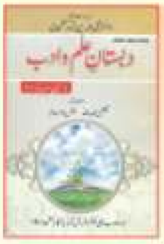

دبستان علم و ادب

مدیران: گلشن عبداللہ اور انیس الاسلام
صفحات: 169، قیمت: 150 روپے
ناشر: دارالادب پبلی کیشنز، فراش گنڈ، بڈگام کشمیر
مبصر: ریحانہ فاطمہ
F-148/1، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان میں جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور عوامی رابطے کی زبان کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری اور لداخ میں لداخی ہے۔ اس کثیر لسانی ریاست میں اردو دوسری زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان ایک پل اور رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ان باتوں سے قطع نظر ریاست جموں و کشمیر میں کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی آبیاری بھی خوب ہوئی۔ زور کی سرپرستی میں یہ رسالہ (دبستان علم و ادب) شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے۔ پیش نظر مجلہ کتابی سلسلہ نمبر 4 جنوری تا جون کا شمارہ ہے جس میں مختلف موضوعات پر 22 مقالات ہیں اور اس کے لکھنے والے زیادہ تر وادی کے نوجوان ادیب ہیں ان ادیبوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کی نئی نسل اردو زبان و ادب کے تئیں سنجیدہ ہے اور اسے اپنے مطالعے کا حصہ سمجھتی ہے۔ اس مختصر سے تبصرے میں رسالے میں شائع ہر ایک مضمون پر تبادلہ خیال کرنا مشکل ہے لیکن چند مضامین جو پہلی نظر میں اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں ان میں فردوس احمد بٹ کا مضمون عزیز احمد کا تاریخی ناول جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں۔ اس ناول کا شمار عزیز احمد کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔ مضمون نگار نے اس ناول کے نفس مضمون اور کرداروں سے قارئین کو واقف کرایا ہے۔ حالانکہ اس ناول میں ترکی کی تہذیب اور ترکی زبان کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن اس پر ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ مضمون بھرپور ہے اور ناول کی تفہیم آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس رسالے میں دو مضمون اقبال پر ہیں۔ پہلا مضمون نذیر نظر کا جاوید اقبال بحیثیت اقبال شناس اور دوسرا محمد یسین گنائی اقبال اور اسلامی تہذیب کا زوال۔ اول لذکر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے اور اقبال شناسی کے میدان میں ایک اضافہ ہے دوسرے مضمون میں گنائی نے اقبال کی شاعری میں اسلامی تہذیب کا زوال پر ماتم کو موضوع بنایا ہے اور چیدہ چیدہ اشعار کے ذریعے اسلامی تہذیب کے زوال کو دکھایا ہے۔ جموں کے ایک مشہور غزل گو شاعر عرش صہبائی ہیں۔ انھوں نے ہندی میں دوہے بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ اعجاز کا یہ مضمون ایک بھرپور مضمون ہے اور دوہا کی ہلکی پھلکی تاریخ کے ساتھ ریاست میں دوہا کی صورت حال اور عرش صہبائی کی دوہا نگاری پر بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ گلشن عبداللہ کا مضمون سرسید تحریک اور اس کا ردعمل ڈاکٹر حنا اسحاق فارسی شاعری پر جدیدیت کے اثرات سجاد لون کا مضمون مولانا ابوالکلام آزاد و فکر نسواں کے حوالے سے منفرد اور اچھے مضامین میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اس شمارے کا حاصل مضمون سیرت نگاری پر شبیر احمد لون کا ہے۔ ادب میں سیرت نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے لیکن یہی سیرت جب حضرت محمد ﷺ کے حوالے سے ہوتی ہے تو انتہائی نازک اور حساس ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ انتہائی مشکل فن ہے بشیر احمد لون نے نہایت عرق ریزی سے یہ مختصر سا مضمون لکھا ہے جس میں سیرت نگاری کے مختلف پہلوؤں سے بحث بھی کی گئی ہے اور مذہبی نکتہ نگاہ سے سیرت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ اور دیگر مضامین بھی قابل توجہ ہیں۔

اس نوع کے رسائل وادی سے ماہنامہ یا سہ ماہی شائع ہوں تو زیادہ اچھا ہے اور نئی نسل کی ذہنی آبیاری میں ایسے رسائل ہی معاون و مددگار ہوں گے۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

میں اردو زبان سیکھوں گا: پرکاش جاوڈیکر

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر مبارک باد کے مستحق ہیں: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل

قومی اردو کونسل کی تیئسویں جنرل باڈی کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: اردو زبان مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں یہ زبان سیکھوں گا اور اس کے لیے کام بھی کروں گا۔ ان خیالات کا اظہار عزت مآب محترم پرکاش جاوڈیکر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تیئسویں جنرل باڈی کی میٹنگ میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ اس میٹنگ کا اہتمام پارلیمنٹ انیکسی کے کانفرنس ہال میں کیا گیا جس میں تقریباً کونسل کے تمام ممبران شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر اور تمام ممبران نے قومی اردو کونسل کی سابق چیئرپرسن محترمہ اسمرتی زوبین ایرانی کا بطور خاص شکریہ ادا کیا کہ کونسل نے ان کی رہنمائی میں ترقی کی نئی راہیں طے کیں۔

این سی پی یو ایل کے موجودہ چیئرمین اور مرکزی وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر نے اس موقعے پر تمام ممبران سے متعارف ہونے میں پہل کی اور کونسل کے ذریعے پیش کیے گئے پاور پوائنٹ پریزینٹیشن پر بے حد مسرت کا اظہار کیا اور کونسل کی حسن کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل ترقی کی جانب گامزن ہے۔ اس کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ قومی اردو کونسل کو مزید فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ میں اس کے لیے ہر ممکن تعاون دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔ میٹنگ میں ممبران نے فرداً فرداً اپنی تجاویز رکھیں جن پر وزیر محترم نے تفصیل سے تبصرہ کیا اور یہ کہا کہ آپ لوگ چھوٹی چھوٹی دو تین کمیٹیاں اور بنائیں اور ان کمیٹیوں کے تحت منصوبہ بند طریقے سے کام کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے مزید یہ کہا کہ اب قومی اردو کونسل کی جنرل باڈی کی میٹنگ سال میں دو بار ہوا کرے گی جس میں کونسل کے ممبران کے علاوہ اردو سے تعلق رکھنے والے دانشوران بھی شریک ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ایک وژن ڈاکیومنٹ تیار کیا جائے گا اور نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشن کی دوبارہ تشکیل ہوگی۔ میٹنگ کے اختتام پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مرکزی وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر اور تمام ممبران کا شکریہ ادا کیا۔

قومی اردو کونسل کی تیئسویں جنرل باڈی کی میٹنگ کے مناظر.....

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 نومبر 2016

فارسی زبان اور خطاطی کے فروغ کے لیے ایران کی ثقافتی تنظیموں سے اشتراک

نئی دهلی: ہند-ایران کی مشترکہ میراث کے احیا، فارسی زبان اور خطاطی کے فروغ اور دیگر ثقافتی امور کے حوالے سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور ایران کے ثقافتی وفد کے مابین تبادلۂ خیال ہوا جس میں دونوں ملکوں کے ثقافتی ادبی تبادلات

قومی اردو کونسل میں ایران کے ثقافتی وفد کے ساتھ تبادلۂ خیال

اور روابط جیسے کئی اہم نکات زیر بحث آئے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ایران کے ثقافتی وفد کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان سے ایران کے قدیم تہذیبی علمی اور ادبی روابط رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں ان رابطوں کے احیا کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان کا فروغ بھی قومی اردو کونسل کی ذمے داریوں میں شامل ہے۔ اس لیے ایران سے اشتراک کے ذریعے فارسی زبان کے فروغ کا ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ خطاطی کا بھی ایران سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے اس لیے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام چل رہے خطاطی سینٹر کا اشتراک ایران سے ہو جائے تو فن خطاطی کو زندہ رکھنے کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ تبادلہ پروگرام کے ذریعے فارسی زبان اور خطاطی کے فروغ کے لیے ہم مل جل کر اہم اقدامات کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے ثقافتی ادبی تبادلے سے دونوں ملکوں کے روابط بھی بہتر ہوں گے۔

ڈاکٹر ہادی سعیدی کیا سری، ڈاکٹر مہدی مظاہری، سید علی میر ماہروح، ڈاکٹر سید جواد احمدی پر مشتمل ایران کے ثقافتی وفد نے بھی فارسی زبان کے فروغ کے باب میں قومی اردو کونسل کی کوششوں کو سراہا اور کونسل کے سینٹر کے ذریعے تیار کیے گئے خطاطی کے نمونوں کی پذیرائی کی۔ ایران کے ثقافتی وفد نے فارسی زبان کے فروغ اور معاصر اردو فارسی فرہنگ اور ادبیات کی طباعت کے معاملے میں ہم کاری اور معاونت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فرہنگ آصفیہ کی طرز پر ایران اور قومی اردو کونسل دونوں مل کر اردو فارسی لغت اور فارسی اردو لغت کی تدوین اور ترتیب کا کام کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مختصر مدت میں فارسی زبان آموزی کے لیے بھی ہر ممکن معاونت کی یقین دہانی کرائی۔ ایرانی وفد نے ایران میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پر بھی رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ ایران میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد سے فارسی اور اردو زبان کے گہرے روابط کی ایک نئی تاریخ مرتب ہوگی!

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 نومبر 2016

اردو زبان کے فروغ میں یونانی اطبا کا اہم رول

نئی دهلی: آزادی سے قبل طب یونانی کا ذریعہ تعلیم عربی و فارسی تھا، لیکن آزادی کے بعد ان تمام کتابوں کے تراجم اردو میں کرائے گئے اور اس سے متعلق عربی اور انگریزی اصطلاحات بھی اردو میں تیار کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں یونانی اطبا کا اہم رول رہا ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔ آج بھی یونانی طب کی جو اصطلاحات استعمال ہو رہی ہیں وہ اردو میں ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل اپنے کو صرف اردو ادب تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتی بلکہ دوسرے علوم و فنون کے تراجم کے ذریعہ اردو کے خزانے کو مزید وسعت دینا چاہتی ہے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اردو کا فروغ ممکن ہو سکے اور یہی کونسل کا مقصد بھی ہے۔ اس پینل کی صدارت پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کی۔ انھوں نے پچھلی میٹنگ میں لیے گئے فیصلے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ تقریباً سارے مضامین کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ انھوں

یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نے کہا کہ کونسل کا یہ بہت بڑا منصوبہ تھا۔ اگر مکمل نصاب تیار کر لیا گیا تو کونسل کا طب یونانی کی دنیا میں ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس کے لیے انھوں نے تمام ممبران کی طرف سے کونسل کے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر شبیر احمد نے کہا کہ فی الوقت پورے ملک میں ساٹھ یونانی کالجز ہیں وہاں پڑھنے والے تمام طلبہ کو نہ صرف بالواسطہ بلکہ براہ راست کونسل کی جانب سے تیار کردہ کتابوں سے فائدہ ہوگا۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان کے ڈائی گرام رنگین ہوں گے تمام اصطلاحات اردو کے علاوہ انگریزی میں قوسین میں ہوں گی اور اس میں شامل تمام تر معلومات عصری تقاضوں کو پورا کریں گی۔ اس کام کے لیے کونسل کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔

میٹنگ میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر زین العابدین، ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر سیما اکبر، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ آفیسر) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 نومبر 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

رؤف رضا

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کے معروف شاعر رؤف رضا کے انتقال پر

اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رؤف رضا کا تعلق دہلی کی اس نسل سے تھا جس نے اردو شاعری کے افق کو نئی تابانی عطا کی تھی اور جس نے بھیڑ میں بھی اپنے لہجے کو بچائے رکھا تھا۔ ان کی رحلت ہم عصر اردو شاعری کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ انھوں نے کہا کہ رؤف رضا نہایت متحرک اور فعال تخلیق کار تھے۔ سوشل میڈیا پر متحرک رہنے کے ساتھ ساتھ ادبی ثقافتی تقریبات میں ان کی شرکت ان کی تخلیقی فعالیت کا ایک ثبوت ہے۔ رؤف رضا نے اپنی لفظیات، تراکیب اور جدتِ ادا سے شعر وسخن سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا تھا۔ ان کے اشعار میں حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری کردینے والا عنصر بھی تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ رؤف رضا اپنے طور وطرز کے منفرد اور باکمال شاعر تھے۔ 'دھنکیں میری' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ وہ اکثر تنقیدی حوالوں میں بھی شامل رہتے تھے۔ خاص طور پر مابعد جدید غزل گو شاعروں میں رؤف رضا کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ ایک اہم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ نہایت خلیق، متواضع اور منکسر۔ وہ بنیادی طور پر انٹیریئر ڈیکوریٹر (Interior decorator) تھے مگر اردو کی ادبی اور شعری روایت پر ان کی گہری نظر تھی۔ ادبی مباحث میں بھی وہ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ وہ دہلی کی شعری نشستوں کی رونق تھے۔ ان کے انتقال سے ادب کی کہکشاں کچھ اجڑی اجڑی سی لگتی ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2 دسمبر 2016

بیکل اُتساہی

نئی دھلی: عالمی سطح پر مقبولیت اور شہرت کے حامل بیکل اُتساہی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے

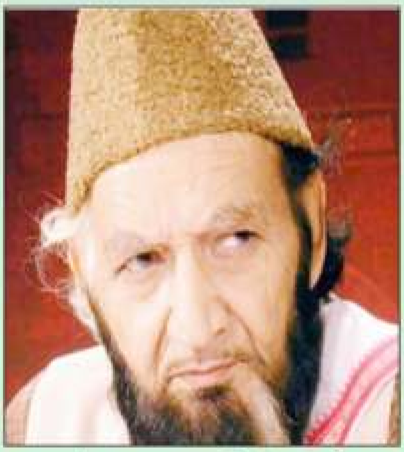

کہا کہ بیکل اُتساہی گنگا جمنی تہذیب کا ایک روشن استعارہ تھے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ملتی ہے۔ انھوں نے خسرو، جائسی، تلسی، کبیر، میرا اور رس کھان کی روایت کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور ہندوستانی تہذیبی افکار و اقدار کی مکمل عکاسی کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ پدم شری بیکل اُتساہی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے لوک ادب کی گمشدہ روایتوں کو زندہ کیا اور مختلف علاقائی بولیوں اودھی، بھوجپوری اور پوربی کو اپنی تخلیقی حسیت کا حصہ بنا کر ان زبانوں کو نئی زندگی اور تازگی عطا کی۔ بیکل اُتساہی نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ حمد، نعت، مناجات، مناقب، قصائد، مرثیے، دوہے، غزلیں، گیت ہر ایک صنف کو اپنے مخصوص لہجے سے تابندگی اور توانائی عطا کی۔ انھوں نے ہندوستانیت کی روح اور رمز کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اسے اپنے گیتوں کے ذریعے عوام میں پیش کیا۔ عوامی جذبات اور محسوسات کی ترجمانی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی لفظیات اردو کے عام شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ بیکل اُتساہی نے مختلف طرح کے لسانی تجربے کیے۔ لسانی امتزاجیت کو ان کا ایک امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بیکل اُتساہی نے اپنے گیتوں کے ذریعے قومی یکجہتی اور اتحاد باہمی کے جذبات کو فروغ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقے میں یکساں احترام اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی وفات ہندوستانی تہذیب وثقافت اور اردو ادب کا بڑا خسارہ ہے۔ انھوں نے عالمی سطح پر اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اُسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر لوک ادب کے ضمن میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ معاصر شعری منظر نامے میں بیکل اُتساہی کی اپنی ایک الگ شناخت تھی خاص طور پر نعت اور گیت کے حوالے سے ان کا اعتبار ادبی حلقوں میں قائم تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بیکل اُتساہی ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ انھیں عوامی درد و کرب کا پورا احساس تھا اور وہ خدمتِ خلق کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ سیاست ان کا میدان نہیں تھا مگر سیاست میں رہ کر بھی انھوں نے عوام کی بڑی خدمت کی۔

بیکل اُتساہی کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شمع کوثر یزدانی، شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر زین شمسی، ڈاکٹر سید تنویر حسین، عصیم احمد، شاہنواز خرم، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، ڈاکٹر عبدالرشید، مشہود عالم نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 دسمبر 2016

سالار جنگ میوزیم میں این سی پی یو ایل کی خطاطی نمائش وتربیتی پروگرام

حیدرآباد: مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست جناب زاہد علی خان نے فن خطاطی کے فروغ کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ شہر حیدرآباد کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر اردو زبان کے فروغ کی جدوجہد پورے زور شور کے ساتھ کی جاتی ہے مگر حکومتی سطح پر بھی اردو زبان کا فروغ ہماری لسانی

تہذیب کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ سالار جنگ میوزیم میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیراہتمام منعقدہ خطاطی نمائش و تربیتی پروگرام کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جناب زاہد علی خان نے کہا کہ سیاست نے اب تک ڈیڑھ کروڑ روپے خطاطی کے فروغ کے لیے خرچ کیے ہیں تاکہ اس عظیم فن کو محفوظ کیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ چھ ہزار سے زائد فن خطاطی کے نمونے ادارہ سیاست میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادارہ ادبیات اردو میں بھی خطاطی کے کئی نایاب نمونے موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جناب زاہد علی خان نے اردو کے متعلق کی جانے والی بدگمانیوں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اردو آج کے جدید دور میں بھی کافی مقبول ہے۔

ادارہ سیاست کی ویب سائٹ کے توسط سے دنیا کے تین ہزار پانچ سو شہروں کے لوگ اردو اخبار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ نائب وزیراعلیٰ تلنگانہ ریاست الحاج محمد محمود علی نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے بجٹ میں اضافے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ چیف منسٹر کے چندر شیکھر راؤ کا شمار اردو دانوں میں ہوتا ہے اور وہ اردو زبان اور اردو داں طبقہ کی فلاح و بہبود کے لیے سنجیدہ اقدامات بھی کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی قوم کی بدحالی کو تعلیم سے دور کیا جاسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ چیف منسٹر کے چندر شیکھر راؤ بھی تلنگانہ میں مسلمانوں کے ماضی کا احیا عمل میں لانے کے لیے انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا کام کررہے ہیں۔

جناب محمد محمود علی نے بتایا کہ اقلیتوں کے لیے اقامتی اسکولس کا قیام اسی مقصد سے عمل میں لایا جارہا ہے کہ دیگر طبقات کے ساتھ مسلم اقلیت کو بھی تعلیم یافتہ بنایا جاسکے۔ انھوں نے فن خطاطی کے فروغ میں ادارہ سیاست کی کاوشوں کی ستائش کی اور کہا کہ حکومت تلنگانہ تمام اقامتی اسکولس میں فن خطاطی کو نصاب میں شامل کرتے ہوئے فن خطاطی سے وابستہ افراد کا شعبہ درس و تدریس میں تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت تلنگانہ پانچ سو اقامتی اسکولس قائم کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے جہاں پر مستقبل میں فن خطاطی سے وابستہ افراد کی ضرورت پڑے گی۔

اس موقعے پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، انیس احمد کے علاوہ دیگر لوگ موجود تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ نوجوان نسل کو اردو زبان سے روشناس کروانا ان میں اردو سے دلچسپی پیدا کرنا، اردو کا فروغ اور اس کی ترقی اس نمائش کا اصل مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا استحکام ہم تمام کی ذمے داری ہے۔ تمام کیلی گرافرس کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بھی اس کا ایک مقصد ہے۔

آرگنائزر انتخاب احمد نے بتایا کہ اس کیلی گرافی آرٹ نمائش کا مقصد نہ صرف خطاطی کو رواج دینا ہے بلکہ اردو زبان کی ترقی وترویج بھی اس کا اہم مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت قومی سطح پر 60 سے زائد خطاطی کے مراکز اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خطاطی کا یہ کورس 2 سال کا ہے۔ ہر کلاس میں 50 طلبا وطالبات اس فن کو دو شفٹوں میں سیکھ رہے ہیں۔ یہ نمائش سال میں ایک مرتبہ قومی سطح پر منعقد کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر اساتذہ، طلبا وطالبات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، 6 نومبر 2016

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

صوفی سنت روایات۔زبان وادب اور ثقافت

اورنگ آباد: انسانیت کی فلاح تصوف کا بنیادی مقصد ہے۔ جبکہ موجودہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو سماج میں پھیلے ہوئے انتشار کو دور کرنے کے لیے تصوف کی فکر کو عام کرنا ضروری ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ

بنانے سے انتشار کی شروعات ہوتی ہے۔ اس معاملے میں روشن ضمیری کی طرف توجہ دیتے ہوئے تصوف کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کرنا چاہیے کیونکہ تصوف میں تعمیر ہی تعمیر ہے۔ قوم وملک کی ترقی وبہتری کے لیے کام کرنے کے عزم کے ساتھ اگر ہر کوئی متحرک ہوجائے تو سماج میں پھیلی ہوئی بدامنی وانتشار کو بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے، ڈاکٹر رفیق زکریا سینٹر فار ہائر لرننگ اینڈ ایڈوانسڈ ریسرچ ومولانا آزاد کالج آف آرٹس سائنس اینڈ کامرس کے زیر اہتمام 'صوفی سنت روایات– زبان ادب اور ثقافت' کے عنوان کے تحت منعقدہ سہ روزہ قومی سمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادب بھی ایک خانقاہ ہے جبکہ صوفی سنت کا کام ادیب وشاعر بھی کرتے ہیں۔ اس لیے موجودہ قحط الرجال کے ماحول کو دور کرنے کے لیے صوفی سنت روایات وتعلیمات کو فروغ دینا ضروری ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ڈاکٹر رفیق زکریا میموریل لیکچر کو شروع کرنے کو فوری منظوری دینے کا اعلان کرتے ہوئے اس سلسلے کو اسی معاشی سال سے آغاز کردینے کی درخواست بھی کی نیز اس کے لیے این سی پی یو ایل کی جانب سے مالی امداد دینے کے ساتھ ہی ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس میں این سی پی یو ایل کے تحت کمپیوٹر تربیتی کورس شروع کرکے اردو کو روزگار سے جوڑنے میں تعاون کرنے کی ذمہ داران ادارہ سے درخواست کی۔ انھوں نے کہا کہ ادب، زبان وثقافت کا کام جنوبی ہند کے مقابلے میں مشرقی ہند میں بہتر اور موثر پیمانہ پر ہورہا ہے۔ لہٰذا اگر دکن یا مشرقی ہند سے کوئی بھی پروپوزل منظوری کے لیے پہنچتا ہے تو وہ اسے ترجیحی بنیاد پر منظوری دینے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ صوفی سنت روایات کے دکن میں مطالعہ کی غرض سے اگر عنقریب کوئی پروپوزل این سی پی یو ایل کو ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے بھی میٹنگ میں رکھتے ہوئے منظوری دینے میں خوشی محسوس کریں گے۔ این سی پی یو ایل کی سرگرمیوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ جلد ہی اردو دنیا اور بچوں کی دنیا رسالوں کی طرز پر خواتین کی دنیا رسالہ بھی شروع کیا جارہا ہے، بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد غیر ممالک میں کرنے کی تیاریاں جاری ہیں، ایک کروڑ روپے کے اخراجات سے ملک کی اردو سے جڑی ہوئی یونیورسٹی میں اردو چیئر کے قیام کی تجویز متعلقہ وزارت کو روانہ کی جاچکی ہے جس میں اردو کے ارتقا کے لیے اسکالروں کا تقرر کرتے ہوئے یو جی سی کے معیار کے لحاظ سے اعزازیہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اسی طرح صدر جمہوریہ کی جانب سے دیے جانے والے مختلف زبانوں کے ایوارڈ کی طرح 5 لاکھ روپے پر مشتمل ایوارڈ اردو زبان کے لیے بھی دینے کی کوشش این سی پی یو ایل کی جانب سے کی گئی ہے۔ جو منظوری کے آخری مراحل میں ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ تعلیم ہی موجودہ دور کے تمام مسائل کا حل ہے لہٰذا اسکولوں میں طلبہ کے ڈراپ آؤٹ پر خاص توجہ دی جانی چاہیے۔ اردو سے محبت کرنے والے اگر یہ عزم کرلیں کہ وہ اپنے تئیں کم ازکم ایک بچے کی تعلیم وتربیت کی جانب توجہ دیں گے تو ایک بہت بڑی قومی خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان، ادب وثقافت اور صوفی سنت روایات کے اسرار کو اجاگر کیا۔ تقریب کی صدارت مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کی چیئرمین اور مولانا آزاد ایجوکیشن سوسائٹی کی صدر پدم شری فاطمہ رفیق زکریا نے کی۔ صدارتی خطبہ میں میڈم فاطمہ رفیق زکریا نے کہا کہ مرحوم ڈاکٹر رفیق زکریا کے تعلیمی وادبی مشن کو جاری رکھا جائے گا۔ خیر مقدمی تقریر مولانا آزاد کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض آل انڈیا ریڈیو کے سابق نیوز ریڈر خان مقیم خان نے انجام دیے۔ اس سہ روزہ کانفرنس کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے کیا گیا۔ کانفرنس کے دوران مشہور ومعروف نقاد ودانشور ڈاکٹر ارتکاز افضل کے اولین شعری مجموعہ 'حسب معمول' کی رسم اجرا بھی این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور میڈم فاطمہ رفیق زکریا کے ہاتھوں انجام پائی۔

روزنامہ 'ہندوستان' اورنگ آباد، 18 نومبر 2016

امیر خسرو کی ادبی خدمات

نئی دہلی: امیر خسرو ایک صوفی اور مرد کامل تھے۔ ان کی زندگی تمام انسانوں کے لیے قومی ہم آہنگی اور یکجہتی کا پیغام تھی۔ ان خیالات کا اظہار الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اشتراک

منعقدہ سمینار 'امیر خسرو کی ادبی خدمات' میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ انھوں نے سمینار میں شریک اسکالرز کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اردو ادبیات کی سمت میں طلبا کے بڑھتے قدم کی نہ صرف ستائش کی بلکہ ہر ممکن معاونت کا بھی یقین

دلایا۔ سوامی اگنی ویش نے امیر خسرو سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کی شخصیت محبت و انسانیت کا درس دیتی ہے۔ ایران کلچرل ہاؤس کے ڈپٹی کلچرل کونسلر حجۃ اللہ عابدی نے امیر خسرو کو فارسی کا عظیم شاعر بتاتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کا فارسی ادب کے لیے بڑا تعاون رہا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا مرکز اصلاً فارسی ہی کو بنایا۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بھی شاعری کی لیکن فارسی ان کے خیالات کے اظہار کا میدان رہی۔ احمد رحیمی سکریٹری کونسل ایران ایمبیسی نے کہا کہ امیر خسرو نہ صرف ہندوستان کی عظیم شخصیت تھے بلکہ وہ دنیا کی بھی عبقری شخصیت تھے۔ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ امیر خسرو اپنے زمانے کی عظیم و عبقری شخصیت تھے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو پوری طرح قبول کیا اور اس کو فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ امیر خسرو کی شخصیت کی کشش ہے کہ آج بھی انھیں پڑھایا جارہا ہے۔ مفتی افروز عالم قاسمی نے کہا کہ امیر خسرو ہندوستانی تہذیب کی علامت تھے، علمی رفعت سے لے کر ولایتِ خسروانہ تک امیر خسرو 'امیر' تھے۔ علوم وفنون کے بے تاج بادشاہ تھے، زبان اردو کی شعری و نثری اصناف پر کمال درجہ عبور رکھتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر علیم اشرف نے چشم کشا مقالے کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت ہے امیر خسرو کی ادبی خدمات کے ورثہ کو باقی رکھنے اور اس کے لیے ترسیلی ذرائع مہیا کرنے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 نومبر 2016

مراد آباد میں آل انڈیا اردو کانفرنس

مراد آباد: اردو زبان، ادب اور تعلیم کے حوالے سے خود احتسابی پر زور دیتے ہوئے قومی اردو کونسل کے سربراہ

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو کو اپنے گھروں سے نکال کر اگر متعلقہ لسانی طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ حکومتیں اردو کو اردو والوں کو فروگذاشتوں کی سزا سے بچالیں گی تو یہ بات ہر لحاظ سے ناقابل تفہیم ہے۔ یہاں آل انڈیا اردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کی بقا کی بنیادی ذمہ داری اردو والوں پر عائد ہوتی ہے جس کی تکمیل میں معاونت کے لیے لسانی محاذ پر حکومت بہبودی اقدامات کی پابند ہے۔ کانفرنس کا اہتمام کل یہاں کونسل کے اشتراک سے ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ اردو اخبارات اور کتابوں کی خریداری کو اپنے اخراجات کا حصہ بنائیں تاکہ اخبارات نکالنے والوں اور کتابیں چھاپنے والوں کو اپنی اشاعتوں کی کھپت کا گلہ نہ رہے اور وہ اپنی بقا کے لیے سرکاری اشتہارات اور دوسری معاونتوں پر منحصر ہوکر نہ رہ جائیں۔ 'جدید خبر' کے مدیر معصوم مرادآبادی نے بھی حکومتوں سے زیادہ اردو والوں کو اردو کی زبوں حالی کا ذمہ دار گردانا اور کہا کہ یوپی میں اردو میڈیم اسکولوں کا فقدان ریاست میں اس محاذ پر اردو تحریک کے فقدان کا غماز ہے۔ اس کمی کو شکایات سے نہیں بلکہ فوری اور عملی اقدامات کے ذریعے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو خبر رساں ایجنسی 'یو این آئی' کی نمائندگی کرتے ہوئے عبدالسلام عاصم نے اردو بولنے، سوچنے اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لیے کانفرنس کے انعقاد اور اس میں مجمع بھیڑ کو اردو کے وجود رکھنے اور سلامت رہنے کا ثبوت بتاتے ہوئے کہا کہ اردو اگر تقسیم ہند کی ذمہ دار ہوتی تو آزادی کے بعد اسے اس ملک کی قومی زبانوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' کے مدیر ڈاکٹر خالد انور نے بھی کہا کہ حالات انتہائی مایوس کن نہیں۔ اردو کے ساتھ جو مسائل درپیش ہیں انھیں حل کرنے کے لیے مخلص لوگ عملاً سامنے آئیں تو بات بن سکتی ہے۔ روزنامہ 'میرا وطن' کے مدیر سراج نقوی نے اندیشوں پر امکانات کو ترجیح دینے کی وکالت کی اور اردو والوں پر زور دیا کہ وہ شکایت کرنے سے زیادہ فعال ہوکر اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے سرگرم ہوں۔ روزنامہ 'آگ' کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی نے اردو کے حق میں اپنے مجاہدانہ تجربہ سامعین سے شیئر کیا اور داد حاصل کی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اردو کو تحریک میں بدلنے پر زور دیا اور کہا سردست جہاں وہ میرٹھ میں سرگرم ہیں کل پورا ملک ان کا میدان عمل ہوگا۔ فاؤنڈیشن کے کنوینر مختار صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ صدارت امام شہر حکیم سید معصوم علی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 29 نومبر 2016

اردو زبان میں روزگار کے مواقع

نئی دہلی: معروف سماجی تنظیم پہل ورشتی (رجسٹرڈ) آزادپور اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے اشتراک سے غالب اکادمی، حضرت نظام الدین نئی دہلی میں 26 نومبر کو یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو میں روزگار کے مواقع' منعقد کیا گیا۔ سمینار کا آغاز کنوینر خالد رضا خاں کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ سمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے موجودہ عہد کو اردو کے لیے عہد زریں سے تعبیر کیا اور کہا کہ آج میڈیا اور صحافت میں اردو والوں کا بول بالا ہے۔ ہمیں محض اردو زبان تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ تینوں زبانوں کو جاننے والا کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ معروف ٹی وی صحافی انجم عثمانی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں اردو والے بڑی تعداد میں کام کررہے ہیں اور اب تو ہر پروگرام میں اردو شاعری کا استعمال عام ہوتا جارہا ہے، یہ اردو زبان کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف شاعر و ناقد پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ سمینار کے لیے یہ موضوع موجودہ عہد میں ضروری ہے۔ ہم ادب کے فروغ پر توجہ دے رہے ہیں لیکن زبان پر ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو زبان نے روزگار کے میدان میں اب مرکزیت حاصل کرلی ہے۔ اجلاس کی نظامت جے این یو کے استاذ ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ سمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ اس اجلاس میں اردو ترجمہ نگاری، فلموں میں روزگار، ٹی وی نیوز میں مواقع، ریڈیو اور اخبارات میں روزگار جیسے موضوعات پر مقالے پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں اوریس احمد خاں، سہیل احمد فاروقی، جاوید حسن اور ڈاکٹر افتخار زرناز شامل تھے۔ ڈی ڈی نیوز کے ڈائرکٹر اوریس احمد خان نے موجودہ دور میں اردو زبان کی اہمیت اور روزگار کے مواقع پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر شہزاد انجم نے بھی مقالوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں اس موضوع کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں روزگار کی کمی ہے۔ سمینار کا

دوسرا سیشن معروف صحافی بادل خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مظہر حسنین، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر شاہانہ مریم شان اور ایم سلیم علیگ نے مقالے پیش کیے۔ سرکاری نوکریوں، کال سینٹر اور اردو صحافت میں روزگار کی صورت حال پر مقالے پڑھے گئے۔ سیمینار کے کنوینر خالد رضا خاں کے شکریے پر سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 نومبر 2016

اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے لسانی اور تہذیبی رشتے

نئی دہلی: اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے لسانی اور تہذیبی رشتے کے عنوان سے سپورٹ سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک قومی سیمینار کا اہتمام مورخہ 13 نومبر کو کیا گیا جس میں زیادہ تر مقررین نے اردو اور دیگر زبانوں کے لسانی اور تہذیبی اشتراک و ارتباط کے تعلق سے پر مغز گفتگو کی اور اردو کی جامعیت ہمہ گیری اور جاذبیت پر روشنی ڈالی۔ قومی اردو کونسل کے اشتراک سے اس سیمینار کا انعقاد ابوالفضل انکلیو میں واقع ہوٹل ریورویو میں کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر ماہر لسانیات پروفیسر علی رفاد فتیحی نے اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی موجودہ صورت حال اور ان زبانوں کے مابین تہذیبی اتصال پر گفتگو کرتے ہوئے تکثیریت کو زبان اور کلچر کے لیے خطرہ بھی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ گلوبلائزیشن کے بڑھتے اثر کی وجہ سے زبانوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر غضنفر علی نے موضوع کی معنویت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ تناظر میں مختلف زبانوں کے ساتھ اردو زبان کے تہذیبی و لسانی اشتراک پر مکالمے کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو میں جذب و انجذاب کی قوت تمام دوسری زبانوں سے زیادہ ہے اور یہی اس کی وسعت اور ہمہ گیریت کی دلیل بھی ہے۔ خاص طور پر میتھلی، گجری، ڈوگری، مگھی، تیلگو، بھوجپوری زبانوں کے لسانی تہذیبی اشتراکات پر حوالوں کے ساتھ مقالے پیش کیے گئے اور یہ واضح کیا گیا کہ جہاں اردو نے ان زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں وہیں ان زبانوں پر بھی اردو کے اثرات مرتب ہوئے۔ مقالہ نگاروں نے اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ میں مماثلت، نحوی اور صرفی ساخت میں یکسانیت اور اردو زبان کی قوت انجذابیت پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے اسے مختلف لسانی تہذیبی سانچے اور بیانیے کا مظہر قرار دیا۔
سیمینار میں مقالہ پڑھنے والوں میں فائزہ الطاف، محمد عارف، لیاقت علی ناہید، ڈاکٹر شاہانہ مریم، ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر ابرار اجراوی، ڈاکٹر نبیل عارفی، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ، ڈاکٹر آصف، ڈاکٹر سید احمد قادری، جناب خورشید حیات، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر مشتاق وانی، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، جناب حقانی القاسمی اور ڈاکٹر ہاجرہ بانو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تمام مقالات بیش قیمت اور پر مغز ہیں۔ نظامت کے فرائض بحسن و خوبی خان رضوان نے انجام دیے اور سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر اجمل اخلاق صدیقی نے شکریے کی رسم ادا کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 نومبر 2016

اردو صحافت آزادی سے پہلے آزادی کے بعد

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے آرزو پرشکچھ کیندر گووند نگر کے زیر اہتمام 'اردو صحافت آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' عنوان سے یک روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے سابق میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کہا کہ ملک کو آزادی دلانے میں اردو صحافت نے اہم کردار نبھایا ہے۔ اردو صحافت کے ذریعے ایسا ماحول بنایا گیا جس سے لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوا لیکن آج اردو صحافت کا معیار گرتا جا رہا ہے جسے ہم کو اسی مقام پر پہنچانا ہے۔ صولت لائبریری رامپور کے چیئرمین سین شمین عالم نے کہا کہ اردو نے اہم کردار نبھایا ہے۔ ہمیں پرانی اردو صحافت سے سبق لے کر موجودہ دور میں بھی اسی پر کام کرنا چاہیے۔ اس ملک کو آزاد کرانے میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی نے اپنا تعاون دیا لیکن اردو صحافت کا بھی اس میں اہم رول رہا۔ ڈاکٹر ایم اے معروف، ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی، ڈاکٹر اسعد مسعود خاں، ڈاکٹر محمد ارشاد، سید آصف حسن، تسیم احمد کسمی نے اردو صحافت آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد عنوان پر مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے آخر میں کنوینر محمد جان ترکی نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 نومبر 2016

جوش ملیح آبادی... شخصیت اور فن

مدراس: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے مالی تعاون سے مدراس یونیورسٹی میں 'جوش ملیح آبادی.. شخصیت اور فن' پر دوروزہ قومی اردو سیمینار مورخہ 9 اور 10 نومبر 2016 کو منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں ہندوستان بھر سے تقریباً 40 مندوبین شریک رہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب فیض الرحمن سعید نے کی۔ جناب محمد شکیل اختر آئی پی ایس، ڈائرکٹر جنرل آف پولیس، تمل ناڈو بحیثیت مہمان خصوصی جلسہ میں شریک رہے۔ ڈاکٹر ستار ساحر، رجسٹرار، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونی ورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جبکہ جلسے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر امان اللہ صاحب نے بڑے خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ پروفیسر عبدالستار ساحر، رجسٹرار عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول نے اپنے کلیدی خطاب میں جوش ملیح آبادی کی شخصیت و فن کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے انہیں ایک مکمل شخصیت قرار دیا اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ اپنے دور ہی میں متنازعہ شخصیت بن چکے تھے، تاہم انھوں نے اپنے کلام اور تصانیف کے ذریعے ہندوپاک کے اردو شائقین کو صد درجہ متاثر کیا اور ان کی تصنیفات یقیناً ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موقع پر مدراس کے اعلیٰ پولیس افسر جناب محمد شکیل اختر آئی پی ایس نے اپنے خصوصی خطاب کے دوران کہا کہ جس طرح ماضی میں ادبا و شعرا نے اپنی شناخت کے ذریعے حکومت کے کان کھڑے کر دیے تھے، آج ہمیں بھی اپنے وجود کو منوانے کی ضرورت ہے، چنانچہ آج ہم کو چاہیے کہ ہم ایسے شاعر و فن کار پیدا کریں جو ادب میں حالات حاضرہ پر کھل کر بحث کر سکیں۔
افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کے پہلے سیشن کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، مدراس یونیورسٹی اور ڈاکٹر رفعت النساء، میسور یونیورسٹی نے اس نشست کی صدارت کی جس میں ڈاکٹر غوثیہ سعیدہ، مدراس، ڈاکٹر نکولن، کیرلا، شیخ فضل اللہ، ویلور، ڈاکٹر عرفانہ بیگم، کرنول نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسری نشست کی صدارت ڈاکٹر زاہدالحق، حیدرآباد اور پروفیسر حیات باشاہ، مدراس نے کی اور ڈاکٹر شکیلہ گوری خان، دھارواڑ، ڈاکٹر عبدالغفار، چتور، ڈاکٹر فتح اللہ بختیاری، حیدرآباد، ڈاکٹر حمیرہ تسنیم، نظام آباد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھی نشست کی صدارت پروفیسر سید سجاد حسین، مدراس اور ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری نے کی جس میں ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر امین اللہ، تروپتی، ڈاکٹر کے پی کلیم اللہ، آمبور، ڈاکٹر فاروق باشاہ، راپچوٹی نے اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔

مدراس یونیورسٹی میں 'جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

کلام حیدری کی خدمات پر سیمینار کا منظر

سیمینار کے دوسرے دن کی پہلی نشست کی صدارت پروفیسر سید سجاد حسین اور ڈاکٹر شکیلہ گوری خان نے کی اور ڈاکٹر ایم سعید الدین، اسلامیہ کالج، وانمباڑی، سیدہ ثمینہ بی، مدراس، عائشہ صدیقہ، تحسین ویا سمین (مدراس یونیورسٹی) اور پروفیسر غیاث احمد، نیو کالج، چنئی نے اپنے مقالے پیش کیے اور اس کے بعد آخری نشست میں ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، مدراس یونیورسٹی اور ڈاکٹر عطاء اللہ سنجیری، کیرلا نے صدارتی فرائض انجام دیے جس میں ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری، رایچوئی، پروفیسر نادرہ بیگم، وانمباڑی، پروفیسر انیسہ بیگم، وانمباڑی، پروفیسر تزئین جمال، وانمباڑی، پروفیسر فوزیہ حبیب، وانمباڑی، محمد سیفی، ابوبکر ابراہیم، شیخ نوراللہ نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت جناب فضل اللہ مکری صاحب نے فرمائی اور اس اجلاس میں ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے اپنے خصوصی خطاب میں دو روزہ قومی سمینار میں پیش کیے گئے مقالوں کا محاکمہ کرتے ہوئے کہا کہ جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی، شاعری اور ان کی تصانیف پر نہایت ہی عمیق مقالے پیش کیے گئے اور یہ پر مغز مقالے بہت جلد شائع ہو کر منظر عام پر آئیں گے تو قارئین کو جوش کی شخصیت اور شاعری کو از سر نو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ سیمینار جسٹس بشیر احمد سعید کالج فار ویمن، چنئی کے سیمینار ہال میں منعقد کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر ایم سعید الدین کے ہدیۂ تشکر کے ساتھ یہ دو روزہ قومی سیمینار نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر امان اللہ، شعبۂ عربک، پرشین اینڈ اردو، مدراس یونیورسٹی، چنئی، 15 نومبر 2016

کلام حیدری کی خدمات پر سیمینار

بہار: مہیلا سیوک سماج بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نئی دہلی کے تعاون سے یک روزہ سیمینار بہ عنوان کلام حیدری اور اردو افسانہ' کا انعقاد 8 نومبر 2016 بمقام کلب ہال نالندہ میں کیا گیا۔ مہیلا سیوک سماج کی سکریٹری محترمہ صبیحہ ناز نے سیمینار میں شامل مہمانوں کا استقبال کیا اور تنظیم کے مقاصد اور اردو کی ترویج و اشاعت پر تفصیلی گفتگو کی۔ کلیدی خطبہ میں ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کلام حیدری کا مجموعی تاثر پیش کیا۔ انھوں نے کلام حیدری کو عہد ساز افسانہ نگار قرار دیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر افصح ظفر نے ان کی ہمہ جہت شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ کلام حیدری کی نہ صرف بہار بلکہ ملکی سطح پر ان کی منفرد پہچان تھی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ انھوں نے نہ صرف افسانہ بلکہ اردو کی دیگر اصناف میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے میں کافی کوششیں کیں اور بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس موقعے پر انھیں یاد کرنا ہی خراج عقیدت کہا جائے گا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد دو تکنیکی سیشن کا اہتمام کیا گیا۔

پہلی نشست کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر تسلیم عارف نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شاہد رضا جمال، جناب احمد صغیر، محترمہ صدف اقبال کے نام قابل ذکر ہیں جبکہ دوسری نشست کی صدارت پروفیسر افصح ظفر اور نظامت ڈاکٹر شاہد رضا جمال نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر تسلیم عارف، ڈاکٹر احسان اللہ دانش، محمد سلیم علیگ اور انصاری محمد اطہر موجود تھے۔ اخیر میں کوآرڈی نیٹر محمد پرویز نے اظہار تشکر پیش کیے۔

پریس ریلیز صبیحہ ناز، نالندہ بہار، 8 نومبر 2016

سرسید احمد خاں حیات وخدمات

نئی دھلی: تعمیر ملت فاؤنڈیشن کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے نہرو ہاؤس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نئی دہلی کے مالی تعاون سے (سرسید احمد خاں حیات وخدمات) کے عنوان سے ریاستی سطح کا سمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کی اور نظامت فاؤنڈیشن کے صدر مرزا ذکی احمد بیگ نے کی۔ ڈائس کے معززین وصدر ئی ایم ایف مرزا ذکی احمد بیگ کا کہنا تھا کہ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی دانشمندی اور دوراندیشی دونوں کی ستائش ضروری ہے، جن کے توسط سے راجہ رام موہن رائے اور سرسید کے تعلیمی مشن کو ہندوستان میں آگے لے جانے کا کام جاری ہے۔ اس قسم کے سیمیناروں کے لیے جزوی مالی تعاون بغیر کسی امتیاز کے دینا ملک کی جمہوریت اور اس کے عوام کی اصل فلاح و بہبود کا کام ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ سرسید احمد خاں کے تعلیمی ادارے کا مقصد خالص مسلم قوم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کو زیور علم و ہنر سے آراستہ کرنا تھا۔ مہمان ذی وقار کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شہپر رسول نے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہیں جامعہ سے ہی پروفیسر شہزاد انجم نے بھی شرکت کی اور اظہار خیال کیا۔ صدر سیمینار معین الدین جینابڑے نے کہا کہ سرسید کے افکار ونظریات بھی مقالہ نگاروں نے بہت اچھے انداز میں پیش کیے۔ ضمنی سرخیوں کے عنوان بہت ہی عمدہ اور مناسب ہونے کے ساتھ سرسید کی پوری حیات وخدمات کا احاطہ کرتے ہیں۔ مقالہ نگاروں میں مولانا اسید الرحمٰن ندوی، ادیب وصحافی حبیب سیفی، آفتاب احمد منیری، جاوید عالم، ڈاکٹر عمر رضا، شمیم اختر، ڈاکٹر فریاد آزر، ڈاکٹر شبیر احمد صدیقی، تحسین منور، افتقار الزماں، ڈاکٹر نسل عارفی، حقانی القاسمی کے نام شامل ہیں۔ اظہار تشکر ڈاکٹر خطیب الرحمٰن نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2016

اردو صحافت اور آج کی ضرورت

میرٹھ: اردو صحافت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس مشاق صحافیوں کی نہایت کمی ہے۔ اس سے اردو صحافت کو یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ عصر حاضر کے مسائل سے متعلق موضوعات پر ان کے قلم لکھنے سے قاصر ہیں۔ ان خیالات کا اظہار روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' اور 'سہارا' کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے کیا جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک اور سوسائٹی فار سوشل اینڈ ویلفیئر کے زیر اہتمام شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں منعقدہ یک روزہ قومی سیمینار بعنوان اردو صحافت اور آج کی ضرورت، میں مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کر رہے تھے۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز مولانا نجم الدین نے تلاوت کلام پاک سے کیا، بعد ازاں مہمانوں کی گل پوشی کی گئی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا نے شمع افروزی کی، پروگرام میں صدارت کے فرائض صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ادا کیے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا نے شعبہ اردو کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ میڈیا کوئی بھی ہو، سچائی کو اجاگر کرتا رہے۔ سوسائٹی فار سوشل اینڈ ویلفیئر کے سکریٹری محمد محسن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ غور طلب ہے کہ پروگرام چار اجلاس پر مشتمل تھا جس میں شرکا نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 دسمبر 2016

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کے بغیر ملک کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی: وینکیا نائیڈو

حیدرآباد: مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات ایم وینکیا نائیڈو نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ملک کے مسلمان پکے ہندوستانی ہیں ان کی حب الوطنی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ وینکیا نائیڈو

نے شہر حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے اردو صحافیوں کے پانچ روزہ تربیتی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی آزادی کے وقت یہاں کے مسلمانوں کو ایک موقع دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ملک کا انتخاب کریں لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ مرکزی وزیر نے ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد نے ملک کی تقسیم کے وقت جو موقف اختیار کیا تھا اس پر انھیں برے حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہم تمام کی ذمے داری ہے کہ ہم جو پچھڑے افراد اقلیتوں میں ہیں ان کو اصل دھارے میں لاتے ہوئے انھیں بااختیار بنائیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان مادری زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ مادری زبان چاہے کوئی علاقائی زبان ہی کیوں نہ ہو اس کو پروان چڑھانے کے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ مرکزی وزیر نے مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور کہا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل نہ کرنا ہندوستانیت کے خلاف ہے۔ ہمیں تمام زبانیں سیکھنا چاہیے لیکن مادری زبان سے دوری اختیار نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مادری زبان سے دوری ایک سماجی مسئلہ بن سکتی ہے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کی تربیت کے مسئلے پر کہا کہ تربیت ہر شعبے میں ضروری ہے۔ صحافت کے اصولوں اور اقدار کو ہمیں برقرار رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ خبروں کے ساتھ ہمیں ہماری رائے کا اضافہ نہیں کرنا چاہیے اور صحافت پر بھروسہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بھروسہ اٹھ گیا تو یہ بہت بڑا دھوکہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں مٹھاس پائی جاتی ہے۔ اردو صحافت اور اردو اخبار نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اور ملک کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔ ملک کی آزادی اور جدوجہد آزادی میں اردو صحافت اور اس کے رول کے بغیر ملک کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا کہ ہم مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' کو فراموش نہیں کرسکتے جس سے ہندو۔مسلم اتحاد کے کاز میں اہم رول ادا کیا تھا اور ہندوستانی قومیت کے جامع نظریات کو اس اخبار نے فروغ دیا تھا۔ مولانا آزاد کا اس اخبار کی اشاعت کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کے لیے قومی جدوجہد کو پروان چڑھانا تھا اور یہ اخبار ہندو۔مسلم ہم آہنگی کا نقیب بھی رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نقیب، ہمدرد، ملاپ، قومی آواز، زمیندار جیسے اخبارات کو بھول نہیں سکتے۔ یہ ایسے نام ہیں جن کے ذریعے ہندوستانی نوجوانوں میں قومیت کے نظریات کو پروان چڑھایا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2016

اخترالایمان: بازیافت

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے دو روزہ کل ہند صدی سمینار 'اخترالایمان: بازیافت' کا افتتاح اکادمی کے

آڈیٹوریم میں ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ممتاز نقاد، دانشور، پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ بچپن کا اثر اخترالایمان کی شاعری پر نمایاں ہے۔ اخترالایمان نے وجود کی نوعیت اور وقت کی اہمیت کو سمجھا۔ ان کی تقریباً ہر نظم میں وقت کا تصور موجود ہے۔ آزاد نظم کی تعمیر وتشکیل میں اخترالایمان کا نام ہمیشہ لیا جائے گا۔ اپنے خصوصی خطبے میں پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ اخترالایمان کی شاعری انسانی زندگی کے تضادات کا کسی مرکزی حوالے سے ازالہ کے بغیر پیش کرتی ہے۔ انھوں نے انسان کی ازلی تنہائی کو ایک وسیع تر سماجی سیاق عطا کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ اخترالایمان نے اپنی شاعری کے اعلامیہ ہونے کی بات بار بار دہرائی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے پروگرام کے آغاز میں مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور سمینار کی غرض وغایت سے متعلق گفتگو کی۔ ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے رکن پروفیسر مولابخش نے افتتاحی اجلاس کے آخر میں اکادمی کی جانب سے تمام مہمانان، مقالہ نگار اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک اخترالایمان ایک اہم شاعر ہیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شائستہ یوسف، ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور ڈاکٹر رضا حیدر نے مقالے پیش کیے۔

اخترالایمان نے آزاد نظم کو اس کی معنویت اور فکری اہمیت سے الگ نہیں کیا۔ ان کی شاعری بھی دیگر شاعروں کی طرح اپنے گرد وپیش اور کچھ عالمی صورت حال اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت یا ردعمل کی شاعری ہے۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ کل ہند 'اخترالایمان: بازیافت' صدی سمینار کے

دوسرے دن پروفیسر محمد ذاکر نے اپنے مقالے میں کیا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ بغیر کسی لیبل کو چسپاں کیے ہوئے آج کے سیاق و سباق میں اختر الایمان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اختر الایمان ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی فیشن پرست ترقی پسندی کی جماعت سے الگ رہے۔ اس اجلاس میں اقبال مسعود، اجے مالوی اور وسیم بیگم نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ زندہ تخلیق وہی ہوتی ہے جو فنکار کے بغیر بھی زندہ رہتی ہے۔ اختر الایمان ایک زندہ فنکار ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر شہزاد انجم اور پروفیسر کوثر مظہری نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نظام صدیقی نے کہا کہ اختر الایمان نے اپنی قدر اول کی نوفکریاتی، اسلوبیاتی اور لسانیاتی سطح پر یکسر مجتہدانہ بڑی نظموں اپاہج گاڑی کا آدمی، کوزہ گر، عزم، نیا شہر، یادیں، ایک لڑکا وغیرہ میں اپنی منفرد فکر قائم رکھی۔ اس اجلاس میں پروفیسر مولا بخش، پروفیسر صاحب علی اور سیفی سرونجی نے مقالے پیش کیے۔

آخر میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تمام صدور، مقالہ نگار اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر مولا بخش نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28-27 نومبر 201

اردو عمل نفاذ

نوادہ: ضلع اردو زبان و ادب سیل نوادہ کی جانب سے اردو عمل نفاذ کے موضوع پر کلکٹریٹ کے میٹنگ ہال میں ایک عظیم الشان سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ سمپوزیم کی صدارت ڈپٹی کلکٹر صبغت اللہ نے کی۔ ضلع نوادہ اقلیتی فلاح و بہبود افسر راجیو رنجن اور ڈپٹی کلکٹر صبغت اللہ نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے پروگرام کا افتتاح کیا۔ نظامت کے فرائض ظہیر انور نے انجام دیے۔ پروگرام کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر شہر کی اہم شخصیات سمیت اردو سے وابستہ ملازمین اور دیگر لوگوں نے سمپوزیم میں کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مہمان خصوصی راجیو رنجن نے سمپوزیم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے نفاذ اس کی ترویج و ترقی میں ہم تمام لوگوں کو بلاتفریق حصہ لینا چاہیے۔ ضلع کے معروف سماجی و سیاسی رہنما پروفیسر الیاس حسین نے کہا کہ حکومت ارد کی جانب خصوصی توجہ دے۔ تمام تر حقائق کے باوجود حکومت اردو کے لیے خاطر خواہ کام نہیں کر پا رہی ہے۔ اردو بیداری کمیٹی نوادہ کے صدر صحافی قمر الباری نے کہا کہ اردو زبان مکمل طور پر ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2016

فلم 'عاشق وطن مولانا آزاد'

نئی دھلی: مجاہد آزادی اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے 128ویں یوم پیدائش کے

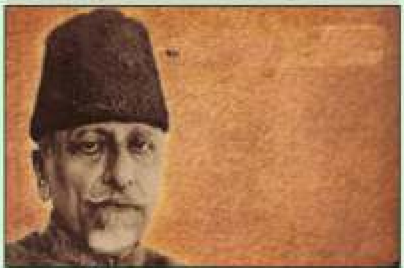

موقعے پر مسکان پروڈکشن اور اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس کے تعاون سے عالمی یوم تعلیم کے موقعے پر دو گھنٹے کی فلم 'عاشق وطن مولانا آزاد' کی نمائش کی گئی۔ اس موقعے پر معروف مورخ اور سابق مرکزی وزیر عارف محمد خان، ڈائرکٹر اور اداکار لولین تھذانی، فلم ریسرچر کرمن تھذانی، ایشین اکیڈمی آف فلم اینڈ ٹیلی ویژن کے ڈائرکٹر سندیپ مارواہ، ہندوستان میں رشین امبیسڈر الیکزینڈر ایم کداکن اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی بطور خاص موجود تھے۔ اس موقعے پر لولین تھذانی نے کہا کہ مولانا آزاد نے ملک کی آزادی کے لیے بہت سی قربانیاں دی جنھیں آج کی نسل نے فراموش کردیا ہے اور میں نے اس فلم میں کوشش ہے کہ ان کی قربانیوں کو بھلایا نہیں جائے۔ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور ان کا یقین تھا کہ ہندوستانی ثقافت یا ہندوستانی تہذیب کو مذہب کی بنیاد پر نہیں بانٹا جاسکتا ہے وہ ہندوستان کی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ عارف محمد خان نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اس فلم کو ہندوستان اور دیگر ممالک میں بھی کئی فلمی تقریب میں پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی دہلی بین الاقوامی فلم فیسٹویل 2016 میں یہ فلم سیمی فائنلسٹ اعلان کی گئی۔ سندیپ مارواہ نے کہا کہ لولین بہت محنتی خاتون ہیں اور انھوں نے آزادی کے کئی واقعات کو زندہ کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2016

اردو کے بہتر تلفظ کی وجہ سے عروج حاصل ہوا

ممبئی: مشہور و معروف گلوکارہ لتا منگیشکر نے کہا ہے کہ

بہتر اردو تلفظ ادا کرنے کی وجہ سے انھیں فلموں میں عروج حاصل ہوا ہے اور اس کے لیے کے ایل سہگل، نور جہاں اور موسیقار نوشاد علی کی سائیکی اور گفتگو کا بغور جائزہ لیتی تھی جس نے اردو زبان کو سمجھنے میں کافی مدد کی اور اچھا تلفظ ادا کرنا ممکن ہوسکا۔ ایک انٹرویو میں ہندی فلموں کی بزرگ گلوکارہ لتا منگیشکر نے جنھوں نے موسیقی میں 75 سال مکمل کرلیے، کہا کہ انھوں نے 5 سال کی عمر میں 1942 میں مراٹھی فلم پہلی منگلا گور میں پہلی مرتبہ نغمہ گایا اور اس طرح 75 سال ہوچکے ہیں۔ ان کے والد دینا تھ منگیشکر نے نغمے گانے کے لیے ان میں تحریک پیدا کی۔ منگیشکر نے کہا کہ ان کے گانے پر کے ایل سہگل کے گانے کی طرز کا کافی اثر ہے اور وہ سہگل کی موسیقی کی بڑی مداح ہیں اور بعد میں ان کے انداز میں گانے لگیں۔ سہگل صاحب جس طرح سے اردو تلفظ ادا کرتے ہیں، میں نے وہی انداز اپنانے کی کوشش کرتی تھی، میں نور جہاں کو بھی سنتی اور ان کے انداز کو پسند کرتی تھی لیکن میری یہ بھی کوشش رہی کہ کسی کی نقل نہ کروں اور اپنا اسٹائل اپناتی تھی۔ لتا منگیشکر نے اس موقعے پر ماسٹر غلام حیدر، مدن موہن، جے دیو اور نوشاد علی کو بھی یاد کیا اور اعتراف کیا کہ ان کا بھی کافی اثر رہا۔ نوشاد نے ہمیشہ اردو تلفظ پر توجہ دینے کی ہدایت کی اور ان سب نے مکمل مدد اور ساتھ دیا اور ان شخصیات سے بہت کچھ سیکھنے میں مدد ملی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 دسمبر 2016

اردو میڈیا میٹ آن روٹین امونائزیشن

نئی دھلی: یونیسیف اور پاور فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام دہلی میں ایک خصوصی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اقلیتی غلبہ والے علاقوں میں کس طرح صحت کے مسائل کو دور کرنے میں اردو میڈیا اپنا رول ادا کرسکتا ہے۔ مذاکرے میں 15 سے زائد اردو میڈیا کے سینئر اہلکاروں اور یونیسیف انڈیا کے ذمہ داران

نے شرکت کی۔ ساتھ ہی اقلیتوں میں معمول کی ٹیکہ کاری (آر آئی) کے لیے سازگار ماحول تیار کرنے کے لیے اردو میڈیا کو مزید حساس بنائے جانے پر بھی زور دیا گیا۔ مقررین نے کہا کہ ہندوستان اب پولیو سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن بچے اب بھی نامناسب ٹیکہ کاری کی وجہ سے ایسی بیماریوں کی زد میں ہیں، جن کا انسداد ٹیکہ کاری کے ذریعے ممکن ہے۔ ہندوستان میں عوامی جذبات و احساسات کی تشکیل، عوامی شرکت کو تحریک دینے اور سماجی و اقتصادی ترقی کے متعدد شعبوں میں بیداری لانے میں میڈیا کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے پاور فاؤنڈیشن کی بانی وڈائرکٹر محترمہ ثمینہ شفیق نے کہا کہ بیداری پیدا کرنے کے عمل میں مساوات پرمبنی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ہم نے فوری پیغام رسانی اور ٹیکہ کاری کے لیے اپنے پروگرام 'روبرو' کے تحت مقامی زبانوں کے اخبارات کے ساتھ گفت وشنید کو ایک نئی سمت دی ہے۔ اس سلسلے میں اردو میڈیا اپنی وسیع تر رسائی اور مقامی زبان سے رابطے کی وجہ سے اقلیتوں کے درمیان آر آئی سے متعلق بیداری پیدا کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ پاور فاؤنڈیشن پرعزم سوشل انٹر پرینرس کے ذریعے چلایا جانے والا ایک ایسا ادارہ ہے جو غریب بچوں، نوخیز لڑکیوں اور خواتین کے لیے خاص طور پر ہندوستان میں، زندگی بہتر بنانے کے وژن پر قائم ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 نومبر 2016

دهلی:

دورِ حاضر میں سرسید احمد خاں کے پیغامات کی معنویت

نئی دهلی: سرسید اسٹڈی سینٹر کے زیر اہتمام انڈیا

اسلامک سینٹر کے سبزہ زار لان میں 'دورِ حاضر میں سرسید احمد خان کے پیغامات کی معنویت' کے عنوان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر سپریم کورٹ کے جج جسٹس جوزف کورین جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر دہلی ہائی کورٹ کے جج جسٹس بدر دریز احمد اور جسٹس جینت ناتھ تھے جبکہ نظامت کے فرائض ایڈووکیٹ فوزیہ نے انجام دیے۔ اس موقعے پر سپریم کورٹ جسٹس جوزف کورین نے کہا کہ سرسید احمد خان نے ملک کی پریشانیوں کو سمجھا اور ایسے وقت میں جب لوگ سائنس کو نہیں جانتے تھے تب وہ سائنس کو ہند کی سرزمین پر لے کر آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو صرف مسلمانوں کی ہی نہیں تمام مذاہب کے لوگوں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں ہندنواز اور سیکولرزم کے علم بردار ہونے کے باوجود ایک سچے مسلمان تھے۔ سرسید نے ایک مذہب کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام قوموں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے بیدار کیا۔ جسٹس جینت ناتھ نے کہا کہ سرسید اپنے آپ میں ایک سچے لیڈر، ٹیچر، رہبر اور سربراہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو سے ہندوستان کی نامور سیاسی، سماجی شخصیات نے تعلیم حاصل کی ان میں سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریہ جسٹس ایم ہدایت اللہ اور موجودہ نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری جیسی اہم شخصیات شامل ہیں۔ سپریم کورٹ کے جسٹس بی ڈی احمد نے سرسید احمد خان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اے ایم یو میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن میرے خاندان کے دیگر لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو صرف مسلمانوں کی پہچان نہیں بلکہ انڈین سوسائٹی کی پہچان ہے۔ آج سرسید کی لگائی ہوئی شاخ سے تعلیم حاصل کیے لوگ پوری دنیا کے اہم مقامات پر ڈنکا بجا رہے ہیں۔ اختتام پر ایڈوکیٹ این اے خان نے اظہار تشکر کے فرائض انجام دیے جبکہ ہمدرد لیبارٹریز کے ڈائرکٹر حامد احمد، معروف صحافی عارفہ خانم، ندیم اسرار احمد سمیت دیگر لوگوں نے اپنے خطاب میں سرسید احمد خان کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ سرسید ایسا تابناک نام ہے جو رہتی دنیا میں یاد رکھا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 نومبر 2016

پروفیسر یوٹا کا اسادا کا خطبہ

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر یوٹا کا اسادا کے ایک خصوصی خطبے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رخشندہ جلیل بھی موجود تھیں۔ پروفیسر یوٹا کا اسادا نے اپنی گفتگو میں کہا کہ جاپان کے ممتاز ہائیکو شاعر 'سنتوکا' کی زندگی اور اس کی شاعری میں فلسفہ، سماجی عنصر کے علاوہ ایک انقلابی رنگ بھی موجود تھا جس نے اپنے عہد کو اپنی شاعری سے کافی متاثر کیا۔ پروفیسر یوٹا کا اسادا نے سنتوکا کے شعری اسلوب پر بھی روشنی ڈالی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر اسادا کی تقریر کو سن کر ہمیں اس بات کی مسرت ہوئی کہ آپ نے ایک ایسے شاعر کا تعارف کرایا جس سے ہم بھی ناواقف تھے۔ ہم نے آج کی گفتگو سے نہ صرف سنتوکا کی زندگی اور شاعری کو سمجھا بلکہ جاپان کی تہذیب و ثقافت کو ہمیں مزید سمجھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اپنی گفتگو میں پروفیسر یوٹا کا اسادا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ آپ کا مسلسل ہندوستان کا علمی سفر ہوتا رہتا ہے اور ہم بھی آپ کی تحریروں اور تقریروں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے پروفیسر یوٹا کا اسادا کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ نے جاپان میں اردو زبان و ادب کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور کئی اہم افسانہ نگاروں کے افسانے کو آپ نے جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ کا مشہور ڈرامہ 'ہیروشیما کی کہانی' کو ہندوستان میں کافی پسند کیا گیا اور ہندوستان میں کئی مرتبہ یہ ڈراما اسٹیج بھی کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2016

اتر پردیش:

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کی اہمیت

لکھنؤ: اردو کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس زبان نے سنسکرت، ہندی اور دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ اپنے اندر سمو لیے ہیں جس کی وجہ سے اس زبان کا ذخیرہ الفاظ بھی بڑھا ہے اور اس کے حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اپنے اس اچھے طریقہ کار سے اردو زبان نے قومی یکجہتی کے ماحول کو بنانے میں ملک میں بے پناہ خدمات انجام دیں، اس لیے یہ ثابت ہوگیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مشکور حبیب ندوی نمائندہ بلاک پرکھ (جرول) نے سید حاجی وارث علی شاہ اسمارک سیوا سنستھان، جرول اور اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ یک روزہ سمینار 'قومی یکجہتی

کے فروغ میں اردو زبان کی اہمیت' موضوع کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی ضیاء اللہ صدیقی ندوی نے قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کے کردار پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ دور میں لفظ 'رواداری' کا بڑا چرچا ہے۔ درحقیقت یہ لفظ ہماری مشترکہ تہذیب اور اردو زبان کی دین ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان کی پیدائش اور اس کی تشکیل میں ہندوستانی طبقے کے ہر مذہب، ہر علاقے کے لوگوں کی کوششیں شامل رہی ہیں۔ سوسائٹی کی روح رواں اور سیمینار کی کنوینر عظمیٰ خاتون نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کو تفصیل سے بیان کیا۔ سیمینار کے مقالہ نگاروں میں محمد راشد خاں، ڈاکٹر نثار احمد، عبداللہ، حاجی محمد عقیل، محمد عامر ندوی، نور محمدی، سجا گئی مشرا شامل تھیں۔ نور محمدی اسسٹنٹ کنوینر نے شرکا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 نومبر 2016

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شاعری و ادبی خدمات

لکھنؤ: اثر لکھنوی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے قد آور شاعر تھے، اثر دبستان لکھنؤ کی شاعری میں نمائندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی شاعری گرچہ کلاسیکل شاعری ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ان کا لہجہ سب سے منفرد تھا اور انھوں نے دبستان لکھنؤ سے لے کر دبستان کشمیر تک شعری فضا معطر ومنور کردی۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر آصف زمانی نے ووکیشنل انڈسٹریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور اترپردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام گومتی نگر واقع، ہندی میڈیا سینٹر کے آڈیٹوریم میں منعقد 'مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شاعری و ادبی خدمات' کے عنوان پر منعقد ایک سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سابق ڈی جی پی اترپردیش رضوان احمد نے کہا کہ اثر لکھنوی کم سنی سے ہی شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے اور بعد میں عزیز لکھنوی کی شاگردی نے آپ کے شاعرانہ شوق وفن کو بام عروج تک پہنچایا اور بعد میں نہ صرف لکھنؤ بلکہ پوری دنیا میں اپنے استاد کے دیے ہوئے تخلص اثر سے مشہور ہوئے۔ سیمینار کی نظامت سوسائٹی کے سکریٹری عبدالنعیم قریشی نے کی اور اپنی سوسائٹی کے اغراض ومقاصد اور مستقبل اور مستقبل میں اپنے عزائم کے بارے میں تفصیل سے مہمانوں کو متعارف کرایا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نعمان اعظمی، پروفیسر کے کے رستوگی، انیس الرحمٰن صدیقی، چودھری سلمان قادر نے بھی خطاب کیا اور اپنے قیمتی کلمات سے اثر لکھنوی کو سچی خراج عقیدت پیش کی۔ اس اجلاس میں کئی اہم مقالے پیش کیے گئے جن میں صحافی ضیاء اللہ صدیقی ندوی، ڈاکٹر مسیح الدین، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، عقیل احمد فاروقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 نومبر 2016

ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت اور فن

اعظم گڑھ: اپنی نثر اور شاعری کے علاوہ اردو تحریک

سے وابستگی کے لیے بھی ملک زادہ منظور احمد ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جوتگ ودو کی اور جس طرح جاں فشانیوں سے کام لیا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے فاطمہ گرلز کالج داؤد پور اعظم گڑھ میں 'ملک زادہ منظور احمد شخصیت اور فن' کے موضوع پر بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ کے دوران کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے فرمائی جبکہ افتتاح خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود نے کیا۔ مہمانوں کا استقبال کالج کے سکریٹری اور سیمینار کے چیئرمین ڈاکٹر نیاز احمد داؤدی نے کیا۔ اس موقعے پر سیمینار کے مقالوں پر مشتمل کتاب 'ملک زادہ منظور احمد: شخصیت اور فن' کی رسم رونمائی کی گئی، جسے ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی نے مرتب کیا ہے۔ کالج کی طالبات نے منظوم خیر مقدم پیش کیا جبکہ افتتاحی اجلاس کا اختتام کالج کے ترانے پر ہوا۔ اس موقعے پر نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی نے شکریے کے کلمات ادا کیے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کلیدی خطبہ کے دوران کہا کہ ملک زادہ نثر کی طرح شاعری میں بھی منفرد طرز اظہار کے مالک ہیں۔ وہ غزل کی مانوس لفظیات اور رموز وعلائم کے ذریعے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس سے قبل بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر خان مسعود نے کہا کہ ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت بڑی متنوع تھی۔ ان کے کارناموں پر گفتگو کئی زاویوں سے کی جاسکتی ہے اور ہر زاویہ ان کے فضل وکمال کے نئے باب کھولتا جائے گا۔ افتتاحی اجلاس کے علاوہ مقالہ خوانی کے کئی اجلاس ہوئے جس میں مقالہ نگاروں نے ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 نومبر 2016

موجودہ وقت میں اقبال کی مطابقت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے زیر اہتمام 'موجودہ وقت میں اقبال کی مطابقت' کے موضوع پر منعقد جلسے سے خطاب کرتے ہوئے شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر لطیف حسین ایس کاظمی نے کہا کہ اقبال مشرق کے عظیم شاعر اور فلسفی تھے، موجودہ وقت میں جن کے وژن اور مشن اور فن اور فکر پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کا پیغام عالمگیر ہے کیونکہ وہ سماج میں امن، ہم آہنگی، آزادی اور انصاف کے بانی تھے۔ پروفیسر کاظمی نے کہا کہ اقبال نے انسانیت کو ذات، رنگ، عقیدہ، قوم اور جغرافیائی حدود کی بنا پر تقسیم کرنے کے بجائے مکمل شکل میں پیش کیا۔ شاعر اقبال نے اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بتایا جو کہ امن، خوش حالی اور ترقی حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔ پروفیسر ثناء اللہ میر نے کہا کہ اقبال اول درجے کی انسانی نقطہ نظر کے حامی تھے۔ ڈاکٹر حیات عامر نے کہا کہ فلسفہ کی بنیاد انسان کی آزادی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ایک ایسی تہذیب کو جگانا چاہتے تھے جو کہ بربادی کی کگار پر تھی۔ انگریزی شعبہ کی پروفیسر سمینہ خان نے نکولسن کے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اقبال اپنے وقت سے کہیں زیادہ آگے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ایک ایسے مصنف تھے جو کہ انسانی اقدار پر یقین رکھتے تھے۔ پروفیسر جلال الحق نے اپنے صدارتی خطبے میں علامہ اقبال کے وژن اور مشن کا تجزیہ پیش کیا۔

نظامت کے فرائض شعبۂ فلسفہ کی ریسرچ اسکالر وحیدہ بانو نے انجام دیے جبکہ ضوفیہ نگار نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 21 نومبر 2016

جشن اردو

وارانسی: شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو بی ٹی سی ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن ضلع وارانسی کی جانب سے 'جشن اردو' کا اہتمام

میدا گن میں واقع پراڑکر اسرتی بھون میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی بی ایچ یو کے پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی صاحب نے کہا کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ اور باشعور قوموں کی اپنی زبان ہوتی ہے جس سے اردو کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ اردو جیسی ترقی یافتہ وشیریں زبان ہماری زبان ہے۔ یہ محض ایک زبان نہیں بلکہ ہماری تہذیب وثقافت اور امور کی محافظ و امین ہے۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی ضلع وارانسی کے بی ایس اے جناب جے کرن یادو نے کہا کہ تعلیم حاصل کرنا ہر انسان کے لیے لازمی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ ہی دیش اور قوم کی ترقی کے ستون ہوتے ہیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں مفتی بنارس مولانا عبدالباطن نعمانی صاحب نے فرمایا کہ ہمارے دینی وملی اثاثے اسی اردو کی بدولت محفوظ ہیں۔ لہٰذا اردو کی ترقی، چلن اور روزمرے سے وابستگی میں ہماری جملہ ہائے ترقیات کا راز پوشیدہ ہے۔ اردو کو زندہ رکھنے میں مدارس کا بڑا اہم رول ہے۔ اس کے علاوہ عشرت عثمانی وخلیق الزماں نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مولانا عبدالباطن نعمانی، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، حاجی عبدالصمد انصاری، جے کرن یادو، ماسٹر فہیم احمد وعشرت عثمانی صاحبان کو ان کی دینی، علمی وسماجی خدمات کے لیے 'علامہ اقبال ایوارڈ 2016' سے نوازا گیا۔ چند اردو اساتذہ کو بھی ان کی عمدہ کارکردگی کے لیے بی ایس اے کے ہاتھوں اعزاز دیا گیا۔ پروگرام کی نظامت عبدالرحمٰن مظہری نے بحسن خوبی انجام دیا۔ استقبالیہ کلمات نوشاد امان انصاری نے وشکریہ تنظیم کے صدر ڈاکٹر احتشام الحق نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: عبدالرحمٰن، اردو بی ٹی سی ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن، بنارس، 7 دسمبر 2016

بہار:

مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی میں دوروزہ عالمی سمینار

پٹنہ: مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کے

زیر اہتمام دوروزہ بین الاقوامی سمینار ومشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کا افتتاح بہار کے گورنر رام ناتھ گووند نے اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں کیا، اس موقعے پر انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ عربی فارسی اور اردو کے درمیان اسلوب اور متن دونوں ہی سطحوں پر آدان پردان کا سلسلہ بہت قدیم ہے، اس کے نتیجے میں خاص طور پر اردو ادب ہندوستان کی مشترکہ وراثت کا بہترین آئینہ ہے، سمینار کے منتظم اور مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ مشترکہ وراثت کو لفظوں سے زیادہ جذبوں میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی زبان کو شامل کرلیں تو وسط ایشیا کی وہ تمام روایتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں جو اپنے آپ میں ایک نمائندہ کلچر پیش کرتی ہیں۔ دوسرے دن کے سمینار کا انعقاد بہار اردو اکادمی کے کانفرنس ہال میں ہوا جس میں ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے مقالہ نگاروں اور مہمانوں نے شرکت اور اہم ترین مقالات پیش کیے گئے۔ دوسرے روز کے پہلے سیشن میں سات اور دوسرے سیشن میں آٹھ مقالے پڑھے گئے، پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کی اور دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے، موضوع کا تعارف ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے پیش کیا۔ مقالہ نگاروں میں ثاقب ہارونی نیپال، افروز عالم کویت، سعید روشن کویت، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر اسرائیل رضا، صفدر امام قادری، مولانا شکیل قاسمی، مولانا شمیم منعمی، مولانا سرور عالم ندوی، ڈاکٹر انعام ظفر، نورالسلام ندوی، ڈاکٹر صوفیہ پروین، محمد منہاج الدین، ڈاکٹر اختر حسین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اعجاز عالم نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی 4 دسمبر 2016

بہار میں دانشوری کی روایت کے موضوع پر خدابخش میموریل لکچر

پٹنہ: خدابخش لائبریری کتابوں کا تاج محل ہے اور اس لائبریری کے بانی خدابخش خاں کتابوں کی دنیا کے شاہجہاں تھے۔ تاج محل اگر تعمیری دنیا کا عجوبہ ہے تو خدابخش لائبریری کتابی دنیا کا عجائب خانہ ہے۔ مذہب، علم، سیاست، معیشت، حکومت اور تہذیب وتمدن کے ہر مظاہرے میں بہار کی عظمتیں زمانہ قدیم سے ہی قائم ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کیا۔ وہ ہفتہ کو خدابخش لائبریری میں 'بہار میں مسلم دانشوری کے کچھ اہم اساطین' کے موضوع پر خدابخش میموریل لکچر دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بہار میں دانشوروں کی طویل روایت ہے جس کا احاطہ مشکل ہے۔ بہار مردم خیز خطہ ہے جہاں مسلم دانشوری کی روایت یک رخی نہیں ہے بلکہ بڑی پہلودار ہے۔ مذہبی فکر اور شعر وسخن کے علاوہ علم وتحقیق، زبان وادب، کے ہر پہلو پر دانشوروں نے داد تحقیق دی ہے۔ اس کے علاوہ ادارہ سازی اور انتظامی معاملات میں بھی بہار کے علما کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کو وہ جوہر بھی اسی سرزمین سے حاصل ہوا جس نے ان کو بابائے قوم کے مقام تک پہنچایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2016

کلا بھون میں اردو ورکشاپ کا انعقاد

پورنیہ: کلا بھون ہال میں ریاستی حکومت کی جانب سے اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ضلع اردو ورکشاپ

انجمن ترقی اردو گوپال گنج میں اردو کانفرنس کا منظر

کا انعقاد کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مولانا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ موجودہ وقت میں اردو زبان کی حالت خستہ ہوگئی ہے، اس لیے ادبی زبان اردو کو روزگار سے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ مولانا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ اردو زبان ریاست کی دوسری زبان ہے اس کے باوجود بیشتر سرکاری مقامات پر اردو زبان کو جگہ نہیں مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خود اہل زبان میں اردو پڑھنے والوں کی کافی کمی ہوگئی ہے جس کو پر کرنا اشد ضروری ہے۔ اردو ورکشاپ کا افتتاح آر ڈی ڈی، ایس ڈی ایم نے مشترکہ طور پر کیا۔ اردو کے فروغ اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے پورنیہ صدر اور اس کے تمام بلاکوں میں اردو ملازمین کو اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ذمہ داریاں دی گئیں اور آئندہ کے لیے پروگرام بھی مرتب کیے گئے۔ ورکشاپ میں دارالعلوم خلفائے راشدین کے پرنسپل مفتی نعیم الدین ندوی، مدرسہ انجمن اسلامیہ خزانچی ہاٹ کے پرنسپل مولانا عبدالقیوم ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، محمد عالمگیر، مولانا محبوب الٰہی کے علاوہ دیگر لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 نومبر 2016

انجمن ترقی اردو گوپال گنج میں اردو کانفرنس

پٹنہ: انجمن ترقی اردو گوپال گنج کے زیر اہتمام 20 نومبر 2016 کو ایم ایم میموریل اردو ہائی اسکول گوپال گنج کے احاطے میں اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو کے زمینی مسائل اور ان کے حل پر گفتگو ہوئی۔ سیمینار کی صدارت اظہار الحق صدیقی، صدر انجمن ترقی اردو بہار نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر عبدالقیوم انصاری، سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار اور ظفر احمد غنی، نائب صدر انجمن ترقی اردو بہار موجود تھے۔ نظامت کے فرائض جناب معراج الدین تشنہ، صدر انجمن ترقی اردو گوپال گنج نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار نے اپنے خطاب میں کہا کہ بہار میں اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن قانون اردو کا عملی نفاذ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے لیے اردو والوں کو بھی کوشش کرنی ہوگی۔ صرف سرکاری یا حکومت پر بھروسہ کر کے اچھے نتیجے کی امید نہیں کرنی چاہیے۔ لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں اردو کا استعمال کریں۔ شادی بیاہ کے کارڈ، گھروں کے باہر نام، سرکاری دفاتر میں خط وکتابت کے کام اردو میں کریں۔ اردو اخبارات اور رسائل کو خرید کر پڑھیں۔ معراج الدین تشنہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ملک کی زبان ہے۔ جناب اظہار الحق صدیقی نے اپنے صدارتی خطبے میں آئے ہوئے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 نومبر 2016

ایک شام ظفیر الدین ضیا کے نام

جہان آباد: ہندی اور اردو نہ صرف جڑواں بہنیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ دونوں زبان کے زیادہ تر الفاظ ایک جیسے اور ہم معنی ہیں۔ یہ باتیں ریاستی وزیر قانون کرشن نندن ورما نے معروف شاعر ظفیر الدین ضیا کے دوسرے یوم وفات کے موقعے پر ہوٹل راج دربار میں منعقد ثقافتی پروگرام 'ایک شام ظفیر الدین ضیا کے نام' کا افتتاح کرتے ہوئے کہیں۔ شعری مجلس کا باضابطہ آغاز ہونے سے قبل شہر جہان آباد کے عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے مرحوم ظفیر الدین ضیا کی تصویر پر گلپوشی کی گئی۔ بعد ازاں ان کی حیات وخدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ہندو مسلم دوستی کا علمبردار اور مضبوط ستون قرار دیتے ہوئے ان کی موت کو ضلع کے لیے ایک عظیم خسارہ بتایا گیا۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو کے ریاستی سکریٹری عبدالقیوم انصاری نے اپنے خطاب میں زبان اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے ہندوستان کی زبان بتایا اور کہا کہ زبان اردو کی یہیں پیدائش ہوئی، یہ زبان یہیں پروان چڑھی اور اس کی یہیں پرورش ہوئی۔ شعری محفل کے آغاز سے قبل زبان اردو کے مشہور شاعر لطیف شمسی اور وصی احمد کو ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں وزیر موصوف کے ہاتھوں ظفیر الدین ضیا ایوارڈ سونپا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2016

اردو ملازمین کے لیے ورکشاپ

ارریہ: اردو سہل زبان نہیں ہے۔ اردو آتے آتے آتی ہے۔ اردو کوئی معمولی زبان نہیں ہے۔ ادب میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ اردو زبان نے ادب میں مقام حاصل کیا ہے، بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں تمام مطبوعہ کتب دستیاب ہیں، مگر اس کا کوئی پڑھنے والا نہیں ہے۔ یہ باتیں اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیر اہتمام ضلعی سطح پر اردو ملازمین کے لیے منعقدہ ورکشاپ کے دوران تعلیمی افسر ڈاکٹر فیاض الرحمٰن نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئی نسل تک اردو کی رسائی ہو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے اہل اردو کو مجاہدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ اردو مترجم خالد حسین نے استقبالیہ خطاب کرتے ہوئے ورکشاپ کی غرض وغایت بیان کی۔ اس موقعے پر مائنارٹی ویلفیئر افسر رضوان احمد نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے اردو ڈائریکٹوریٹ کا ضلع سطحی ورکشاپ قابل ستائش کام ہے۔ انھوں نے مخلصانہ کوشش پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا پروگرام تبھی بامعنی ثابت ہوگا جب ہم زبان کے تحفظ کے لیے ہر طرح کا تعاون دیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2016

تلنگانہ

ڈرامہ 'دادی اماں مان بھی جاؤ'

حیدرآباد: "ڈرامے سے میری طویل وابستگی رہی ہے اور میں نے عظیم اداکاروں اور فنکاروں کو اپنی اداکاری کا جوہر دکھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ بچوں کے ڈراموں کا اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک میں نے

بذات خود مشاہدہ کیا ہے، یہ بات کہتے ہوئے مجھے بے حد فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے نہ تو آج تک اتنا اچھا تلفظ دیکھا اور نہ ہی ایسی بے تکلفانہ برجستگی جس کا مظاہرہ آج ان چھوٹے بچوں نے کیا ہے۔ ان ننھے اداکاروں نے بغیر نروس ہوئے جس طرح کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ڈرامے کو سنبھالا وہ ناقابل یقین تھا۔ یہ میری زندگی کا بہترین تجربہ بھی تھا۔ انیس اعظمی ڈرامے کے میدان کی

معروف شخصیت ہیں اور یہ نہایت خوش آئند امر ہے کہ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے ہیں اور مختلف علمی اور ثقافتی پروگراموں کے ذریعے کیمپس میں ان کی موجودگی نظر بھی آرہی ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز نقاد، دانشور، ڈراما نگار اور صدر غالب اکادمی دہلی، پروفیسر ایمرٹس جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی شمیم حنفی نے یونیورسٹی کے اوپن ایئر تھیٹر میں یوم آزاد تقاریب 2016 کے موقعے پر منعقدہ بچوں کے ڈرامے 'دادی اماں مان بھی جاؤ' کی پیش کش کے بعد بحیثیت مہمان خصوصی کیا۔ ابتدا میں چھ بچے زید فیروز، سید محمد مشرف، شیخ محمد راحیل، ابوذر فیروز، شیخ محمد ریحان اور تیشا پالگری راوی کی شکل میں اسٹیج پر آئے اور انھوں نے بہت دلچسپ انداز میں سامعین کو ڈرامے کے کرداروں اور اس کے موضوع سے متعارف کرایا۔ بعد ازاں ڈرامے کا آغاز ہوا۔ اس میں راحت، فیروز نے دادی اماں، فضا فردوس نے اماں، عائکہ خان نے پھوپھی، اے منوسل نے کام والی بائی، مریم شادان نے روبینہ، زویا احمد نے ثمینہ، استوتی میہا نے فہمیدہ اور تیشا نے ننھی لڑکی کا کردار موثر انداز میں ادا کیا۔ ڈرامے کے اختتام پر انیس اعظمی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 8 نومبر 2016

راجستھان

ہندوستانی زبانوں کا ادب اور معاشرہ

اودے پور: مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ربطِ باہمی بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ربط کی بدولت ایک دوسرے کی زبانوں میں

لکھے جانے والے ادب سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر فاروق بخشی نے اودے پور یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ 'ہندوستانی زبانوں کا ادب اور معاشرہ' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے لیکن اکثر یہ آئینہ بھی اپنے عہد کے ادبا کے سامنے کچھ مطالبے رکھتا ہے جس پر کھرا اترنا شعرا اور ادبا کے فرائض منصبی میں شامل ہوتا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل ہے۔ ادب وہی زندہ رہے گا جو اپنے عہد کے دھڑکنوں کی نمائندگی کرے گا۔ جلسے کے مہمان خصوصی ڈی اے وی یونیورسٹی جالندھر کے شعبہ ماس کمیونیکشن کے ڈائریکٹر پروفیسر کے کے رتو نے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ معاصر ہندوستانی زبانوں کا بیشتر ادب بدلتی ہوئی سماجی قدروں کی عکاسی کر رہا ہے لیکن کئی زبانوں میں ادب کے نام پر شور شرابہ زیادہ ہو رہا ہے جبکہ اڑیا، اردو، مراٹھی اور کنڑ کے ادیب اپنے معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ہندی کے معروف گیت کار جناب کشن دادھیچ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بازار کی طاقتوں نے معاشرے کی چال ڈھال بدل ڈالی ہے۔ اس لیے ادب بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ شعبۂ اردو کے ڈاکٹر حدیث انصاری نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی اسکالر شہناز یوسف نے ادا کیے۔ اسکالر شیبا حیدر اور شمع خان نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: فاروق بخشی، اودے پور، 1 نومبر 2016

کرناٹک

جشنِ یومِ اردو

ھبلی: مدنی میاں ایجوکیشن اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کی

جانب سے ہبلی میں گذشتہ کئی سالوں سے مدنی میاں کمپیوٹر سنٹر اپنی خدمت انجام دے رہا۔ جہاں ڈپلومہ ان کمپیوٹر کے ساتھ اردو ڈپلومہ کورس کا بھی انتظام ہے۔ اسی مناسبت سے 9 نومبر 2016 کو شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کی یوم پیدائش کے موقع پر مدنی میاں کمپیوٹر سنٹر ہبلی میں جشن یوم اردو منایا گیا۔ تقریب کا آغاز حمد و نعت سے ہوا۔ اس کے بعد اقبال کا ترانہ ہندی 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' پیش کیا گیا۔ سنٹر کے طلبہ و طالبات نے مختلف عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ تبسم نرگند نے علامہ اقبال کی سوانح حیات بیان کیا، نور افشاں سید نے علامہ اقبال کے اقوال زریں اور ان کے چند مخصوص اشعار کا مفہوم بتایا، غزالہ شیخ نے موبائل فون میں اردو کا استعمال اس عنوان پر مقالہ سنایا، محبوب بی پٹھان نے اردو کی ابتدائی تعلیم اس عنوان پر گفتگو کی، روشن ایم پی نے کیرلا میں اردو زبان کا آغاز کب اور کیسے؟ اس عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد محترمہ نور جہاں رگتی نے مہمان خصوصی کا تعارف کروایا اور محترمہ شمیم گوکلوپ نے مہمان خصوصی کو گلدستہ و تحفہ پیش کیا۔

مہمان خصوصی محترمہ ریشمہ سلطانہ حسینی صدر شعبہ اردو نہرو کالج ہبلی نے علامہ اقبال کے نظریات و تصورات پر روشنی ڈالی اور اردو زبان کی اہمیت و خصوصیت کے بارے میں بتایا۔ محترمہ نے فرمایا کہ اردو بہت ہی شیریں زبان ہے، اردو ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور ہماری زبان اردو بھی ہندوستانی ہے۔ اب اردو صرف ملکی زبان نہیں بلکہ عالمی زبان بن چکی ہے۔ آخر میں سہیل درزی نے سب کا شکریہ ادا کیا جب کہ نظامت کی ذمہ داری اجمل رضا شیخ نے نبھائی۔ تقریب میں سنٹر سوپروائزر فاروق سر گوکلوپ، شعیب سر اور حنا کوثر بھی موجود تھے۔

رپورٹ: مدنی میاں کمپیوٹر سنٹر ہبلی، 16 نومبر 2016

اعزاز و اکرام

پروفیسر دانش اقبال

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر دانش اقبال کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے موضوع پر ان کی بہترین ڈاکیومینٹری کو مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ایم وینکیا نائیڈو نے یہاں مانک شا آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک تقریب میں 'لاساکول ایوارڈ' سے نوازا۔ اس موقعے پر وزارت اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت راج وردھن سنگھ راٹھور نے پروفیسر دانش اقبال کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک سپاس نامہ بھی ان کو تفویض کیا۔ اس تقریب میں پرسار بھارتی کے صدر نشین اے سوریہ پرکاش، پرسار بھارتی کے سربراہ سریش چندر پنڈا کے ہمراہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل فیاض شہریار بھی موجود تھے۔ پروفیسر دانش اقبال ایک سرکردہ ڈرامہ نگار ہیں جن کو اس سے قبل بھی نو مرتبہ مختلف ڈراموں اور ڈاکیومنٹریز کے لیے قومی اعزازات سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ مرحوم لاساکول پرامن کشمیر میں ریڈیو کے سربراہ ہوا کرتے تھے جنھیں وادی کشمیر میں پرتشدد واقعات کے ابتدائی دور میں بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کے قتل کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر مشیر الحق سمیت بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بعد میں حکومت ہند کی جانب سے مرحوم لاساکول کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ایک سالانہ اعزاز کا اعلان کیا گیا۔ پروفیسر دانش اقبال کو ریڈیو کشمیر کے ایک پروگرام کی ریڈیائی داستان پیش کرنے کے لیے مذکورہ 'لاساکول ایوارڈ' کا مستحق قرار دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2016

عرشی کلیری

پیران کلیر شریف: اتراکھنڈ کی مشہور سرزمین کلیر شریف سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر مولانا رئیس احمد عرشی کلیری کو ان کی دینی و ادبی قومی و ملی خدمات کے اعتراف میں بزرگ شاعر پدم شری بیکل اتساہی کے ہاتھوں ایوارڈ سے

نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ منگلور میں منعقد آل انڈیا مشاعرہ کے موقع پر معروف ادبی و سماجی تنظیم 'قومی ایکتا کمیٹی اتراکھنڈ' کی جانب سے پیش کیا گیا۔ عرشی کلیری نثر اور نظم دونوں میں اپنی منفرد شناخت رکھنے والے شاعر ہیں، خصوصاً نعت ومنقبت میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کے مضامین و اشعار ملک کے مؤقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کئی مذہبی و ادبی تنظیموں کے ذمہ دار و رکن اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ قومی ایکتا کمیٹی اتراکھنڈ کے جنرل سکریٹری جناب افضل منگلوری نے کہا کہ عرشی کلیری کو اس ایوارڈ کے لیے اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ ان کی دینی و ادبی سماجی اور قومی خدمات ارباب علم و ادب کے لیے مثالی ہیں انھوں نے بہت کم وقت میں قابل رشک ترقی کر کے اپنے آپ کو اس ایوارڈ کا اہل بنایا ہے۔

پریس ریلیز: آفتاب اظہر کلیر شریف، 12 نومبر 2016

اجرا

جدید شاعری کی مستحکم آواز شہریار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریٹو بلاک کے کانفرنس ہال میں وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین

شاہ نے مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم سماجی کارکن اور ہفت روزہ قیادت کے مدیر ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) کی کتاب 'جدید شاعری کی مستحکم آواز: شہریار' کی رسم اجرا انجام دی۔ اس کتاب میں شاہد صدیقی نے نہ صرف یہ کہ شہریار کی نظموں اور غزلیات کا جائزہ لیا ہے بلکہ انھوں نے عالمی شہرت یافتہ شاعر شہریار کی مفصل سوانح حیات بھی پیش کی ہے۔ رسم اجرا کی اس تقریب میں شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر سید محمد ہاشم، ممتاز کہانی کار پروفیسر طارق چھتاری، اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 نومبر 2016

منزل

مراد آباد: کیف میموریل سوسائٹی رجسٹرڈ مرادآباد کے زیر اہتمام مرادآباد کی معروف و ممتاز شاعرہ ڈاکٹر مینا نقوی کے آٹھویں مجموعہ کلام منزل کی رسم اجرا زیر صدارت مہیش ور تیواری لیش بھارتی ایوارڈ یافتہ معروف نوگیت کار عمل میں آئی۔ گرگم ہال مرادآباد میں ضلع مجسٹریٹ زوہیر بن صغیر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر ایس ٹی حسن مہمان خصوصی کے حیثیت سے شریک ہوئیں۔ مہمان ذی وقار ڈائریکٹر آکاش وانی رامپور ثروت عثمانی و مہمان اعزازی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ علینا عترت نے شرکت کی۔ اس موقعے پر نظامت کے فرائض سید محمد ہاشم رکن اردو اکادمی اترپردیش نے انجام دیے۔ اپنے اپنے مقالات ڈاکٹر شیخ نگینوی، انور عالم لطیفی، ڈاکٹر زیبا ناز نے پڑھے۔ کنوینر انور کیفی صدر کیف میموریل سوسائٹی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 نومبر 2016

سلطان جمہوریہ

بنگلور: حکومت کرناٹک کے محکمہ کنڑا و ثقافت کے زیر اہتمام تحریک آزادی کے اولین مجاہد ٹیپو سلطان شہید کے یوم پیدائش پر منعقدہ 'ٹیپو جینتی' تقریب میں وزیر اعلیٰ شری سدارامیا نے کہا کہ ملک کی پہلی جنگ آزادی 1857 نہیں بلکہ اینگلو میسور جنگیں ہیں جو انگریزوں کے ٹیپو سلطان اور ان کے والد نواب حیدر نے لڑی تھیں۔ مشہور کالم نگار، شاعر و نقاد جناب شمیم طارق کی لکھی 'سلطان جمہور ٹیپو سلطان' اور گریش کارناڈ کے انگریزی ڈرامے کا اردو ترجمہ 'ٹیپو کے خواب' جو کرناٹک اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اجر وزیر اعلیٰ شری سدارامیا کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ٹیپو سیکولر مذہبی رواداری اور ریاست کے معاشی و سماجی ترقی کے پاسدار تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 نومبر 2016

ادب سلسلہ

پٹنہ: جب مسلمانان ہند سیاسی، معاشی، تعلیمی زبوں حالی سے دوچار تھے، تاریکی و گمرہی اور جہالت کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا تو ایسے وقت میں سرسید نے انھیں مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی بحران سے باہر نکالنے میں پیش قدمی کی۔ ان خیالات کا اظہار سکریٹری بہار اردو اکادمی مشتاق احمد نوری نے سہ ماہی سلسلہ کے اجرا کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ سرسید نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کر کے ملک کے مسلمانوں کے اندر تعلیمی صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر سماجی، سیاسی اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے اور بروئے عمل لانے کا رجحان بھی پیدا کیا۔ خیال رہے کہ بہار اردو اکادمی میں سہ ماہی 'ادب سلسلہ' دہلی کے مدیر محمد سلیم (علیگ) اور دہلی سے نکلنے والے 'صدائے انصاری' کے مدیر انصاری اطہر حسین تشریف لائے اور مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے ہاتھوں 'ادب سلسلہ' کی خصوصی اشاعت 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار اور مسلمان' کا اجرا ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ 'ادب سلسلہ' نے بہت کم وقت میں اپنی ایک پہچان بنالی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 نومبر 2016

کتاب 'ڈاٹ کام'

ناگپور: کمپیوٹر کی دنیا میں ہو رہی تہلکہ خیز ترقیوں اور تبدیلیوں کو ہر زبان میں سرعت کے ساتھ منتقل کیا جا رہا ہے۔ مگر شومئی قسمت، اردو میں اس موضوع پر کوئی ڈھنگ

کی کتاب نہیں ملتی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ریحان کوثر کی اردو زبان میں شائع کردہ کتاب 'ڈاٹ کام' بہت حد تک اس کا ازالہ کرتی ہے۔' ان الفاظ میں صدر جلسہ ایس کیو زماں (سابق ایم ایل سی) نے ریحان کوثر کی ہمت افزائی کی۔ الفاظ ہیلپ کیشن ناگپور کے زیر اہتمام منعقدہ اجرا کے پروگرام میں ریاض احمد امروہی (مدیر مدھیہ بھارت ٹائمز کامٹی) نے کتاب 'ڈاٹ کام' کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اظہر ابرار، پروفیسر اسرار احمد نے اپنے مقالات سے ریحان کوثر کی تصنیف کے مختلف

پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ تقریب میں ڈاکٹر مدحت الاختر، وکیل نجیب، ڈاکٹر رفیق، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، ڈاکٹر نسیم اختر، سید مقصود، نقی جعفری بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 30 نومبر 2016

ریت پر ٹھہری زندگی اور المیزان

مونگیر: مونگیر کی مشہور و معروف انجمن 'اردو فورم' کا جشن سالانہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہ فیصل کیمپس کے وسیع و عریض میدان میں انجام پذیر ہوا۔ مجلس کا آغاز کرتے ہوئے 'اردو فورم' کے کنوینر ڈاکٹر سہیل نے 'اردو فورم' کی پچھلے 45 برسوں کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو فورم مونگیر جس کے بانی پروفیسر مہدی علی تھے جنھوں نے اردو فورم کو اپنے خون جگر سے سینچ کر اس مقام تک پہنچایا۔ بعد ازاں اردو فورم کے معزز رکن پرویز اقبال نے ایک نظم 'بنام اردو فورم' پیش کی۔ ابتدائی پروگرام کے بعد دو کتابوں کی رسم اجرا انجام پائی جس میں احمد عرفان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ 'ریت پر ٹھہری زندگی' اور پروفیسر ظفر حبیب کی تبصروں پر مشتمل کتاب 'المیزان' شامل تھی۔ رسم اجرا میں پروفیسر حسین الحق، پروفیسر ظفر حبیب، ڈاکٹر سہیل، کشن کانجی، پروفیسر شبیر حسن، شاہ محمد صدیقی، طارق متین وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 نومبر 2016

'راجستھان کے چند مشاہیر ادب سے تحریری گفتگو' 'غالب اور راجستھان'

جے پور: راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی جے پور کی جانب سے 6 نومبر 2016 کو بروز اتوار ایک ادبی پروگرام منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر و ادیب جناب نذیر فتح پوری صاحب کی کتاب 'راجستھان کے چند مشاہیر ادب سے تحریری گفتگو' اور 'غالب اور راجستھان' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب راجستھان کی پانچ بڑی ادبی شخصیات کے قلمی انٹرویو پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب کو راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی جے پور کے صدر شاہد احمد جمالی نے مرتب کیا ہے۔ اس موضوع پر ہندوستان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اس ادبی پروگرام میں مشہور شاعر شبیر فراز، ڈی ڈی اردو کے ایگزیکیوٹیو پروگرامر شکیل الرحمٰن صاحب کے علاوہ معروف شاعر عبدالرحیم اختر، آصف علی آصف، شمس الضحیٰ حاکم، مرزا حبیب بیگ پارس اور راجستھان یونیورسٹی کے کئی اسکالرس موجود تھے۔ اس موقعے پر جناب نذیر فتح پوری صاحب کو رضی الدین رضا ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

پریس ریلیز: شکیل الرحمٰن (سکریٹری) راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی، جے پور، راجستھان، 8 نومبر 2016

بادۂ مغرب

اعظم گڑھ: شبلی اکیڈمی دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ایک تقریب میں 'بادۂ مغرب' مرتب اشفاق احمد عمر، فردوسیہ خاتون کا اجرا، ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ 'بادۂ مغرب' شبنم گورکھپوری کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس میں انھوں نے کیٹس، شیلی، کولرج اور دیگر مغربی شعرا کے مشہور انگریزی کلام کو منظوم ترجمے کے قالب

میں ڈھالا ہے۔ اشفاق احمد عمر کا آبائی وطن گورکھپور ہے۔ ساتھ ہی فردوسیہ خاتون صاحبہ شبنم گورکھپوری کی بیٹی ہیں یہ اس کتاب میں مرتب کی حیثیت سے شامل ہیں۔ پروفیسر ظلی نے کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ دور حاضر میں اس نوعیت کے کام عموماً کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے کا کام کیا بلکہ اپنے شہر کو نمایاں کرنے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ کتاب کو دیکھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کے لیے ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔ اس تقریب میں اردو زبان و ادب کے مشہور و معروف محقق و ناقد پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر سراج اجملی، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: اشفاق حق، اعظم گڑھ 21 نومبر 2016

'بادل چھاؤں' اور 'نشاط قلم'

متوناتھ بھنجن: شہر ہنروراں مئوناتھ بھنجن میں ادبی مجلسوں کو آراستہ کرنے کے کئی طریقے، ادب دوستوں نے اپنا رکھے ہیں، انھیں میں سے ایک طریقہ کتاب کے اجرا کا بھی ہے۔ ہر سال ادب دوستوں کو کتابوں کے اجرا

کی تقاریب میں شریک ہونے کا موقع ملتا ہے۔ 6 نومبر کی شام ایسی ہی ایک تقریب کا اہتمام کتابوں کے اجرا کے عنوان سے اسکال پبلک اسکول مئو میں اردو پڑھاؤ تحریک نے کیا، جسے نام تو کتابوں کے اجرا کا دیا گیا لیکن جیسے جیسے پروگرام اختتام کی طرف بڑھتا گیا اس پر سیمینار کا رنگ چڑھتا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر منور انجم، ڈاکٹر ثوبان سعید، پروفیسر مسعود عالم فلاحی، مظفر اللہ خاں اور ڈاکٹر غیاث الدین نے اظہار خیال کیا۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد اردو پڑھاؤ تحریک کے کنوینر عزیز گرہست نے مہمانوں کے خیر مقدم کے ساتھ اردو کے فروغ کے سلسلے میں حاضرین کو متوجہ کیا۔ خیر مقدمی کلمات کے بعد ڈاکٹر شکیل احمد کی دو کتابوں 'نشاط قلم' اور 'بادل چھاؤں' نیز شبیر حکیم کی کتاب 'حیاکت کی حکایت' کے دوسرے ایڈیشن کا اجرا عمل میں آیا۔ انصار معروفی نے کتابوں پر اپنے منظوم تاثرات پیش کرکے شعرا کی نمائندگی کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' گورکھپور، 8 نومبر 2016

وفیات:

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق استاد پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کا مختصر علالت کے بعد 28 نومبر 2016 کا انتقال ہوگیا۔ اے ایم یو کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے پروفیسر صدیقی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ پروفیسر صدیقی کا شمار شعبۂ تاریخ کے ہر دل عزیز اور مایہ ناز اساتذہ میں ہوتا تھا اور وہ اساتذہ اور طلبا کے بیچ بہت مقبول تھے۔ پروفیسر صدیقی کو عہد وسطیٰ کی تاریخ پر عبور حاصل تھا۔ پروفیسر صدیقی نے تقریباً 13 کتابیں لکھی ہیں جن میں شیر شاہ سوری، اسلام اینڈ مسلم ان ساؤتھ ایشیا: ہسٹوریکل پرسپیکٹو، اتھارٹی اینڈ کنگ شپس انڈر دی سلطان آف ڈیلہی اور دہلی سلطنت وغیرہ خصوصی طور پر شامل ہیں۔ انھوں نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے لیے بھی اپنا تعاون دیا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی 29 نومبر 2016

رؤف رضا

نئی دھلی: دہلی کے معروف شاعر رؤف رضا اچانک دل کا دورہ پڑنے سے 2 دسمبر 2016 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ رؤف رضا اردو شاعری کے ایک روشن ستارہ تھے۔ وہ جدید لب و لہجے میں سہل ممتنع کا بہترین شعر کہتے تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'دھنکیں میری' تقریباً دس

سال قبل منظر عام پر آ کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور چار لڑکیاں و پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں ہیں۔ بعد نماز عصر داعی والی مسجد ترا ہا بہرام خاں میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور بعد نماز مغرب انھیں دہلی گیٹ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ تدفین میں سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ جن اہم شعرا و ادبا نے شرکت کی ان میں وقار مانوی، فاروق ارگلی، شمس رمزی، فرحت احساس، نعمان شوق، سلیم صدیقی، امیر امروہوی، شکیل جمالی، معین شاداب، اقبال اشہر، وارث وارثی، منیر ہمدم، تسلیم دانش، استاذ اقبال خاں، فرید قریشی، احمد علوی، اقبال فردوسی، جاوید مشیری، عادل رشید، نصیر جھنجھانوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 دسمبر 2016

بیکل اُتساہی

بلرام پور: بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر اور حسان الہند کے نام سے مشہور شہنشاہ گیت بیکل اتساہی کا 3 دسمبر 2016 کو علی الصباح دہلی کے رام منوہر لوہیا میں انتقال ہو گیا۔ اتوار کو ہزاروں سوگواروں نے ان کی رہائش گاہ سول لائن میں ان کو سپرد خاک کیا۔ ان کی عمر تقریباً 92 برس تھی گذشتہ دنوں برین ہیمرج ہونے کے بعد انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ دوران علاج موت کا پروانہ آ گیا۔ بیکل اتساہی کے انتقال کی خبر سے اردو دنیا بالخصوص بلرام پور اور نواحی اضلاع میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ بیکل اتساہی کا اصل نام محمد شفیع خاں لودی تھا اور تخلص بیکل تھا، جبکہ آنجہانی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے عہد جوانی میں ان کی غزل سن کر انھیں اتساہی کہا تھا جس کے بعد سے وہ اتساہی ہو گئے اور دیوئی کے ایک نعتیہ مشاعرے میں محمد شفیع لودی نعت پیش کر رہے تھے تو ایک صوفی بزرگ کے منھ سے برجستہ نکلا کہ کیا بیکل ہے۔ اس طرح وہ محمد شفیع لودی سے بیکل اور جواہر لعل نہرو کے لقب اتساہی ملا کر بیکل اتساہی ہو گئے اور اسی نام سے انھیں شہرت حاصل ہو گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 دسمبر 2016

خراج عقیدت

بہادر شاہ ظفر

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے 154 ویں یوم وفات کے موقع پر ایک اہم تقریب منعقد کی گئی جس میں 1857 اور 1947 کے سورماؤں کے اخلاف اور ملک و ملت کے رہنماؤں نے شرکت کی۔ مقررین نے اپنی تقریروں میں بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی 1857 کی جنگ کو پہلا ہندوستان گیر جہاد آزادی قرار دیا اور اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کو خصوصی خراج عقیدت پیش کیا، اس موقعے پر مقررین نے ملکۂ اودھ حضرت محل، سلطان ٹیپو شہید، سراج الدولہ، جھانسی کی رانی، بابو کنور سنگھ مہاراجہ بختاور سنگھ اور سعادت علی خاں وغیرہ کی قیادت میں لڑی گئی جنگوں کے شہیدوں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ مقررین نے زور دیا کہ یہ جنگیں مکمل قومی اتحاد کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور ان کا آخری نتیجہ 1947 میں ہندوستانیوں کی مکمل فتح کی شکل میں برآمد ہوا۔ تقریب کا اہتمام بہادر شاہ ظفر کے خلف رشید نواب شاہ محمد شعیب خاں نے درسگاہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے پلیٹ فارم سے کیا۔ پہلی نشست کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں تاریخ کے پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کی۔ دوسری نشست ریبا تمت ورما کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں مقررین نے ایشیا کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ دوسری نشست کی صدارت ریبا تمت ورما نے کی۔ تقریب کے دوران شمیم متھرائی کے مجموعۂ کلام 'چہرہ چہرہ' اور بہادر شاہ ظفر اور بیگم زینت محل کی حیات و کارناموں اور تصویروں پر ایک کتاب اور نعیم شیروانی کی کتاب گنگا جل (ہندی) کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر طیب انصاری، سکندر چنگیزی، ڈاکٹر اوم کار حل، پروفیسر ظہیر حسن متھرا، مولانا جاوید قاسمی، ڈاکٹر شرافت صدیقی وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 دسمبر 2016

جگجیت سنگھ

میرٹھ: اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ اور شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے مشترکہ اہتمام میں آنجہانی معروف غزل سنگر جگجیت سنگھ کی یاد میں یہاں یونیورسٹی کے نیتاجی سبھاش چندر بوس آڈیٹوریم میں پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ فنکار کے بطور حیدر آباد سے آئے مشہور غزل سنگر پوروا گرو نے جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزلوں کو اپنی خوب صورت آواز میں پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے دور حاضر کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر نواز دیوبندی کی غزلوں کو بھی اپنی آواز دی۔ ان سبھی غزلوں کو نجم الدین جاوید، حیدر آبادی کے ذریعے کمپوز کیا گیا تھا۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے شمع جلا کر کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر بی چندر کلا (ضلع مجسٹریٹ، میرٹھ) نے شرکت کی جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر معراج الدین احمد (سابق آبپاشی وزیر) شریک ہوئے۔ سبھی مہمانان کا پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ بعد میں پوروا گرو نے غزل پیش کی۔ پروگرام کے کنوینر اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ پروگرام کا مقصد گنگا جمنی تہذیب کو بڑھاوا دینا اور عظیم غزل سنگر آنجہانی جگجیت سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے کیونکہ اردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ پروگرام کے آخر میں فن کاروں اور مہمانوں کو ٹرافی پیش کی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر بنوک، پروفیسر پی کے مشرا، پروفیسر اتوبر سنگھ، ڈاکٹر ارشد اقبال، ایڈوکیٹ سرتاج احمد، بھارت بھوشن شرما، انجینئر وکاس تیاگی کے علاوہ طلبا و طالبات اور کثیر تعداد میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 نومبر 2016

اصغر گونڈوی

نئی دھلی: تغزل میں تصوف کو سمو کر اپنا ایک منفرد رنگ پیدا کرنے والے اردو کے معروف شاعر اصغر گونڈوی کا آج ہی کے دن نومبر 1936 میں انتقال ہو گیا تھا۔ رحلت کے وقت ان کی عمر صرف 52 برس تھی لیکن اس قلیل مدت میں بھی انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی پہچان عطا کی جس کی وجہ سے وہ اردو کی رہتی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ اصغر گونڈوی کا اصل نام سید اصغر حسین تھا۔ وہ یکم مارچ 1884 کو پیدا ہوئے۔ آبائی وطن گورکھپور تھا تاہم گونڈہ میں مستقل قیام کے باعث گونڈوی کہلانے لگے۔ جدید اردو غزل کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اصغر گونڈوی کے کلام کے دو مجموعے 'نشاط روح' اور 'سرود زندگی' شائع ہو چکے ہیں۔ ہر چند کہ اصغر کو لمبی زندگی نہیں مل سکی لیکن انھوں نے زندگی کے ہر پل میں جینے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے عہد نے انھیں کتنی شدت سے محسوس کیا اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ان کی شاعری پسند تھی اور وہ ان کے کلام کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر اردو شاعری کو ایک اکائی فرض کیا جائے تو آدھی شاعری صرف اصغر گونڈوی کی ہے۔ اصغر گونڈوی نہایت نفاست پسند، خلیق اور وسیع المشرب شخص تھے۔ اصغر کا کلام کم لیکن بہتر انتخاب ہے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ 30 نومبر 1936 میں اردو دنیا کو داغ مفارقت دے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 دسمبر 2016

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)

مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخاب سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

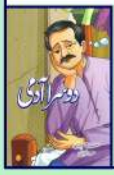

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

زمین

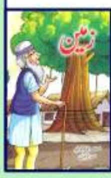

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

اذان

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

انصاف

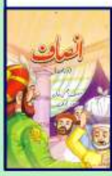

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

ایک دکھ بھری کہانی

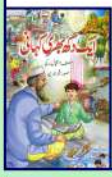

مصنف: اقبال برکی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

پیڑ پیڑ میرا دانہ دے!

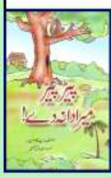

مصنف: سید غلام حیدر
مصور: ایف آئی فیضی
صفحات: 12، قیمت: 20 روپے

کتاب میلہ اور دوسری نظمیں

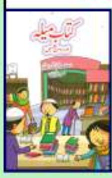

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 12، قیمت: 20 روپے

دانیال، دادا اور جائسی

مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجر الدین
صفحات: 12، قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2017, Vol.19, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/12/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردوزبان میں علم وآگہی کامعتبرادبی جریدہ

قومی اردوکونسل کی منفرد پیشکش

اردوزبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پرفکرانگیز اور تلاش وجستجوکوصحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہرتین ماہ بعد منظرِعام پرآنے والانہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خودبھی پڑھیں اور دوسروں کوبھی پڑھنے کامشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردوکونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پربھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آرکے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025